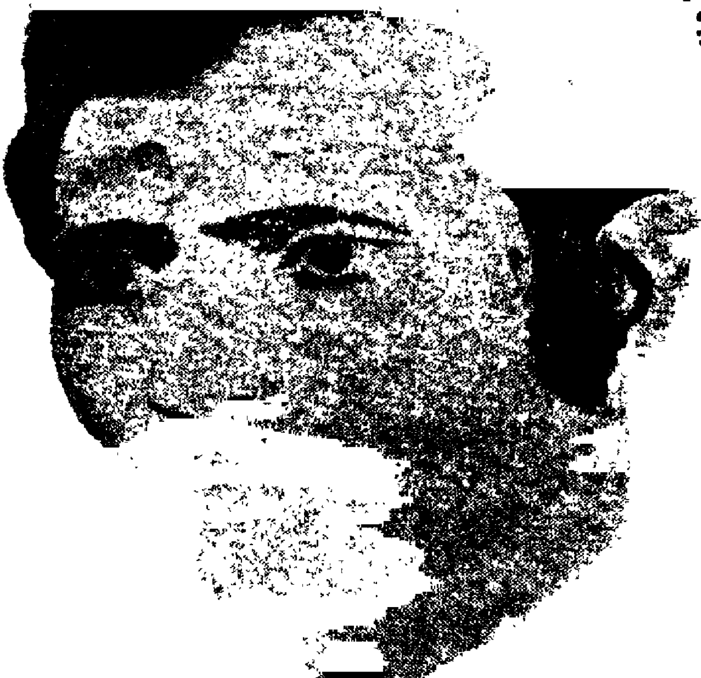

الفاظ





دوماہی

الفاظ

علی گڑھ

جلد ۱۲ | جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۸ء | شمارہ ۱، ۲

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی   رام لعل

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

زرِ سالانہ ---- ۱۶ روپے

قیمت فی شمارہ --- ۳ روپے

پرنٹر پبلشر ---- اسدیار خاں

مطبوعہ --- جواہر آفسیٹ پریس جامع مسجد دہلی

کتابت --- سلطانہ ریاض

مقامِ اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر : رشید امجد

پتہ دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فون نمبر ۲۷۶۸

آئینہ

گوشۂ رشید امجد

★

اداریہ

الفاظ کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے بغیر کسی معذرت اور بلا کسی قول و قرار کے۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہے اور نہ پا رکاب میں۔ تو انسان ایسا وعدہ کرے ہی کیوں جس کا ایفا اس کے اختیار میں نہ ہو۔

الفاظ کا پچھلا شمارہ "نارنگ نمبر" تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کی کتنی پذیرائی ہوئی اس کا اندازہ چند خطوط کے ان اقتباسات سے ہوگا جو آخر میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اکثر خطوط میں اس شمارے کو سراہنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بے قاعدگی اور تاخیر کا گلہ بھی تھا۔ یہ تمام خطوط ان صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے، الفاظ کی قسمت جن کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اب جو بھی ان کا فیصلہ ہو۔

اس بار گوشۂ رشید امجد پیش کیا جا رہا ہے جو دو مضامین اور ایک افسانے پر مشتمل ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ مختصر گوشہ اتنے بڑے فن کار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ آپ کو یقیناً تشنگی کا احساس ہوگا۔ ان پر کئی اچھے مضامین موصول ہوئے ہیں جو انشاء اللہ آئندہ اشاعتوں میں جگہ پاتے رہیں گے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ اطمینان بھی ہے کہ جناب مہدی جعفر اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے رشید امجد کی شخصیت اور فن پر بہت غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ یقین ہے ان اہلِ قلم کا تعاون ہمیں آیندہ بھی حاصل رہے گا اور ان کی تحریروں سے الفاظ کے وقار میں اضافہ ہوگا۔

مدیر

"الفاظ" کی قیمت میں اضافہ

نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ کاغذ، کتابت و طباعت کے خرچ میں اضافے کے سبب "الفاظ" کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ آئندہ شمارے سے "الفاظ" کی سالانہ قیمت بیس روپے اور ایک شمارے کی قیمت چار روپے ہوگی۔

منیجر

فارم نمبر ۴ رول نمبر ۸

۱۔ نام "الفاظ"
۲۔ وقفہ دوماہی
۳۔ مقام اشاعت، ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ
۴۔ پرنٹر پبلشر: اسدیار خاں
قومیت : ہندوستانی
پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

۵۔ ایڈیٹر: ڈاکٹر نورالحسن نقوی
قومیت : ہندوستانی
پتہ : شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۶۔ مالک : اسدیار خاں
قومیت : ہندوستانی
پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

مندرجہ بالا میرے علم ویقین کی حد تک بالکل صحیح ہیں
دستخط اسدیار خاں

مھدی جعفر

بی - ۱۳۵ شاستری نگر
بھوپال ۴۶۲۰۱۷

رشید امجد کی کائنات

حالیہ افسانے کے استحکام میں رشید امجد نے جو حصہ لیا ہے اس کی اہمیت سے انکار
ں کیا جاسکتا۔ ان کی مساعی نے افسانوی فن کو جلا بخشی ہے۔ رشید امجد کا افسانوی میدان
ہری، واردات عصری، محسوسات زخمی، سوچ تفکیری، لہجہ شعری اور اظہار علامتی ہے۔
ن کی توجہ عصری افسانوی ساخت پر مرکوز ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ معنوی حیثیت
ے وہ عناصر جہت پا جائیں جو موجود تو ہوں مگر گرفت میں نہ آسکے ہوں، جو محسوس تو
ے جاتے ہوں مگر جن کا نقش نہ بنایا جاتا ہو، جنھیں لکھا تو جاتا ہو مگر ابھارا نہ گیا ہو، جنھیں
میٹ کر لفظ تو دیا جاتا ہو مگر گھیر کر شکل نہ دی جاتی ہو، جن کی کہانی تو کہی گئی ہو، علامتی
درت گری نہ کی گئی ہو۔

معنوی بصارت سے کائناتی بصیرت کے جنم لینے کا منظر رشید امجد کی افسانوی
بان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی پہچان وہ کاوش ہے جو بنے بنائے اور فرسودہ لسانی
عانچوں کو ایک ارفع جمالیاتی سطح پر لے جاکر بدل ڈالنا چاہتی ہے اور تازہ اور توانا اسلوب
، تخلیق و تہذیب کرتی ہے۔

موت کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں تو تمھارے اندر ہی ہوں"۔

"تو پھر یہ باہر سے کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے"۔

"تم خود"۔

"میں۔" اس نے بوکھلا کر اپنے سارے وجود کو ٹٹولا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"تو میں اپنے جسم سے باہر ہوں اور موت اندر ہے"۔

(بے راستوں کا ذائقہ)

رشید امجد ماحول، موقع یا صورت حال کو علامت بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار اہم ہیں مگر اس قدر نہیں کہ اظہار کا سارا زور انھیں پر پڑے۔ کردار یا تو عصری پہچان واضح کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بے شناختی کے نشان۔ 'طلسم بے در' کا کردار انسانی صفات کو مشینی صفات سے ممیز کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ کردار ایک پورے دور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی سمبالک سچویشن کی شناخت ابھارتا ہے۔

شہری ماحول کے علامتی بیانیہ کے طور پر رشید امجد 'شناسائی دیوار اور تابوت' میں لفظوں کو اشیار اور گیند کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جمنہ ٹوٹ کر فرش پر گرجاتا ہے تو اسے اٹھاکر ڈاکٹر کی جیب میں ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ اشیار میں حساسیت بھر دیتے ہیں اور ان میں زندگی اور تحرک جگا دیتے ہیں۔ ماحول میں موجود ارد گرد کی بے جان چیزیں بھی افراد کی طرح عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، جس سے افسانوی بیان میں طلسماتی جان پڑ جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں علامت کو ابھارنے سے پہلے بیانیہ کو لفظیاتی زیرو اور ساختیاتی جست و خیز کے ذریعہ طلسمی کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ شاید یہ اس ہوا کہ مایوسی اور زخم خوردگی کا مجرد احساس سادے بیانیہ میں قاری کو غیر دلچسپ ا بے کیف کر دیتا۔ اسے موثر دینا ہے تو اس کی قلب ماہیت کرنی ہوگی۔

شناسائی دیوار اور تابوت، کی موضوعی حیثیت بنیادی طور پر عوض سعید کے یہاں 'رات والا اجنبی' کے مماثل ہے البتہ عوض سعید کے افسانے میں تجسیمی یا نام عمل مفقود ہے، جو علامتی تشکیل کا باعث ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ افسانہ اپنی تجریدی جہت کی بھرپور شناخت مرتسم کرتا ہے۔ حالانکہ رشید امجد نے افسانے کی طرح ا میں بھی ازدواجی زندگی کی مایوسی اور نفسیاتی خلیج ظاہر ہوئی ہے مگر 'رات والا اجنبی' کا استعارہ مافوق الفطرت نہیں ہے۔ دوسری طرف رشید امجد کے یہاں اچانک زن و شو کی خلیج سے ایک مافوق البشر ہیولے کی تجسیم افسانے کو علامتی جہت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ یعنی گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ عہد حاضر کی سچویشن اس طرح مدغم ہوتی ہے عورت کی مرد سے بے اعتنائی اپنا داخلی آہنگ الگ بناتی ہے۔ چنانچہ عجیب الخلقت ہیولے کی تجسیم دراصل زن و شو کی علیحدگی کی تجسیم ہے۔ یہ ہیولا ایک ساز بجاتا ہے

ں کی آواز پر عورت اس وقت رقص کرتی ہے جب مرد موجود نہیں ہوتا۔ اس صورت ال کی PLURALITY کو اجتماعی طور پر بھی پہچانا گیا ہے۔ یہ انفرادیت یا فردیت کے اعتبار ے سماج کا حصہ ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں بھی یہ ہیولا دیوار پر بیٹھا ہے اور اس کے ساز پر ہر ڑوسی کی عورت رقص کرتی ہے۔ اگرچہ کہ رشید امجد کی یہ علامت، تجریدی حیثیت کی قلب ماہیت سے تشکیل ہوئی ہے مگر یہ ہیولا سریندر پرکاش کے افسانوی کردار 'بجوکا' کے برخلاف کسی خارجی سے (شئے کی آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم نہ ہو کر، داخلی صورت حال (صورت حال کی داخلی مگر آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم ہے، جسے خارج پر منعکس کیا گیا ہے۔ شہری ماحول کے واسطے سے رشید امجد کی تشکیل کردہ امیج میں اسطوری کردار کم ہے فینٹسی زیادہ۔ آرکی ٹائپ کے لحاظ سے یہ عورت کا ANIMUS ہے جو پہلے پہل داتمی ہوتا ہے مگر عمر بیتنے کے ساتھ اس کی اصلی صورت عورت کی طرف سے ایک مخصوص طرح کا ردعمل بن کر سامنے آتی ہے اور جس کا خمیازہ مرد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہیولے میں تاریخیت نہیں بلکہ ازلی کیفیت ہے۔ چونکہ افسانوی سچویشن شہری ہے۔ اس لئے مکانی طور پر یہ شہر کا سمبل ہے۔

یوں تو رشید امجد علامتی افسانہ نگار ہیں کہ ان کے یہاں کئی نہتوں کے نشیب و فراز سے گذرنے کا عمل ملتا ہے اور تخلیقی شدت ان کے اسلوب اور ہیئت کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ ایک شعری تاثیر بدرجۂ اتم پیدا ہو جاتی ہے مگر تمام افسانوں کی بنیادی تخلیقی رو کے طور پر وہ جینے کی زبردست خواہش کے افسانہ نگار ہیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"

(سہ پہر کی خزاں)

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میری بیٹی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند لئے بازو پھیلائے مجھے بلا رہی ہے۔ میں دھم سے بستر پر گر پڑتا ہوں۔ میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

(میلا جو تالاب میں ڈوب گیا)

میں اسی تڑختے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سوکھی چھاتیوں سے لپٹ کر۔ اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے بند چشمے اس پر کھول دے۔

(ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک مکالمہ)

رشید امجد ماحول، موقع یا صورت حال کو علامت بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار اہم ہیں مگر اس قدر نہیں کہ اظہار کا سارا زور ان کی شخصیتوں پر پڑے۔ کردار یا تو عصری پہچان واضح کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بے شناختی کے نشان۔ 'طلسم بے در' کا کردار انسانی صفات کو مشینی صفات سے ممیز کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ کردار ایک پورے دور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی سمبالک سچویشن کی شناخت ابھارتا ہے۔

شہری ماحول کے علامتی بیانیہ کے طور پر رشید امجد 'شناسائی دیوار اور تابوت' میں لفظوں کو اشیاء اور گیند کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جمنہ ٹوٹ کر فرش پر گر جاتا ہے تو اسے اٹھا کر ڈاکٹر کی جیب میں ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ اشیاء میں حساسیت بھر دیتے ہیں اور ان میں زندگی اور تحرک جگا دیتے ہیں۔ ماحول میں موجود اردگرد کی بے جان چیزیں بھی افراد کی طرح عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، جس سے افسانوی بیان میں طلسماتی جان پڑ جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں علامت کو ابھارنے سے پہلے بیانیہ کو لفظیاتی زیروبم اور ساختیاتی جست و خیز کے ذریعہ طلسمی کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ شاید یہ اس لئے ہو کہ مایوسی اور زخم خوردگی کا مجرد احساس سادے بیانیہ میں قاری کو غیر دلچسپ اور بے کیف کر دیتا۔ اسے موثر دینا ہے تو اس کی قلب ماہیت کرنی ہوگی۔

شناسائی دیوار اور تابوت، کی موضوعی حیثیت بنیادی طور پر عوض سعید کے کے یہاں 'رات والا اجنبی' کے مماثل ہے البتہ عوض سعید کے افسانے میں تجسیمی یا نامیاتی عمل مفقود ہے، جو علامتی تشکیل کا باعث ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ افسانہ اپنی تجریدی جہت کی بھرپور شناخت مرتسم کرتا ہے۔ حالانکہ رشید امجد نے افسانے کی طرح اس میں بھی ازدواجی زندگی کی مایوسی اور نفسیاتی خلیج ظاہر ہوئی ہے مگر 'رات والا اجنبی' کا استعارہ مافوق الفطرت نہیں ہے۔ دوسری طرف رشید امجد کے یہاں اچانک زن و شو کی خلیج سے ایک مافوق البشر ہیولے کی تجسیم افسانے کو علامتی جہت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ یعنی گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ عہد حاضر کی سچویشن اس طرح مدغم ہوتی ہے کہ عورت کی مرد سے بے اعتنائی اپنا داخلی آہنگ الگ بناتی ہے۔ چنانچہ عجیب الخلقت ہیولے کی تجسیم دراصل زن و شو کی علیحدگی کی تجسیم ہے۔ یہ ہیولا ایک ساز بجاتا ہے اور

اس کی آواز پر عورت اس وقت رقص کرتی ہے جب مرد موجود نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال کی PLURALITY کو اجتماعی طور پر بھی پہچانا گیا ہے۔ یہ انفرادیت یا فردیت کے اعتبار سے سماج کا حصہ ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں بھی یہ ہیولا دیوار پر بیٹھا ہے اور اس کے ساز پر ہر پڑوسی کی عورت رقص کرتی ہے۔ اگرچہ کہ رشید امجد کی یہ علامت، تجریدی تسییت کی قلب ماہیت سے تشکیل ہوئی ہے مگر یہ ہیولا سریندر پرکاش کے افسانوی کردار "بجوکا" کے برخلاف کسی خارجی سے (شے کی آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم نہ ہوکر، داخلی صورت حال (صورت حال کی داخلی مگر آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم ہے، جسے خارج پر منعکس کیا گیا ہے۔ شہری ماحول کے واسطے سے رشید امجد کی تشکیل کردہ امیج میں اسطوری کردار کم ہے فینٹسی زیادہ۔ آرکی ٹائپ کے لحاظ سے یہ عورت کا ANIMUS ہے جو پہلے پہل واقعی ہوتا ہے مگر عمر بیتنے کے ساتھ اس کی اصلی صورت عورت کی طرف سے ایک مخصوص طرح کا ردعمل بن کر سامنے آتی ہے اور جس کا خمیازہ مرد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہیولے میں تاریخیت نہیں بلکہ ازلی کیفیت ہے۔ چونکہ افسانوی سچویشن شہری ہے۔ اس لئے مکانی طور پر یہ شہر کا سمبل ہے۔

یوں تو رشید امجد علامتی افسانہ نگار ہیں کہ ان کے یہاں کئی نہتوں کے نشیب و فراز سے گذرنے کا عمل ملتا ہے اور تخلیقی شدت ان کے اسلوب اور ہیئت کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ ایک شعری تاثیر بدرجۂ اتم پیدا ہوجاتی ہے مگر تمام افسانوں کی بنیادی تخلیقی رو کے طور پر وہ جینے کی زبردست خواہش کے افسانہ نگار ہیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔

(سہ پہر کی خزاں)

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میری بیٹی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند لئے بازو پھیلائے مجھے بلا رہی ہے۔ میں دھم سے بستر پر گر پڑتا ہوں۔ میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

(میلا جو تالاب میں ڈوب گیا)

میں اسی تڑختے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سوکھی چھاتیوں سے لپٹ کر۔ اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے بند چشمے اس پر کھول دے۔

(ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک مکالمہ)

کوئی ہے۔ کوئی ہے، اس کی اپنی آواز چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے، وہ نڈھال ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے، بہت دیر تک اسی طرح کھڑا رہتا ہے، پھر اپنے آپ کو اکٹھا کر کے آگے بڑھتا ہے۔ کلاس روم میں ڈیسکوں پر بستے کھلے پڑے پڑے ہیں، کاپیاں کھلی ہیں، بلیک بورڈ پر سوال لکھا ہوا ہے، لیکن نہ پڑھانے والا موجود ہے نہ پڑھنے والے، ایک گہری چپ ہے۔

یا خدا یہ کیا جادو ہے۔ لوگ اس شہر سے کہاں گئے ہیں۔ ہلکی سی آہٹ ہوتی ہے۔

کون؟ اس کے اندر تجسس کی لو پھیلتی ہے۔

(قافلہ سے بچھڑا غم)

فرد اور فرد کی اکائی کے زاویے سے پورے سماج میں زندگی کی طمانیت اور تازگی دیکھنے کی شدید خواہش رشید امجد کو ہولناک صورت حال منعکس کرنے پر اکساتی ہے۔ وہ بڑھتی ہوئی بے چہرگی میں شناخت کی راہ تلاش کرتے ہیں اور منجمد اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈھتے ہیں مگر انھیں دھوپ میں سیاہ لکیر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

رشید امجد سمجھنے کی قوت پر خاص توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ عقلیت کو وہ اس انتہا پر دیکھتے ہیں جہاں پہنچ کر اسے ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جا بہ جا طنز (SATIRE) کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ مرد کی دلیل پسندی میں اس کی طاقت اور تازگی کو پہچانتے ہوئے اسے ایسے کنارے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں پر عقلیت کی ہوش مندی اپنی روح گنوا بیٹھتی ہے اور ایک اجاڑپن کا احساس جنم لیتا ہے۔

ب چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔' اس کے بعد ہم چپ چاپ اٹھے خاموشی سے باہر آئے اور کچھ کہے بغیر اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے!

ب اب بھی چپ رہا۔

"میں کیا کروں؟"

ب کے ہونٹ اس کے چہرے میں دفن ہو گئے۔

'میں کیا کروں ؟'
گہری الف خاموشی۔
اس نے ب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔
ب کچھ مٹی کے کھلونے کی طرح بھر کر زمین پر بکھر گیا۔
سنسان ویران سڑک پر دھند چپ چاپ قدم قدم چل رہی ہے۔
(سہ پہر کی خزاں)

ایک گہری چپ۔
صبح پہلے تیز گھنٹی۔ پھر کوئی کندھے سے ہلا کر مجھے جگاتا ہے۔
'آج دفتر نہیں جانا'
'آئیے آئیے مسٹر الف آپ کیسے ہیں ؟'
'مزاج بخیر۔ تشریف رکھئے نا'
'السلام علیکم۔ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے'
'آؤ بھائی آؤ نا'
'بیٹے کیسے ہو ؟'
'ابو میری کاپیاں'۔
'جان۔ آج تو بہت دیر لگا دی آپ نے'۔
مکالموں کا ایک لامتناہی جنگل، لفظ اگتے چلے جاتے ہیں، چہرے کبھی تو لفظ ہی ہیں۔
لفظ، لفظ، لفظ۔ بغیر ارادے کے منہ سے نکلتے چلے جاتے ہیں۔
(رات تماشا عکس)

دوسری طرف رشید امجد عورت کی ہوش مندی کی ایک الگ سطح کو پہچان لیتے ہیں، جو اپنے مختلف دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور جس میں اس کی کمزوری اور طاقت دونوں ضم ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں عورت کا اپنا تعقل مشکوک حیثیت رکھتا ہے، یا محض مرد کی عقلیت کی پرچھائیں اور استقرائی عمل (INDUCTION) سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ عورت کی ہوش مندی کا سرچشمہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے تعلق سے پھوٹتا ہے۔ اس لئے

اس کی مستقل کیفیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرد عورت کے آئینے میں تازگی سے مستفیض ہوتے ہوتے کبھی کبھی خشکی اور بے لطفی کا اسیر ہو جاتا ہے اور اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آج کی صورت حال اس عمل کو مہمیز کرتی ہے۔

" ایک گھنٹہ تین منٹ لیٹ۔"

اس نے بے پروائی سے شانے جھٹکے اور بولی۔ "شاپنگ کے لئے نکل گئی تھی۔"

اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

"میں۔"

" مجھے معلوم تھا تم انتظار کر رہے ہوگے"۔ وہ ہنسی۔

" تم اور کر ہی کیا سکتے ہو۔"

"تم میری توہین کر رہی ہو۔"

" میں تو صرف دیر سے آنے کی وجہ بتا رہی ہوں۔"

" وجہ ! خود کو محفوظ رکھنے کی ایک ڈھال ۔ ہونہہ۔"

(سہ پہر کی خزاں)

" میں مر گیا ہوں"۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا۔ بیوی کے مونہہ سے چیخ نکلی، لیکن اگلے ہی لمحہ غصہ کھٹ کھٹ کرتا اس کے منھ پر پھیل گیا۔ "شرم نہیں آتی ایسا مذاق کرتے ہوئے۔"

" یہ مذاق نہیں"۔ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

" میں سچ مچ مر گیا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے ؟" بیوی جھنجھلا گئی .....

چائے کا آرڈر لے کر بیرا گیا ہی تھا کہ منیجر ان کی میز پر آیا۔ "کون ہو تم ؟"

" میں ۔ میں ہوں۔"

" اور یہ عورت ؟"

" میری بیوی ہے۔"

" ثبوت ؟"
" بس یہ میری بیوی ہے۔"
" نکاح نامہ ہے تمھارے پاس ؟"
اس نے مڑکر بیوی کو دیکھا اور سوچا، اس عورت سے جو اس کے دو بچوں کی ماں ہے، اس کے تعلقات کیا ہیں، وہ اس کو مسلسل دیکھتا رہا۔
وہ بولی۔" کیا دیکھ رہے ہو ؟"
" کچھ نہیں"۔ وہ بولا۔" پھر کب ملوگی ؟"
" کیا ؟" وہ چیخ کر بولی۔" تم مجھے گرل فرینڈ سمجھ رہے ہو ؟"
(بے راستوں کا ذائقہ)

ظاہر ہے عورت کی سوچ سمجھ کا نظام مرد کے اسی طرح کے نظام سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ البتہ دونوں کا نقطۂ اتصال اور قایم مقامی مرد کی فعالیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور جیسے جیسے مرد بلند فکری پر فائز ہونے لگتا ہے یا اسے حالات کی چکی میں پسنا پڑتا ہے اس کے قدم زمین چھوڑنے لگتے ہیں۔ اور نقطۂ اتصال معدوم ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ بیوی کا ذکر جہاں جہاں آتا ہے اس کا خاص انداز ہے۔ رشید امجد عورت کی سمجھ اور مرد کی عقلیت میں دور تک تال میں دیکھنا چاہتے ہیں جو ایک دشوار امر ہے۔ وہ ازدواجی زندگی کے گٹھ جوڑ پر شاید اس لئے زور دیتے ہیں کہ زندگی کی راحت، جینے کی امنگ، اور باہم شناخت کا مسئلہ، بڑی حد تک اسی سے متعلق ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں فطری طور پر فرد کے لگاؤ کا عنصر بیوی سے زیادہ بچی میں ہے۔ بچی کی معصومیت کا نشان ہے۔ زندگی سے معصومیت کو شہر بدر کرکے جیا نہیں جا سکتا۔ یا برخلاف اس کے معصومیت کے سہارے زندگی گذارنا آسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگلا راستہ معصومیت کے موڑ سے ہی نکلے گا جو GENUINENESS اور خلوص کو ہموار کرے گا۔ مگر فرد زندگی کی چکی میں اتنا پھنسا ہے کہ وہ معصومیت سے مربوط ہونے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کا تناؤ اور دباؤ ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے فرد اس قدر الجھا ہوا ہے کہ گھر ہوتے ہوئے کبھی گھریلو پن نصیب ہونا ایک مسئلہ

بن چکا ہے۔

میں سوچتا ہوں، ہماری قبریں اتنی دور دور کیوں ہیں لیکن میری قبر تو میرے ساتھ ہے۔ میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہوں میری قبر نے مجھے چاروں طرف سے لپیٹا ہوا ہے۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے، ب اب قبر کے قریب ہوگا۔ لیکن قبر کیوں؟ وہ تو اس کا گھر ہے۔ ب گھر سے اتنا ناراض کیوں ہے؟ گھر اسے قبر کیوں نظر آتا ہے؟ میں ماں کے مرنے کی دعائیں کیوں مانگا کرتا ہوں؟" چیزیں الجھنے لگتی ہیں، گھر قبر کیوں بن گئے ہیں؟ ہوٹل گھر کیوں ہو گئے ہیں؟ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔

(بیزار آدم کے بیٹے)

عام طور پر رشید امجد کے افسانوں میں قبر کا وجود کم و بیش مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے موت اور قبر کی استعاراتی حیثیت بڑھ چڑھ کر قائم کی ہے۔ ہر افسانہ اس استعارے کی نئی شناخت لے کر سامنے آموجود ہوتا ہے۔ یہاں قبر کا استعارہ گھریلو پن کی عدم موجودگی کے خلا کو بھرتا ہے۔ مرکزی کردار سعی کرتا ہے کہ گھریلو پن کی جنت واپس آجائے، معصومیت پھر اس کی زندگی میں کھیلنے لگے، وہ معصومیت کی خواہش کو مطمئن کر سکے، مگر فی الحال ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔

وہ سر اٹھاتا ہے تو ناچتا شعلہ گزر چکا ہے۔
آسمان کے طشت کے کناروں سے چاند منہ نکال کر اسے آنکھ مارتا ہے۔
بیوی دروازہ کھولتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرتی۔
بیٹی کو گود میں اٹھاتا ہے تو ٹاٹا فیاں نہیں مانگتی۔
کھانے میں کچے گھی کی ہمک نہیں آتی۔
دیواروں سے سیلن کی بو بھی نہیں۔
صبح دفتر جاتے ہوئے مسکراہٹیں۔ ٹاٹا کی چہکار۔
دفتر میں میز پر کوئی PENDING فائل نہیں ہے۔

مسکراہٹیں ہی مسکراہیٹں۔
واپسی پر ٹی ہاؤس میں میز صاف ستھری، کوئی بکھرا ہوا لفظ نہیں۔
گھر آتے ہوئے جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچتا ہے تو دائیں بائیں پھر مڑ
کر دیکھتا ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے
بیوی مسکراہٹ کا چراغ جلائے دروازہ کھولتی ہے۔
بیٹی دوڑ کر ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے

(بانجھ ریت اور شام)

رشید امجد کی اہمیت اسی موڑ پر نظر آتی ہے جہاں وہ 'کیا ہے' اور 'کیا ہو رہا ہے' کی عکاسی کرتے کرتے یکایک 'کیا ہونا چاہئے' کی سمت میں جست لگاتے ہیں۔ انھیں 'ان حالات میں کیا ہو سکتا ہے' میں دلچسپی نہیں۔ وہ آج کی صورت حال کے بانجھ پن کے درمیان رہتے ہوئے 'زرخیزی میں جینے کی طلب کو جگہ جگہ VISUALISE کرتے ہیں۔ یہ ایک اہم موڑ ہے۔

رشید امجد اپنے افسانوں میں مذہبی تلمیحات کا استعمال دو سطحوں پر کرتے ہیں۔ ایک سطح قدیم اور اوریجنل ہوتی ہے، اور دوسری سطح عصری ہوتی ہے۔ تلمیح جب عصری سطح کی نباضی کرتی ہے تو اپنی شکل بدل دیتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنی قلب ماہیت کر لیتی ہے۔ رشید امجد جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تلمیح کے TRANSFORMATION کے واسطے سے کہہ جاتے ہیں۔ وہ عصر حاضر کی بگڑی ہوئی حالت کی عکاسی کرتے کرتے ایسی سطح کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں جہاں پر تازہ دم ہونے کی گنجائش ہو۔

"صبر کرو۔ صبر" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ "سارے
بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے اب یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے
بچوں کو یونہی نالیوں میں بہائیں گی۔"
"نالیوں میں کیوں؟" وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے۔
"دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں، اور شہر میں قتل طفلاں کی منادی
بھی ہو چکی ہے۔ مائیں بیچاری کیا کریں۔"

(سناٹا بولتا ہے)

یہاں تلمیح بیانیہ میں تحلیل ہو کر سامنے آئی ہے اور افسانے کی کلیت کا ایک جزو بن گئی ہے۔ تلمیح کا گھل جانے والا عمل اکثر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہاں جگانے والا آگیا ہے۔ وہ دیکھو۔
دیکھو لوگ اس کے انتظار میں بارش میں بھیگ رہے ہیں۔
ہاں ان کے دل سچ کے ساتھ ہیں۔ وہ اس کے منتظر ہیں۔ لیکن اسے یاد آیا، انھوں نے کہا تھا۔ ہمارے دل تمھارے ساتھ ہیں۔
لیکن تلواریں۔
افسوس ہم اپنی تلواریں بیچ چکے ہیں۔
اس نے گھبرا کر اپنی تلوار کو دیکھا۔
لیکن میرے پاس تو تلوار ہے ہی نہیں۔ میری تلوار تو وہ پہلے ہی چھین کر لے گئے ہیں۔

(بے چہرہ آدمی)

اب تم بتاؤ میں کیا کروں ؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی ہوئی ہیں، گھات لگائے بیٹھی ہیں، اور میں قطرہ قطرہ مر رہا ہوں،
میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا ہے، اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں ؟
. . . . تو پھر تم نے کیا سوچا ہے ؟
کیا اب بھی بیعت نہیں کروگے ؟

(لا = ؟)

اوپر کے اقتباسات میں روایات کی طرف براہ راست اشارہ نہیں ہے، اس لئے کہ تلمیح کے عمل اور ردعمل کو پیش کیا گیا ہے، مگر اکثر جگہوں پر باقاعدہ اور واضح طور پر تلمیح کی کرافٹنگ ملے گی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ دیوداسی نے ہاتھ باندھ کر ہواؤں میں کسی کو نمسکار کیا اور بولی۔ ہے بھگوان پورس اس دھرتی کا سپوت ہے،

تیرا بیٹا ہے، تیری دھرتی کا رکھ والا، اسے شکتی دیجیو۔ ہے بھگوان اسے شکتی دیجیو۔

ہم سب نے سر جھکائے اور اپنے اپنے راستوں پر چل نکلے۔

سکندر کہتے، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، میرا ہیرو پورس ہے۔

(سمندر قطرہ سمندر)

اس کی آنکھوں کی کربلا میں بھو کے پیاسے خیمے ابھر آئے، پیاسے خیموں سے گھوڑا باہر نکلا اور اپنے سوار کو لے کر خون خون میدان میں قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(ریزہ ریزہ شہادت)

افسانہ "ہابیل و قابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ" کی ساری بنت تلمیحاتی ہے۔

ظاہر ہے رشید امجد تلمیح کے ذریعہ "آج کی جو بے معنویت کی صورت حال ہے" کو "معنی کی جو صحیح صورت حال ہونی چاہئے" سے ٹکرا دیتے ہیں۔ وہ معنی کی نئی دنیا کو VISUALISE کرتے ہیں۔ اچھی زندگی کو فنی طور پر خلق کرنے کے لئے وہ قدیم سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ رشید امجد تلمیح کا استعمال علامتی سطح پر کرتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی اسطوری سطح نمایاں ہونے لگتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں بیانیہ کا الگ نشیب و فراز ہے۔ ان کے اسلوب میں ٹھوس ہیئت نظر نہیں آتی۔ مثلاً جیسی کہ انور سجاد کے یہاں ٹھوس کرافٹنگ ہے۔ وہ اس طرح کی کرافٹنگ نہیں کرتے بلکہ اپنے افسانوں میں پگھلنے یا گھلنے والی صورت پیدا کر کے زخمی احساسات اور ماحول کی گرانی کو نہ صرف قابل برداشت بناتے ہیں، بلکہ کہیں کہیں لطیف کیفیت ابھار دیتے ہیں، جس میں طنز کا بھرپور وار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک افسانے میں گٹر کا ذکر کرتے ہیں جس میں ننگ دھڑنگ بچے شپ شپ کرتے دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں ایک بچے سے افسانے کا کردار سوال کرتا ہے۔

مگر تم کون ہو؟

ہم۔ ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس گٹر کے اندر۔

یہاں تلمیح بیانیہ میں تحلیل ہو کر سامنے آئی ہے اور افسانے کی کلیت کا ایک جزو بن گئی ہے۔ تلمیح کا گھل جانے والا عمل اکثر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہاں جگانے والا آ گیا ہے۔ وہ دیکھو۔
دیکھو لوگ اس کے انتظار میں بارش میں بھیگ رہے ہیں۔
ہاں ان کے دل سچ کے ساتھ ہیں۔ وہ اس کے منتظر ہیں۔ لیکن اسے یاد آیا، انھوں نے کہا تھا۔ ہمارے دل تمھارے ساتھ ہیں۔
لیکن تلواریں۔
افسوس ہم اپنی تلواریں بیچ چکے ہیں۔
اس نے گھبرا کر اپنی تلوار کو دیکھا۔
لیکن میرے پاس تو تلوار ہے ہی نہیں۔ میری تلوار تو وہ پہلے ہی چھین کر لے گئے ہیں۔

(بے چہرہ آدمی)

اب تم بتاؤ میں کیا کروں ؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی ہوئی ہیں، گھات لگائے بیٹھی ہیں، اور میں قطرہ قطرہ مر رہا ہوں،
میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا ہے، اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں ؟
..... تو پھر تم نے کیا سوچا ہے ؟
کیا اب بھی بیعت نہیں کرو گے ؟

(لا = ؟)

اوپر کے اقتباسات میں روایات کی طرف براہ راست اشارہ نہیں ہے، اس لئے کہ تلمیح کے عمل اور ردعمل کو پیش کیا گیا ہے، مگر اکثر جگہوں پر باقاعدہ اور واضح طور پر تلمیح کی کرافٹنگ ملے گی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ دیوداسی نے ہاتھ باندھ کر ہواؤں میں کسی کو نمسکار کیا اور بولی۔ ہے بھگوان پورس اس دھرتی کا سپوت ہے،

تیرا بیٹا ہے، تیری دھرتی کا رکھ والا، اسے شکتی دیجیو۔ ہے بھگوان اسے شکتی دیجیو۔

ہم سب نے سر جھکائے اور اپنے اپنے راستوں پر چل نکلے۔

سکندر کہتے، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، میرا ہیرو پورس ہے۔

(سمندر قطرہ سمندر)

اس کی آنکھوں کی کربلا میں بھوکے پیاسے خیمے ابھر آئے، پیاسے خیموں سے گھوڑا باہر نکلا اور اپنے سوار کو لے کر خون خون میدان میں قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(ریزہ ریزہ شہادت)

افسانہ "ہابیل و قابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ" کی ساری بنت تلمیحاتی ہے۔

ظاہر ہے رشید امجد تلمیح کے ذریعہ "آج کی جو بے معنویت کی صورت حال ہے" اسے "معنی کی جو صحیح صورت حال ہونی چاہئے" سے ٹکرا دیتے ہیں۔ وہ معنی کی نئی دنیا کو VISUALISE کرتے ہیں۔ اچھی زندگی کو فنی طور پر خلق کرنے کے لئے وہ قدیم سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ رشید امجد تلمیح کا استعمال علامتی سطح پر کرتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی اسطوری سطح نمایاں ہونے لگتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں بیانیہ کا الگ نشیب و فراز ہے۔ ان کے اسلوب میں ٹھوس ہیئت نظر نہیں آتی۔ مثلاً جیسی کہ انور سجاد کے یہاں ٹھوس کرافٹنگ ہے۔ وہ اس طرح کی کرافٹنگ نہیں کرتے بلکہ اپنے افسانوں میں پگھلنے یا گھلنے والی صورت پیدا کر کے زخمی احساسات اور ماحول کی گرانی کو نہ صرف قابل برداشت بناتے ہیں، بلکہ کہیں کہیں لطیف کیفیت ابھار دیتے ہیں، جس میں طنز کا بھرپور وار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک افسانے میں گٹر کا ذکر کرتے ہیں جس میں ننگ دھڑنگ بچے شپ شپ کرتے دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں ایک بچے سے افسانے کا کردار سوال کرتا ہے۔

مگر تم کون ہو؟

ہم۔ ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس گٹر کے اندر۔

ربڑ کے غبارے ؟
ہاں۔ وہ غبارے جو لوگ استعمال کر کے گٹر میں پھینک دیتے ہیں۔

(سناٹا بولتا ہے)

اسی طرح ایک اور جگہ بڑی سادگی اور سبک روی کے ساتھ طنز کچھ اس انداز میں داخل ہوتا ہے کہ افسانہ چلتا رہتا ہے اور طنز وار کرتا جاتا ہے۔

میں، وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں اور رات کی کالی
گلیوں میں اسے تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھتے ہیں، اور اب
ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔
میں کون ہوں ؟
تم کون ہو ؟
وہ کون ہے ؟
وہ جو خوشبو کی طرح محسوس تو ہوتی ہے، دکھائی نہیں دیتی۔ (لیکن
خوشبو تو صرف ان کے لئے ہے جو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں)

(خواب انتظار)

افسانہ قاری کے ذہن میں تحلیل ہو کر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ بوجھ کا احساس نہ ہوتے ہوئے بھی ماحول کا بوجھل پن اسے متاثر کرتا ہے۔ تحلیل ہونے والی ہلکی کیفیت انور سجاد کے افسانوں میں کم کم نظر آتی ہے، اس لئے کہ انور سجاد کے یہاں ماحول کی شدت اور کردار کے بوجھ کو بڑے ٹھوس انداز میں کرافٹ کیا جاتا ہے۔ افسانوی سبک روی رشید امجد کی تخلیق کو شائستہ مزاجی سے ہم کنار کرتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں وقت کی صورت حال اور عصری حسیت، روز مرہ زندگی کی شناخت یا بے شناختی کے آئینہ میں پورے آب و تاب سے دیکھی جا سکتی ہے۔ نئی تراکیب نئے الفاظ اور محاورے جو ان کے ہاتھ آگئے ہیں، بہترین آلے ہیں، جن کی نوک سے وہ عصری احساس کو ابھارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رشید امجد کے یہاں فرسودہ الفاظ اور پرانے محاوروں کی قلب ماہیت نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ انتظار حسین کی داستانوی زبان کے بالمقابل ایک اچھوتی اور عصری زبان خلق کرنے کے امکانات

روشن کرتے جارہے ہیں، جس میں داستانوی زبان ہی کی طرح پھیلنے اور بڑھنے کی گنجائشیں بدرجۂ اتم ہوں۔ طلسم سامری کی جگہ اس میں حقیقت خیز قوت نمو ہو۔ ظاہر ہے کہ المناک دور میں الف لیلوی زبان کے بالمقابل کربلا کی پیاسی زبان زیادہ معجز نمائی انجام دے سکتی ہے۔

(وہ) الف لیلیٰ کی کوئی کہانی سنا رہا ہوگا۔ کربلا کی پیاس بھلانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

(کالے لفظوں کا پل صراط)

اس طرح کی معجز نمائی، جو المیہ کے بطن سے پھوٹتی ہے، زبان کو اتنا لچکیلا بنا سکتی ہے کہ ہر چیز اس کی لپیٹ میں آجائے۔ ایسا لگتا ہے رشید امجد کی زبان اپنی جڑوں میں اتر کر بنیاد تلاش کر رہی ہو اور اپنے کھوکھلے پن کو تج کر پھر سے پھوٹ رہی ہو۔ یہ زبان براہ راست اور حقیقت خیز امیجز کو محسوس پر منطبق کرتی ہے۔ رشید امجد کی نثر کے چند تخلیقی جملے اور محاورے:

'ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت کی شمعیں پھڑ پھڑائیں'

پرانا جملہ ہوگا — ڈاکٹر نے حیرت سے دیکھا۔

'گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے پھر ٹیڑھی دیواروں اور لمحہ بہ لمحہ سرکتی چھت کا خیال آیا'

پرانا محاورہ ہوگا۔ پیروں تلے زمین سرکتی نظر آئی۔

'اس کی بیوی نے بات کو سمیٹ کر نالی میں پھینک دیا اور بولی۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے'۔

پرانا محاورہ ہوگا۔ بیوی نے سنی ان سنی کر دی۔

ایسا نہیں کہ رشید امجد پرانے محاورے استعمال ہی نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ انھیں تخلیقی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر اوپر والے ایک محاورے کو اس طرح تحلیل کرتے ہیں۔

"اگر وہ دیواروں اور چھت کا ذکر کرتا ہے تو ان سنی کر کے بے شمار مسئلوں میں سے کسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے"۔

کچھ اور جملوں میں محاوروں کا استعمال۔

'اس نے سوچا' یہ لوگ ضرورت کی منھ زور چڑیلوں سے بھاگ کر شہر چھوڑ جاتے ہیں، باہر جاکر محنت کی چکیوں میں پستے ہیں اور پھر جب واپس آتے ہیں تو ان کے بٹوے پھولے ہوئے ہوتے ہیں'۔

' سورج کی کرنوں میں جوانی کا گرم خون دوڑنے لگا ہے۔ وہ جسموں میں چٹکیاں لینے لگتی ہے'۔

افسانہ 'سید جو تالاب میں ڈوب گیا' میں انھیں نے جو لفظ خودکشی' کو فرسودہ اور کھوکھلا جان کر استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ اسے انھوں نے گھیر کر مرنے سے پہلے کا تجربہ' کہا ہے جس سے معنوی وسعت میں اضافہ ہوا ہے۔ سارے افسانے کو اگر فرسودہ زبان میں لکھا جائے تو شاید افسانہ باقی نہ رہے۔ اس طرح کی اچھوتی تشبیہات' نئے محاورے یا انوکھی تراکیب استعمال کرکے رشید امجد نے اپنے افسانوں میں جان ڈال دی ہے۔ وہ خیالات اور امیجز کے ادغام سے علامتی زبان خلق کرتے ہیں۔ مرئی اور غیر مرئی الفاظ کا سنٹیکس بناتے ہیں' اور جزو جزو علامتی اشاروں کے بل بوتے پر اس اس پوری علامت کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جس کی طرف افسانہ لپکتا ہے۔

رشید امجد کے یہاں جو کرافٹ مین شپ ہے' اس میں سوچ اور سامنے کے منظر کی بنت ہے۔ سوچ میں ماحول کی غیر مرئی خصوصیات اور تکلف کا لا متناہی سلسلہ ہوتا ہے۔ منظر میں کانکریٹ امیجز ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سامنے کا گزرتا یا ٹھہرا ہوا منظر' سوچ کے لئے مواد کا کام دے رہا ہو' اور فن کار اسے تخلیق میں ڈھالتا چلا جارہا ہو دوسری طرف کرافٹنگ کرنے میں بات سے بات کے بجائے زیادہ تر بات سے سوچ نکلتی ہے' اور سوچ سے احساسات کی رو جو صورت حال کو تخلیقی طور پر سامنے لاتی ہے۔ عام گفتگو میں کوئی شخص اگر بات کرتے کرتے یکایک چپ ہو جائے تو دوسرے سننے والوں کے ہاتھ چند کہی ہوئی باتوں کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ ہاں چپ کے دوران سوچ کا جو تسلسل بنا رہتا ہے اگر فن کار الفاظ میں اس کا احاطہ کرلے تو اس طرح دو باتوں کے درمیان والی خاموشی کے زمانی خلا کا احتساب بھی ہو جائے گا اور سوچ کا دقفہ کرافٹ بھی ہو جائے گا۔ اس تکنیک سے صورت حال میں ابھار پیدا ہوتا ہے اور علامتی کیفیت

جو فن کار پیش کرنا چاہتا ہے، اس پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ رشید امجد کے یہاں اسی دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں سوچ اور احساسات نئی نئی سمتوں میں لپکتے ہیں اور افسانے کے علامتی کل کو لپیٹ میں لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ 'سہ پہر کی خزاں' ہے، جس میں موجودہ سے ماضی کی طرف لوٹ جانے کے عمل میں جو سوچ ابھرتی ہے، کچھ ایسی ہی ہے۔ راوی باتیں کرتے کرتے اچانک ماضی میں غرق ہو جاتا ہے، پھر ہوش اسی وقت آتا ہے جب ملازم وارد ہو کر سکوت توڑ دیتا ہے۔

'بیگم صاحبہ کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں'۔

یہ جملہ اسے پھر استغراق کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ جملہ کے ردِ عمل سے صورت حال کے ادراک میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے رشید امجد کے یہاں ماضی کے استغراق اور بیوی کے ردِ عمل میں فرد کی شناخت کا مسئلہ مناسب ترین معنویت کے ساتھ کرافٹ کیا جاتا ہے۔

" نمبر"۔ بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے عینک کے دھندلے شیشوں میں سے اسے گھورا۔

"ETE-23704"

اکاؤنٹنٹ نے پے رول پر نشان لگایا اور تنخواہ کا ٹوکن اس کی طرف لڑھکا دیا۔ نوٹ گنتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لین دین کے پورے صفحے کو جلدی جلدی جمع تفریق کیا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لیے۔ "تو آج تمھیں تنخواہ ملی ہے"۔ وہ مسکرائی۔

" ہاں۔ اور بڑی مشکل سے بیس روپے بچا سکا ہوں"۔

' تم بیوقوفی کی حد تک صاف گو ہو'۔ وہ آہستہ سے بولی۔

' یہ اچھی بات نہیں'۔

یہ حصہ افسانے میں الگ سے کرافٹ کیا گیا ہے۔ سوچ کا یہ ٹکڑا افسانے کی تقسیم سے الگ نہیں۔ افسانے کے اس طرح کے PASSAGES کے درمیان خطِ فاصل کھینچا جا سکتا ہے جو لمحۂ گزراں کے ساتھ بدلتے ہوئے احساسات اور ردِ عمل کو الگ کرتے ہیں یا

ماضی اور یادوں کو سوچ کی مختلف پرتوں میں آتارتے ہیں۔ میرا خیال ہے ان افسانوں میں شعری STANZAZ کی کرافٹ البتہ افسانے کو افسانے سے دور کرتی ہے۔

رشید امجد کے اظہار کا ایک خاص آرٹ کار مکالمہ ہے۔ میرا خیال ہے مکالمے یہاں دوہرے کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استغراق کے عالم میں بھی مکالمے ابھرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں توجہ کے لائق افسانہ 'نارسائی کی مٹھیوں میں' ہے جس میں پس منظر بدلتا ہے، مختلف کردار آآ کر مکالموں سے جڑتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں مگر مکالموں کا فکری تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ مکالموں سے ہی تفاعل کراتا ہو۔ بدلتے ہوئے ماحول اور بدلتی ہوئی سوچ کا تصادم مکالموں سے ہوتا ہے جو عموماً حقیقی اور ٹھوس ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقت اور خواب آپس میں گتھے نظر آتے ہیں۔

مکالموں کی شکل کبھی داخلی ہوتی ہے کبھی خارجی۔ اسی طرح جیسے مناظر کی حیثیت کبھی خارجی کبھی داخلی ہوتی ہے۔ جب مکالموں کی صورت خارجی ہوتی ہے تو ان کی خارجیت صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ انھیں کی راہ سے فن کار اور قاری دونوں خارجی دنیا سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ خارجی مکالموں کا رویہ کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے کوئی شخص پانی میں غوطہ لگانے کے بعد سطح پر ابھرے، ہوا میں سانس لے، ایک نظر باہر ڈالے، پھر ڈبکی لگادے۔

داخلی حیثیت سے مکالموں کی تین صورتیں ہیں۔ ایک وہ جب کہ وہ اپنی صحیح شکل میں یاد آتے ہیں۔ ایک وہ جو داخلی تخلیقی تفاعل کے باعث ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور اپنی شکل بگاڑ لیتے ہیں۔ تیسری شکل یہ ہے کہ مکالمے نہ باہر سے امپورٹ ہوتے ہیں' نہ یادوں کے ذریعہ وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ داخل میں اپنے آپ بن جاتے ہیں۔ ایسے مکالموں سے رشید امجد صورت حال کا گہرا عکس منقش کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ رشید امجد جیسا فنکار اپنا قاری آپ پیدا کرنے کی راہ اپناتا ہے۔ یہ کڑی منزل یقیناً حالی کے دور سے آگے کی منزل ہے۔ حالی کے 'جمہور' اور آج کے قارئین میں فرق یہ ہے کہ حالی 'جمہور کا دل' جوں کا توں قائم رکھتے ہیں، اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں نکالتے۔ کیا 'جمہور کا دل' نئے آہنگ کے اعتبار سے بدلتا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عصر حاضر کا فنکار نیا 'جمہوری' رابطہ خلق کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ میدان ہے جہاں قدیم ڈھانچے نئی لسانی تخلیقات سے مات کھا سکتے ہیں۔ □

ڈاکٹر ایوب میرزا
۱۵۔ بی، ہارلے اسٹریٹ
راولپنڈی، پاکستان

رشید امجد شخص سے افسانہ نگار تک

راستہ چلتے دائیں بائیں ڈولتے ہوئے رشید امجد کو دیکھ کر بری طرح پٹے ہوئے کسی کنفیوز شاعر کا گمان ہوتا ہے لیکن شاعری اس کے قریب سے نہیں گزری۔ افسانہ اس کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ جوانی کی دہلیز پار کر چکنے کے بعد بھی ہمہ وقت افسانے میں نئی تانیں اڑاتا اور انوکھے رنگ بھرتا رہتا ہے۔

لیکن اس کے والد بزرگوار جناب مونس نقشی باقاعدہ شاعر اور صاحب سخن تھے۔ پابند شاعری کے اسیر مونس نقشی سری نگر شہر کے باسی روزی کمانے کے لیے قالین بافی کرتے تھے، اور دولت اڑانے کے لئے شاعری کی بنت میں پروئے ہوتے تھے۔ دونوں میں مشاق تھے۔ خوشحالی قالین کے ساتھ گھر میں وال ٹو وال بچھی ہوئی تھی۔ اور شاعری کوشش بسیار کے باوجود ان کے گھر میں فاقہ اور غربت کو جنم نہ دے سکی تھی۔ ایسی ریل پیل اور لطیف سہانی فضا میں رشید امجد رینگتے رینگتے چلنے لگا۔ اور نقشی صاحب نے اپنے نقشِ دل کو ریاست کے سب سے مہنگے اور اونچی نسل کے سکول برنز ہال (BURNS HALL) میں داخل کرا دیا۔ امرار اور رؤسا کے لئے یہاں خالص ولایتی سماں تھا۔ دیسی بچے دھیرے دھیرے مالی بولی اور کشمیری اور اردو زبان سے دور ہوتے جاتے اور سرعت کے ساتھ انگریزی کے گرداب میں ہاتھ پاؤں مارتے ڈوب جاتے۔ سری نگر کے خوبصورت علاقہ ایراکدل کی دلفریب فضا میں اس سکول کی امیرانہ ہوا غریب کی اولاد کے پھیپھڑوں کے لئے دِق تھی۔ ایسی امیرانہ فضا و ہوا میں رشید امجد بھی کھلے انگلش سانس لیتا اور انگریزی کے فراٹے بھرتا۔ وہ خوشی میں پھولا نہ سماتا تھا۔ نیکر پہنے دُبلی لمبی ٹانگوں اور ذہین نظروں والا یہ پروا کبھی بھی سکول کے ڈائیننگ میز سے غیر حاضر نہ ہوا تھا۔ اسے لذیذ لنچ بیحد عزیز تھا۔ دو برس میں اس کا انگ انگ انگریزی رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ اسے ورنیکلر کا ایک لفظ تک یاد نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج رشید امجد انگریزی کی پرواہ نہیں کرتا اس وقت اسے اردو کی سدھ بدھ تھی نہ پرواہ!

پوچھا رشید امجد تم پنڈی کب اور کیسے پہنچے ؟ ــــ بولا ــ ڈاکٹر صاحب میں ــــ پاس کر چکا تھا یہی ۱۹۴۷ء کے ستمبر کا کوئی دن تھا ۔ والد صاحب کو راولپنڈی میں آباد بہن کی یاد نے ستایا ۔ بولے پنڈی جانا ہے ۔ امی جیں بہ جبیں ہوئیں ۔ بولیں لو سنو یہ چلے پنڈی ! مگر ڈاکٹر صاحب وہ بھی سیر کی رسیا تھیں ۔ وقفہ کے بعد کہنے لگیں "کب چلو گے ؟" یوں ماں جی کو راضی برضا پاکر والد محترم نے سفر کے لئے کمر باندھ لی ۔ کہا رشید امجد ہمارے پسماندہ مشرقی معاشرے میں بہنوں کا مان بھائیوں ہی سے ہوتا ہے ۔ بولا وہ تو ٹھیک ہے ۔ خیر والد صاحب نے فی الفور بچاس قالینوں کا ایک ہی بنڈل باندھا ۔ امی جی نے پوچھا یہ کیا ہے ؟ بولے یہ بنڈل ہے ۔ اس میں قالین ہیں ۔ پوچھا وہ کس لئے ؟ بیچنے کے لئے ! امی نے والد محترم کو خشمگیں نظروں سے گھورا ۔ والد محترم نے امی پر سے نظریں ہٹا کر بنڈل پر گاڑ دیں ۔ دھیمے لہجے میں بولے نیک بخت خرچہ نکل آئے گا ۔ برہم اماں جی چیخیں وہاں کونسا تمہارا ـــ گاہک بیٹھا ہوا ہے ۔ حالات دیکھو ! ہائے اس مرد کی عقل پر تو پردہ پڑ گیا ہے ۔ ایسے میں ان کو کون خریدے گا ؟ الٹا ان پر بھاڑا اٹھے گا ۔ نہیں یہ قالین نہیں جائیں گے ۔ ڈاکٹر صاحب ابو امی جی کی برہمی کی ویسے بھی تاب نہیں لا سکتے تھے ۔ اس وقت بھی یہی ہوا ۔ بنڈل کو ایک کونے میں رکھا ۔ اس پر پردہ ڈالا اور امی جی میری ایک بہن اور مجھے ساتھ لے کر یوں پنڈی پہنچے ـــــ پھر ؟ ؟

پھر یہی کوئی دن گزرے ہوں گے ۔ راولپنڈی میں تباہی آ گئی (اپنی ہیئت گذائی سے یہ مخلوق خدا خاصی خوفناک لگتی تھی ۔) ادھر کشمیر میں دمادم مست قلندر ! میرا مطلب ہے جنگ چھڑ گئی اور کشمیر جانے کے راستہ میں بارڈر آگ آیا ۔ دونوں اطراف سے دنا دن توپیں چل رہی تھیں اور گولیاں برس رہی تھیں ۔ ماں برستیں ۔ یہ کون سا وقت تھا بہن کو ملنے کا اور راہتوں سے بچھڑنے کا ؟ ڈاکٹر صاحب یوں سمجھئے ہم پھوپھی جان کے ہاں پھنس کر رہ گئے جیسے سیلابی پانی کے ریلے میں ہچکولے کھاتا بکھرا ہوا گھونسلا کنارے کی کسی جھاڑی میں پھنس جاتا ہے ۔

دن گزرتے گئے ۔ رقم ختم ہوتی گئی ۔ پھوپھی تنگ آتی گئی اور کشمیر مسئلہ کشمیر بنتا گیا ۔ ہم سب سیاست کے انجانے کھیل میں الجھ گئے ۔ امی جی والد محترم کو تنہا پاکر برہم ہوتیں ، چیختیں ہائے اس مرد کی عقل پر پردہ پڑ گیا ۔ ہائے وہ بنڈل ہی اٹھا لایا ہوتا ۔ آج کام آتا ۔ امی جی کی حیرانی سے چوڑی کھلی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر والد محترم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ۔ نرم لہجے میں بولتے نیک بخت بنڈل پر پردہ ڈال کے آیا ہوں ۔ اسے چور نہیں لے جائیں گے ۔ ہمیں یہاں بیٹھا

تو نہیں رہنا ہے نا! راستہ کھلنے کی دیر ہے ۔ بس چلتے ہیں ۔ ذرا صبر کرو! دراصل دونوں نہیں جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے؟ جو ہوا اس کے لئے وہ تیار نہ تھے اور صبر کی حدوں سے وہ بے خبر تھے ۔ وہ بے کنار تھیں ۔ ماں پوچھتیں وہ کیسے کھلے گا؟ اُدھر بھارت اِدھر پاکستان ۔ کیسے کھلے گا یہ راستہ؟ کون کھولے گا؟ والد محترم بولتے ۔ بی بی بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیری بھی تو ہیں ۔ (چکی کے دو پاٹوں کے درمیان) ۔ راستہ کون بند کر سکتا ہے؟ اور دونوں اس 'کون' سے نا آشنا تھے ۔ ماں کو خوش دیکھ کر والد صاحب چپکے چپکے دلاسہ دیتے ۔ بی بی بھرا گھر چھوڑ کر صرف ملنے آئے ہیں ۔ ہمیں یہاں ٹکنا نہیں ہے ۔ یہ تو عارضی فساد ہے ۔ راستے بھی کبھی بند ہوئے ہیں؟ بارڈر کیا چیز ہے؟ اسے کون بند کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب! پھر راستوں پر ننگی سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے گئے ۔ راستہ بند ہو گیا ۔ پونجی ختم ہونے کو آئی ۔ پھوپھی جان سے چخ چخ بڑھی تو اماں جی بولیں ۔ نیک بخت یہیں کچھ کام وام کر لو ۔ روٹی کا بندوبست ازبس ضروری ہے ۔ گمبھیر آواز جس میں گہرا تیقن تھا بولے ۔ بی بی مجھے قالین بافی آتی ہے ۔ مگر یہ شہر تانگہ بانوں کا شہر ہے ۔ مجھے تانگہ چلانا نہیں آتا ۔ تانگہ گیری میری جبلت میں نہیں ہے ۔ اس میں شاعری ہے ۔ میں شعر کہتا ہوں ۔ یہاں میرے شعر کون سنے گا؟ یہاں ویسے بھی شاعروں کی بھرمار ہے ۔ یہاں تانگہ چلتا ہے اور لوگ موزونیت کا لبادہ اوڑھے خراماں خراماں گھوم رہے ہیں ۔

جی جناب! پریشانی میں کمی کہاں سے آتی؟ بلکہ مزید اضافہ ہوا تو ماں بولیں کوئی کلیم ولیم داخل کر، کوئی الاٹمنٹ کروا ۔ اب پھر سے گھر بسا ۔ زندہ رہنا ہے کہ نہیں؟ غضب الٰہی کے بخار میں تپتے ہوئے مفلوک الحال نقشی صاحب نے کوئی الاٹمنٹ نہ کروائی ۔ کوئی کلیم داخل نہیں کروایا ۔ ان کا ایک ہی کلیم تھا ۔ راستہ کھولو، اور ایک ہی رٹ تھی راستہ کیسے بند ہو سکتا ہے؟ دروازہ کھولتے ہوئے بولتے ۔ غور سے دیکھو ۔ دروازے کھلنے کے لئے ہوتے ہیں ۔ راہ چلنے کے لئے ہوتی ہے ۔ راستہ آنے جانے کے لئے ہوتا ہے ۔ راستہ کھلتے ہی ہم سب پلک جھپکتے میں سری نگر ہوں گے ۔ رشید امیراکدل یرزنہ ہال میں ہوگا ۔ بس تھوڑا سا صبر کرو ۔ راستہ کھل جانے دو ۔ ڈاکٹر صاحب! راستہ کھولنے کا نسخہ، ترکیب یا سکت ہمارے والد محترم کے بس میں نہ تھی اور راولپنڈی میں قیام غیر یقینی طوالت سے بوجھل ہونا شروع ہو گیا ۔ فاقوں کی سرحدیں قریب آ گئی تھیں ۔ نہ کام نہ دھندا، بند راستہ سب کے گلے کا پھندا!

بھائی صاحب ! آپ پہ واری واری جاؤں ۔ جان ہزار بار صدقے کر دوں ۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ۔ پانی سر سے گزر چکا ہے ۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے ۔ میں بال بچہ دار ہوں میرا سسرال ہے ۔ اب آپ اپنا راستہ لیں ۔کہیں گھر بنائیں ۔ اپنے بیوی بچوں کو سنبھالیں ۔ ایک روز بہن کی یہ باتیں سن کر نقشی صاحب کا دل و دماغ سن ہوگیا ۔ انھیں پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ اس تمام گھن گرج میں وہ ایسے ہی تنہا کھڑے راستہ تلاش کر رہے ہیں جیسے حضرت آدم روزِ اوّل کرۂ ارض پر ۔

اور رشید امجد نانک پورہ کے پچھواڑے لٹی کے گندے نالے پہ ڈل جھیل اور امیرا کدل میں برنز ہال اسکول کو یاد کرتا رہا ۔ وہ ہجولیوں میں اَن فٹ تھا ۔ اس کی انگلش گٹ پٹ ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ اور اسے ان کی بامحاورہ پھولوٹوہاری پنجابی مغلظات پلے نہ پڑتی تھیں ۔ وہ اپنی ہی گلی میں غریب الدیار گلہری کی طرح اجنبی تھا ۔

مزید تذبذب کی تاب نہ لاتے ہوئے رشید امجد کو محلے کے ایک پرائیویٹ سکول میں بٹھا دیا گیا ۔تعلیمی ماحول مخلوط تھا ۔ جماعت چہارم کے بعد لڑکوں کو فارغ کر دیا جاتا تھا ۔ہیڈ مسٹرس بے اولاد تھی ۔ اسے سرخ گالوں والا انگریزی شائستگی سے مرصع کومل نرمل رشید امجد ملا تو بھا گیا ۔ وہ اسے بیٹے کی طرح چاہنے لگی ۔ لڑکیاں اسے اپنے ہی جیسا جانتی تھیں ۔ اس کا دل لگ گیا ۔ اور ہیڈ مسٹرس نے اسے چار کی بجائے سات سال تک اپنے پاس رکھا ۔

ادھر مونس نقشی ماؤف دماغ اور آزردہ دل لئے شعر کہتے اور خود ہی سر دھنتے تھے ۔ بے بسی کے اس عالم میں یاروں نے مشورہ دیا نقشی بھائی راستہ کھلے گا جب دیکھا جائے گا ۔ سر دست کچھ ٹھکانہ کر لو ۔ بہن کے گھر کب تک پڑے رہو گے ۔ حکومت مظفر آباد میں قالین بافی کا کارخانہ لگا رہی ہے ۔ نظرِ انتخاب آپ پر ہے ۔ جائیے اسے سنبھالئے ۔نیم فاقہ زدہ نڈھال نقشی کے لئے روزگار کا دروازہ کھل رہا تھا ۔ چہرے پر روشن کرن لئے بیوی سے بولے ۔ نیک بخت دیکھ مظفر آباد تک کا راستہ تو کھلا ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب وہ ہجرت ہو کر مظفر آباد یہ کارخانہ چلانے چلے گئے ۔

اور جناب اب جنگ بند ہو چکی تھی ۔ بارڈر کے دونوں اطراف بھارتی اور پاکستانی سنگینیں لشکارے مار رہی تھیں ۔ بارڈر کے اُدھر کے کشمیری اور اِدھر کے کشمیری یو ۔ این ۔ او کی طرف دیکھ رہے تھے اور یو ۔ این ۔ او ۔ امریکہ میں میکارتھی ازم کے سیاہ سائے میں گھرا

ئی برلن، کوریا اور ویت نام میں ایک نئے بھیانک کھیل کی لمبی بساط کو جانچ رہی تھی۔ میر میں یو۔این۔او۔ کے دستے آچکے تھے کہ راستہ کھلنے نہ پائے۔ کشمیریوں پر کشمیر کے تمام ستے بند تھے۔ مگر ادھر کے سانپ ادھر کی بانبی میں بے خطر چلے جاتے اور اُدھر کے کتّے بھونکتے بھونکتے ادھر کے اجڑے دیہاتوں کی ویران گلیوں میں روٹی کے ٹکڑے تلاش کرتے پھرتے۔ یہ آزاد تھے، اور بوئے الفتِ انسان دونوں جانب مقیّد اور پابجولاں تھی ــ پھر؟؟

پھر قالین بافی کی فیکٹری مکمل طور پر فیل ہوگئی۔ رزق کی جستجو میں لاہور، پشاور یں دھکّے کھاتے کھاتے اور پشاور روڈ کی فیکٹریوں کی خاک چھانتے چھانتے نقشی صاحب کے چہرے کے خوبصورت کشمیری نقش راولپنڈی کے تانگہ بانوں کے چہروں کی گہری کھائیاں بن گئے۔ جھرّیوں کے بوجھ سے ان کے ٹخنوں میں درد اٹھا تو پاؤں میں سوجن نے جنم لیا۔ چلنا پھرنا دوبھر ہوا اور مونس صاحب بے مونس و غم خوار کھاٹ سے لگ گئے۔ رشید امجد باپ کی کھاٹ کے پائے کے پاس پہروں کھڑا انھیں بغور دیکھتا رہتا مگر کچھ نہ بولتا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ گنگا جمنا اور وادئ سندھ کی تہذیبوں کے سنگم پر رشید امجد کے پاس اپنے مجبور باپ کی تنہائی کا کوئی مداوا نہ تھا۔

اس کے سامنے باپ کی آنکھیں بند ہو رہی تھی۔ وہ گھر کے بند دروازے کو گھورتا، بڑبڑاتا "راستہ کون بند کرسکتا ہے؟" مونس نقشی نے آخری ہچکی لی۔ اس کی روح قفس عنصری کا گیٹ کھول کر پرواز کرگئی۔ اور یوں شیتل نرمل کومل رشید امجد کے لیے جو کبھی چنچل تھا یتیمی کا نزول ہوا ـــــ پھر؟؟

پھر میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب ڈینیز ہائی اسکول میں تھا۔ ماں مجھے پھول کی مانند جتی تھی۔ دھوپ میں باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ اور جناب اگر میں غسل خانے میں ذرا دیر لگاتا تو وہ فوراً دروازے کے پٹ کھول دیتی۔ اسے بند کواڑ بہت برے لگتے تھے۔ میری ماں نے بہت محنت کی۔ اس نے گھر میں ہر فالتو اور فاضل چیز کو قربان کردیا اور پھر آخر میں غربت سے اس غیر منصفانہ جنگ میں اس نے اپنا زیور بھی بیچ ڈالا۔ وہ یقین محکم کا پیکر تھی اس نے بچوں کو پالنے میں مثالی مشقت کی ہے۔ مجھے دکھ ہے میں اس کے کام نہ آسکا۔ اسے سکھ نہ پہنچا سکا ـــــ پھر؟؟

پھر جناب میں نے دسویں پاس کرلی۔ میری آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں اور میں فری

تھنکنگ کے آزار میں گھر گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب فری تھنکنگ کا چرچا تھا۔ اور میرا مطلب ہے ذرا سا فیشن بھی تھا۔ جو جی چاہے سوچو، جو جی چاہے بولو جو جی چاہے کرو۔ روک ٹوک سے، میرا مطلب ہے قدغن سے پاک فضا جس میں مساویانہ رویۂ حیات اور فطرت پنپ سکے! ــــ یوں رشید امجد فری تھنکنگ کے آزار میں مبتلا ہو گیا۔ اس عشق میں وہ ٹاہلی کی طرح لمبا ہوتا گیا لیکن پھل نہ سکا۔ زینہ زینہ وہ زمانے کے لمحات کی کڑیوں میں جکڑتا گیا۔

ایسے ہی ایک لمحہ کی بات ہے جب المٹرا لیبلے گبرو رشید امجد کے سر پر سیاہ بالوں کی بودی قائم تھی۔ وہ دسویں پاس کر کے کالج میں داخلہ لینے پہنچا۔ جیب داخلہ کی فیس کے روپوں سے بھاری تھی۔ کشمیری بوجھ اٹھانے کے اہل ہیں۔ بوجھ اٹھانا گرچہ ان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن چکا ہے لیکن وہ اسے دل سے پسند نہیں کرتے لہذا بوجھ اتار کر جب وہ سسکارتے ہیں تو ان کے پھولے ہوئے نتھنوں سے مست مور کے پائل پروں کی جھنکار سے نکلتی ہوئی شوشنکار کی طرح پسینے اور رطوبت میں رچی سانس کی خوشبو اردگرد پھیلتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہے۔

رشید امجد اپنی بوجھل جیب کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکا۔ کالج کیشئر کے دفتر کی کھڑکی دھندلا گئی ــــ اسے وہ نظر ہی نہیں آئی۔ کالج کے سامنے کیفیٹریا کا دروازہ دکھلائی دیا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ ڈرتے ڈرتے چپکے سے اس نے سالم مرغ روسٹ کا پہلی بار آرڈر دیا۔ جیب کو ٹٹولا۔ نوٹ موجود تھے۔ ان کے انوکھے لمس سے سرشار اس نے مسکراتے ہوئے کوک کا آرڈر بھی دے دیا۔ یہیں سے اس کی فری تھنکنگ کا آغاز ہوا۔ روسٹ مرغ کھانے کے بعد اس روز رشید امجد نے بیرے کو بہت پتے کی باتیں بتائیں اور عجب عجب نکتے سمجھائے۔ بولا میرے بھائی بیرے میں دس پاس ہوں۔ علم روشنی ہے۔ علم بڑی چیز ہے۔ یہ انسانیت کا زیور ہے۔ پھر اٹھتے ہوئے اس نے بیرے کے صافی والے کندھے کو چھوا۔ دھیرے سے بولا غربت اندھیرا ہے۔ بہت بڑا اور گہرا اندھیرا ہے۔ یوں گورے چٹے ان پڑھ بیرے کو زیورِ علم سے آراستہ ہونے کا درس دے کر کوک کا آخری گھونٹ پی کر وہ کیفیٹریا سے باہر نکلا۔ اسے آج باہر کی فضا میں ہوا بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ سامنے کالج سے ملحقہ اونچی عمارت دیکھ کر بولا 'سارے لوٹرز (LOOTERS) ــــ استحصال پسندوں کا حرامکار ٹولہ!

اب یہ روز کا وطیرہ تھا۔ ایک روز چکن تکہ کی ٹانگ چیرتے ہوئے اس نے بیرے کو بتایا یہ ہوٹل والا اس کا استحصال کرتا ہے۔ جب بیرے نے کہا باؤجی وہ میرے ساتھ

ری ۔ اپریل ۸۸ء

بھی نہیں کرتا تو رشید امجد نے اسے سمجھایا کہ وہ اس کی محنت کا پھل کھاتا ہے اور موٹا نا جاتا ہے اور یوں اس کا استحصال کرتا ہے ۔ بیرہ اکثر بیروں کی طرح اس کا منہ دیکھتا تا تھا ۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ وہ ہوٹل کے مالک سے اب استحصال نہیں کروائے گا ۔ لا باؤ جی تسی بڑے چنگے ہو ۔

کچھ روز مزید فری تھنکنگ کا سلسلہ چلتا رہا اور رشید امجد کی جیب کا بوجھ ہلکا ہوتا رہا اور پھر وہ ہلکی ہوگئی ـــــ خالی ہوگئی ۔ یوں ہلکی جیب اور خالی ہاتھ اسے کالج یاد آیا ۔ کھڑکی سے کیشئر نے کہا بہت دیر کی مہرباں آتے آتے ۔ داخلہ بند ہو چکا ہے ۔ رشید امجد کھلے آؤٹ گیٹ سے بنا علم کی روشنی لئے کالج سے باہر نکل آیا ۔

فری تھنکنگ کی مشک کا مشکیزہ اٹھائے خالی نرم ہاتھوں کا مال بیچنے وہ پی ۔ ڈبلیو ۔ ڈی کے دفتر پہنچا اور اوورسیئر منشا یاد کا ورک مستری ہوگیا ۔ شام کو کام کا حساب دیتے ہوئے اسے خدا یاد آتا ۔ فری تھنکنگ کام آچکی تھی ۔ تھکے ہارے رشید امجد کے سر کے بال موسمی یاروں کی طرح اڑنا شروع ہوگئے ۔ بودی پتلی ہو چکی تھی ۔ مٹی میں آٹی بودی کو لئے وہ ایک روز کیفیٹریا پہنچا ۔ بیرا لپک کر آیا ۔ بولا باؤ جی کتھے ہو ۔ رشید امجد کی سٹی گم تھی ۔ ایک عدد کڑک چائے کا آرڈر دیا اور چپ چاپ چائے پی کر بغیر ٹپ دیئے اٹھا ۔ بیرے سے ہم کلام ہوئے بغیر باہر نکلا ۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی گھائل ہوگیا ہے ۔ بیرا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے باہر تک آیا ۔ چیخا باؤ جی مینوں رب دی قسم میں بخشش نہیں مانگتا ۔ میں آپ کا استحصال نہیں کروں گا ۔ آپ روز آیا کریں ۔ میں چائے پلاؤں گا ۔ میں تو روزانہ آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں ۔ آپ بڑی اچھی اور بہت پتے کی باتیں کرتے ہیں ۔ جب رات کو اپنے دوستوں کو یہی باتیں بتاتا ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں مجھے عقل مند سمجھتے ہیں ۔ مگر باؤ جی میں جانتا ہوں عقلمند کون ہے ؟ آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا ؟ آپ آتے کیوں نہیں ۔ رشید امجد رکا ۔ پل بھر کو سانس روک کر بولا ۔ یار صاف بات یہ ہے ۔ میرا مطلب ہے تم تو جانتے ہو ، تم تو سب کچھ سمجھتے ہو نا ! میرے یار وقت ایک جیسا نہیں رہتا ۔ میرا مطلب ہے وقت ہر وقت بدلتا رہتا ہے ۔ میرا وقت بدل گیا ہے ۔ اب پھر بدلے گا تو ضرور آیا کروں گا ۔ رشید امجد نے اپنی خالی جیب کو ٹٹولا ۔ بولا یار صاف بات یہ ہے علم بڑی شے ہے ۔ یہ بہت بڑی دولت ہے ۔ بیرہ نے لقمہ دیا ۔ یہ روشنی ہے اور غربت اندھیرا ہے ۔ بہت بڑا گھرا اندھیرا ۔ باؤ جی مجھے سب یاد ہے ۔ رشید امجد

تھنکنگ کے آزار میں گھر گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب فری تھنکنگ کا چرچا تھا۔ اور میرا مطلب ہے ذرا سافیشن بھی تھا۔ جو جی چاہے سوچو، جو جی چاہے بولو جو جی چاہے کرو۔ روک ٹوک سے، میرا مطلب ہے قدغن سے پاک فضا جس میں مساویانہ رویۂ حیات اور فطرت پنپ سکے! ــــ یوں رشید امجد فری تھنکنگ کے آزار میں مبتلا ہوگیا۔ اس عشق میں وہ ٹاہلی کی طرح لمبا ہوتا گیا لیکن پھل نہ سکا۔ زینہ زینہ وہ زمانے کے لمحات کی کڑیوں میں جکڑتا گیا۔

ایسے ہی ایک لمحہ کی بات ہے جب الھڑ البیلے گبرو رشید امجد کے سر پہ سیاہ بالوں کی بودی قائم تھی۔ وہ دسویں پاس کر کے کالج میں داخلہ لینے پہنچا۔ جیب داخلہ کی فیس کے روپیوں سے بھاری تھی۔ کشمیری بوجھ اٹھانے کے اہل ہیں۔ بوجھ اٹھانا اگرچہ ان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن چکا ہے لیکن وہ اسے دل سے پسند نہیں کرتے لہذا بوجھ اتار کر جب وہ سسکارتے ہیں تو ان کے پھولے ہوئے نتھنوں سے مست مور کے پائل پروں کی جھنکار سے نکلتی ہوئی شوشنکار کی طرح پسینے اور رطوبت میں رچی سانس کی خوشبو اردگرد پھیلتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہے۔

رشید امجد اپنی بوجھل جیب کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکا۔ کالج کیشئر کے دفتر کی کھڑکی دھندلا گئی ــــ اسے وہ نظر ہی نہیں آئی۔ کالج کے سامنے کیفیٹریا کا دروازہ دکھلائی دیا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے سے اس نے سالم مرغ روسٹ کا پہلی بار آرڈر دیا۔ جیب کو ٹٹولا۔ نوٹ موجود تھے۔ ان کے انوکھے لمس سے سرشار اس نے مسکراتے ہوئے کوک کا آرڈر بھی دے دیا۔ یہیں سے اس کی فری تھنکنگ کا آغاز ہوا۔ روسٹ مرغ کھانے کے بعد اس روز رشید امجد نے بیرے کو بہت پتے کی باتیں بتائیں اور عجب عجب نکتے سمجھائے۔ بولا میرے بھائی بیرے میں دس پاس ہوں۔ علم روشنی ہے۔ علم بڑی چیز ہے۔ یہ انسانیت کا زیور ہے۔ پھر اٹھتے ہوئے اس نے بیرے کے صافی والے کندھے کو چھوا۔ دھیرے سے بولا غربت اندھیرا ہے۔ بہت بڑا اور گہرا اندھیرا ہے۔ یوں گورے چٹے ان پڑھ بیرے کو زیورِ علم سے آراستہ ہونے کا درس دے کر کوک کا آخری گھونٹ پی کر وہ کیفیٹریا سے باہر نکلا۔ اسے آج باہر کی فضا میں ہوا بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ سامنے کالج سے ملحقہ اونچی عمارت دیکھ کر بولا 'سارے لوٹرز (LOOTERS) ــــ استحصال پسندوں کا حرامکار ٹولہ!

اب یہ روز کا وطیرہ تھا۔ ایک روز چکن تکہ کی ٹانگ چیرتے ہوئے اس نے بیرے کو بتایا یہ ہوٹل والا اس کا استحصال کرتا ہے۔ جب بیرے نے کہا باؤ جی وہ میرے ساتھ

یہ بھی نہیں کرتا تو رشید امجد نے اسے سمجھایا کہ وہ اس کی محنت کا پھل کھاتا ہے اور موٹا ہوتا جاتا ہے اور یوں اس کا استحصال کرتا ہے۔ بیرہ اکثر بیروں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہتا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ وہ ہوٹل کے مالک سے اب استحصال نہیں کروائے گا۔ بولا باؤ جی تسی بڑے چنگے ہو۔

کچھ روز مزید فری تھنکنگ کا سلسلہ چلتا رہا اور رشید امجد کی جیب کا بوجھ ہلکا ہوتا رہا اور پھر وہ ہلکی ہو گئی ــــ خالی ہو گئی۔ یوں ہلکی جیب اور خالی ہاتھ اسے کالج یاد آیا۔ کھڑکی سے کیشئر نے کہا بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ داخلہ بند ہو چکا ہے۔ رشید امجد کھلے آؤٹ گیٹ سے بنا علم کی روشنی لیئے کالج سے باہر نکل آیا۔

فری تھنکنگ کی مشک کا مشکیزہ اٹھائے خالی نرم ہاتھوں کا مال بیچنے وہ پی۔ڈبلیو۔ ڈی کے دفتر پہنچا اور اوورسیر منشا یاد کا ورک مستری ہو گیا۔ شام کو کام کا حساب دیتے ہوئے اسے خدا یاد آتا۔ فری تھنکنگ کام آ چکی تھی۔ تھکے ہارے رشید امجد کے سر کے بال موسمی پاروں کی طرح اڑنا شروع ہو گئے۔ پودی پتلی ہو چکی تھی۔ مٹی میں آٹی پودی کو لئے وہ ایک روز کیفیٹریا پہنچا۔ بیرا لپک کر آیا۔ بولا باؤ جی کتھے ہو۔ رشید امجد کی سٹی گم تھی۔ ایک عدد کڑک چائے کا آرڈر دیا اور چپ چاپ چائے پی کر بغیر ٹپ دیئے اٹھا۔ بیرے سے ہم کلام ہوئے بغیر باہر نکلا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی گھائل ہو گیا ہے۔ بیرا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے باہر تک آیا۔ جیہا باؤ جی مینوں رب دی قسم میں بخشش نہیں مانگتا۔ میں آپ کا استحصال نہیں کروں گا۔ آپ روز آیا کریں۔ میں چائے پلاؤں گا۔ میں تو روزانہ آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ آپ بڑی اچھی اور بہت پتے کی باتیں کرتے ہیں۔ جب رات کو اپنے دوستوں کو یہی باتیں بتاتا ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں مجھے عقل مند سمجھتے ہیں۔ مگر باؤ جی میں جانتا ہوں عقلمند کون ہے؟ آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا؟ آپ آتے کیوں نہیں۔ رشید امجد رکا۔ پل بھر کو سانس روک کر بولا۔ یار صاف بات یہ ہے۔ میرا مطلب ہے تم تو جانتے ہو، تم تو سب کچھ سمجھتے ہونا! میرے یار وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ میرا مطلب ہے وقت ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میرا وقت بدل گیا ہے۔ اب پھر بدلے گا تو ضرور آیا کروں گا۔ رشید امجد نے اپنی خالی جیب کو ٹٹولا۔ بولا یار صاف بات یہ ہے علم بڑی شے ہے۔ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ بیرہ نے لقمہ دیا۔ یہ روشنی ہے اور غربت اندھیرا ہے۔ بہت بڑا گہرا اندھیرا۔ باؤ جی مجھے سب یاد ہے۔ رشید امجد

ہلکا ہو چکا تھا۔ اس نے بیرے کے صافی والے کندھے کو تھپکی دی اور چل دیا۔ بیرے نے جلتے ہوئے رشید امجد کو پکارا۔ باؤجی ہمارا وقت کب بدلے گا؟ لیکن وہ گردن گرائے ڈولتا ہوا کالج کے گیٹ کے سامنے سے خاموش گزر گیا۔

رشید امجد کی سسکار چپ ہو چکی تھی اور وہ مور کے پائل پروں کی بجتی ہوئی شوشنکار کی مانند چارپائی پر پڑا اندھیری رات میں تاروں کو گن رہا تھا۔

کمال بات ہے رشید امجد! احساس محرومی تو جذبۂ تجسس کو جنم دیتا ہے۔ آپ کس طرف نکل گئے؟ بس ڈاکٹر صاحب اس کے بعد نو برس تک ورک مستری اور پھر جونیئر کلرک رہا۔ پنڈی کی ورک شاپ ۵۰۱ میں بھی رہا۔ پھر ایک روز ان لٹے ہوئے نو برس کی تلخئ ایام نے جھنجھوڑا اور یاد دلایا کہ ماں نے بڑی مشقت کی ہے۔ اور غربت سے بڑا عفریت پیدا نہیں ہوا۔ خیال آیا علم بڑی شے ہے —— پھر؟؟

پھر جناب ڈاکٹر صاحب میں نے ادیب فاضل پاس کر لیا۔ میرے لئے راستہ کھل گیا۔ ایف۔اے۔ ہوا، بی۔اے ہوا۔ اب رشید امجد انگریزی کے بھنور سے نکل چکا تھا۔ اردو فرفر بولتا اور پھوٹوہاری پنجابی کی فصیح زبان پر اپنی دسترس سے دنگ کر دیتا۔ وہ نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور جب اس نے گارڈن کالج میں ایم۔اے۔ اردو کی کلاس میں داخلہ لیا تو یہ انگریزی کا پاسٹ ٹنس بن چکا تھا۔ اب اسے انگریزی کا کوئی قاعدہ قانون یاد نہ تھا۔ اس کی نیکر اتر چکی تھی اور یہ ورنیکر میں رنگا جا چکا تھا۔

اس کے ہم جماعت سلطان رشک اور جاوید حکیم قریشی جیسے لائق، زیرک اور جہاندیدہ لوگ تھے اور مقابلہ میں لاہور سے انور سدید، امجد اسلام امجد اور اسلام آباد سے منشایاد جیسے چیدہ حضرات تھے۔ پوچھا کون سی ڈویژن آئی تھی۔ آنکھوں میں جھینپتی چمک کے ساتھ بولے۔ اوّل تھی۔ ڈاکٹر صاحب کیا عرض کروں۔ بس گولڈ میڈل ہاتھ چھوتا ہوا نکل گیا۔ انور سدید اوّل آئے تھے۔ گولڈ میڈل انھیں کے حصہ میں آیا۔ ورنہ ہم بھی آج پروفیسر فتح محمد ملک کی طرح گولڈ میڈلسٹ ہوتے! —— پھر؟؟

پھر کیا پوچھتے ہیں! جناب ہم لیکچرار بھرتی ہو گئے۔ سی۔بی۔ کالج واہ میں! وہ دن میری خوشی کی انتہا کا دن تھا۔ ہم قدرے آسودہ حال ہوئے تو والد محترم مجھے بہت یاد آئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی روح کی آواز میرے بند دروازے کے پیچھے سے آتی ہے۔ بہت دیر کی

زباں آتے آتے ۔ والد محترم کی موت میری زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے ۔ میں اپنے والد کے لیے خوشی کی کرن بن کر نہ پھوٹ سکا ۔ اور وہ ہم سب سے ، حالات سے روٹھ کر بے خبری میں گزر گئے ۔

جناب میں میں ہی ہوں ۔ میرا مطلب ہے میں ہی رشید امجد ہوں ۔ منکہ رشید امجد ! ایک غریب الدیار کشمیری ! بچپن میں سری نگر سے راولپنڈی آیا تھا ۔ حال سکنہ نانک پورہ ہوں ! کیا فرمایا آپ نے ؟ خوش ہوں ؟ جی بہت ! ۔۔۔ جی اپنی حالت بیان کروں ؟ جناب کیا بیان کروں ۔ میرا مطلب ہے کیسے بیان کروں ؟ تو جناب حالت خراب ہے ۔۔۔ نہیں نہیں میرا مطلب ہے شاید حالت خراب نہیں ہے ۔ سب اچھا ہے اور میں مظلوم کشمیری ہوں شاید میں مظلوم کشمیری نہیں ہوں یا شاید میں مظلوم ہوں اور کشمیری نہیں ہوں یا پھر میں کشمیری ہوں مظلوم نہیں ہوں ۔ جناب والا کوئی کشمیری مسکین نہیں ہوتا ۔ وہ صاحب دل و جگر ہوتا ہے جب دل دکھتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے ۔ نہیں جناب میں رو تو نہیں رہا یا شاید میں رو ہی رہا ہوں ۔ یہ پانی کے قطرے جو میرے زرد گالوں پر لڑھک رہے ہیں میری تقدیر کے پسینے کے موتی نہیں ہیں ، یہ تو میرے آنسو ہیں ۔ نہیں نہیں یہ کچھ بھی نہیں ۔ یہ موتی نہیں ہیں ۔ یہ آنسو بھی نہیں ہیں ۔ یہ تو ویسے ہی ہیں جیسے خواب میں بھیگے بدن پر بارش کی بوندیں گری ہوں ۔

لاحول ولا قوۃ ! جناب آپ مذاق فرما رہے ہیں ۔ حاشا و کلا میں اشتراکی نہیں ہوں ۔ میں ہرگز نہیں ہوں ۔ جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی ہے ۔ میرے اوپر ابھی چودہ طبق روشن نہیں ہوئے ہیں یا شاید پھر ہو چکے ہیں اور مجھے خبر نہیں ہوئی ۔ مینی فیسٹو ؟ جناب کیسا مینی فیسٹو ! ہم لوگ بغیر مینی فیسٹو قدم ملا کر علت لئے گھوم رہے ہیں ۔ حضور میں ترقی پسند بھی نہیں ہوں ۔ لیکن ٹھہریئے جناب یہ تو فرمایئے ترقی کے بغیر دنیا کیسے قائم ہے ؟ انسان کیسے زندہ رہ سکتا ہے یا شاید انسان ترقی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے ۔ ترقی کسے پسند نہیں ہے ؟ مجھے بھی پسند ہے ۔ نہ جانے میری ترقی کیوں رکی ہوئی ہے ۔ مجھے تو اسلام آباد میں پلاٹ بھی نہیں ملا ۔ میں بھی افسانہ نگار ہوں یا شاید میں بھی افسانہ نگار نہیں ہوں ۔

یہ درست ہے جناب ! آپ بجا فرماتے ہیں ۔ دیگر بے شمار دانشوروں اور اساتذہ کی طرح میں بھی نمک اپنے دیس کا کھاتا ہوں ۔ ویسے بھی مجھے نمک سے رغبت ہے ۔ پہاڑیئے

نمک بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے پہاڑوں میں نمک نہیں ہوتا صرف مٹی اور خواری ہوتی ہے۔
لہذا یہ لوگ اپنے پہاڑوں سے پیار کرتے ہیں اور ان کی مٹی کو ترستے رہتے ہیں۔ ایڑیاں تک
رگڑتے ہیں۔ جناب والا ہم سرکار والا تبار کے نمک خوار رہتے ہیں۔ جی آپ درست فرماتے ہیں۔
نمک حاکموں کی ہڈیوں سے نہیں کھیوڑہ کی کانوں سے نکلتا ہے۔ یا شائد پھر حاکموں کی ہڈیوں
سے ہی نکلتا ہے اور کھیوڑہ کے پہاڑوں سے نہیں نکلتا۔ یہ بات بھی معلوم ہے جناب کہ ہمارے
سمندر کے پانی سے نمک نکالا جاتا ہے جیسا کہ ہمارے پسینے سے بھی نمک نکلتا ہے لیکن جناب
آپ غور فرمائیں کھیوڑہ کی کانوں، سمندر کے پانی اور اپنے پسینے کے آپ نمکخوار کیسے ہو سکتے
ہیں؟ پہاڑ پہاڑ ہے، سمندر سمندر ہے اور پسینہ پسینہ ہے۔ نمک کھانے سے کیا ہوتا ہے؟
یہ نوکری تو نہیں دیتے۔ میرا مطلب ہے یہ وسیلہ روزگار تو نہیں ہیں نا۔ جناب آپ میرا مطلب
سمجھتے ہیں نا! نوکری تو سرکار دیتی ہے اور ہم حاکم کی چاکری پر مجبور ہیں۔ آپ چاکری کو سمجھتے
ہیں نا! جناب چاکری نہ ہو تو گھر کی رسوئی میں نمک نہیں پہنچ پاتا۔ میرا مطلب ہے جناب حق
کی بات یہی ہے۔ ہم لوگ تو بندہ بشر ہیں۔ ہم نمکخوار سرکار کے ہوتے ہیں اور ایمان کی بات ہے
حق بات ظالم اور جابر حاکم کے سامنے کہنے سے بھی نہیں جھجکنا چاہئے۔ دانش اسی میں ہے یا
شاید پھر دانش اس میں نہیں ہے! کیا کہا؟ جناب ٹھیک ہے۔ سرکار کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔
سرکاریں بدل جاتی ہیں۔ لیکن جناب کار سرکار کہاں بدلتا ہے؟ حاکم کا حکم اور نوکر کی چاکری
نہیں بدلتی۔ میرا مطلب ہے جناب ہم نہیں بدلتے۔ ہم سرکاری منہ کو نہیں دیکھتے۔ جس نے
ان کے منہ کو دیکھا اس نے منہ کی کھائی۔ ٹھیک ہے منہ آتے رہتے ہیں منہ جاتے رہتے ہیں۔
سورج کی کرنوں کی طرح جو کرن گزر گئی سو گزر گئی۔ جناب گزری ہوئی صبح کے پیچھے اندھیری
رات میں گم گشتہ کرنوں کے تعاقب میں بھاگنا باؤلوں کا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں، سب جانتے
ہیں جس پر سرکار خوش اس پر سارا دربار خوش، اس کا سارا گھر بار خوش۔ جناب وطن عزیز
میں اسی کو خوش حال گھرانا کہتے ہیں!

نہیں نہیں اسے بُرا مت کہئے۔ سرکار ہر حال میں اچھی ہوتی ہے۔ نوکری دیتی ہے۔
اچھوں کو برا کہنا اخلاق باختہ فعل ہے۔ اخلاق باختہ فعل کی گردان سے آپ پاس کیسے
ہوں گے؟ سرکار کبھی اچھی نہیں ہوتی؟ ایسا نہ کہئے جناب۔ ہم اچھے ہوں گے تو وہ خود بخود
بہت اچھی ہو جائے گی۔ جناب میرا مطلب ہے ہمارے منہ یعنی زبان سے صرف خیر کی دعائیں

اجرا ہوتی رہتی ہیں ۔ اپنی خیر منانا بہت بڑا کار خیر ہے ۔ سرکار کے لئے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو دست دعا بلند کرنا چاہئے ۔ جناب ہماری دعا ہے ایک مرتبہ آپ سرکار کو خوب سمجھیں بس پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ جناب کان ادھر لائیے ۔ ذرا اور قریب ! جناب آپ میرا مطلب سمجھتی ہیں نا ! کبھی وہی نا جو جب کہا تھا ! آپ پبلک میں اول فول نہ بکا کریں ۔ وطن عزیز کی وسیع منڈی میں کیا بھروسہ کون کس کا ہے ۔ کون جانے ؟ جناب ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم اپنے ہیں ! اس کے علاوہ خوف کی روا ہے ۔ ہر آدمی ، ہر بندہ بشر ڈرا ہوا ہے ۔ آسیب سے کون نہیں ڈرتا جناب !

جی آپ نے پھر مذاق فرمایا ! میں قادیانی ؟ نعوذ باللہ ! ان سے مطلب ؟ کیا پوچھا ؟ میرا فرقہ ؟ جناب دیکھئے میں فرقہ پرست نہیں ہوں ! کیا فرمایا سنی ؟ نہیں جی میں وہ کہاں ہوں ؟ شیعہ ؟ جناب والا قربان جاؤں شیعوں پر مگر واللہ میں شیعہ نہیں ہوں ۔ نا جی ، خارجی ؟ جی ہرگز نہیں ہوں ۔ دیوبندی ؟ جناب بس رہنے دیجئے بہت ہو چکی ! بالکل نہیں ہوں منصور حلاجی ؟ ہائے ! چہ نسبت خاک را با عالم پاک ! پھر تو آپ ضرور نظربندی ہوں گے ؟ جناب ادھر آئیے ۔ میری آنکھوں میں دیکھئے ۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں صرف نظریں ملا کر ! آپ کو کچھ نظر آیا ، کچھ نظر آیا جناب ؟ کیا فرمایا کیا فرمایا آپ نے ؟ قضا نظر آ رہی ہے ۔ دھند چھا رہی ہے ۔ سماں بوجھل ہو رہا ہے ۔ جی ہاں فضا دھندلائی ہوئی اور بوجھل ہے اور اب میری آنکھیں فضا کے بوجھ سے بند ہو رہی ہیں ۔ میں شل ہو گیا ہوں ، بہت تھک گیا ہوں ۔ جناب اب آپ مجھے سو جانے دیں ۔ میں خواب دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں ۔ ویسے بھی میرے سیاستہ کا وقت قریب آ پہنچا ہے ۔ خدا حافظ ! آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ۔ یا شاید خوشی نہیں ہوئی ہے ۔ یا پھر شاید تھوڑی سی خوشی ہوئی ہے اور تھوڑی سی نہیں ہوئی ! اب آپ چلے جائیں فوراً روانہ ہو جائیں ۔ جناب قدم جلدی اٹھائیں آگے بڑھائیں ۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے ۔ جائیے کہیں آپ کی نظربندی نہ ہو جائے ۔ ڈاکٹر صاحب آپ ذرا احتیاط سے چلا کریں ، میرا مطلب ہے رات کے پردے گر چکے ہیں ۔ گلی میں گہرا اندھیرا ہے ۔ جائیے اللہ آپ کا نگہبان ہو ۔ خدا حافظ ! رب راکھا !

کالج کی بے فکر آزاد فضا میں رشید امجد کی ہم جماعت چند چنچل پری جمال طالبات بھی تھیں ۔ ان کی تعداد زیادہ تھی لہذا مقابلہ کڑا نہ تھا ۔ اور رشید امجد انگلش چاکلیٹ

کلچر سے بھی مسلح تھا۔ ولایتی کلچر کی ٹافیوں نے اکثر اسے حسینوں کے جھرمٹ میں یوں داخل کروا دیا جیسے آج کل فوجی کالجوں میں حاضر سروس اور سابقہ فوجیوں کے بچوں کو بلا کاوش داخلہ مل جاتا ہے۔ وہ شامیں مے ارغوانی کے بغیر بھی رنگین تھیں۔ ایسے معطر لطیف ماحول میں یادیں جنم لیتی ہیں۔ پھر امتحان پاس ہوا۔ ساتھ ہی کالج کے صبح و شام، مباحثے، بحثیں، رقابتیں اور دل لگانے لگنے کی ساری دلفریب منافقتیں تمام ہوگئیں۔ تلاش روزگار کی سرسراہٹ اور نئی بادِ سموم میں دم گھٹنے لگا۔ ایم۔ اے۔ کی ڈگری ہاتھ میں لئے یوں رشید امجد ایوب خاں کے مارشل لا کے دور میں داخل ہوگیا — پھر؟؟

پھر جناب ڈاکٹر صاحب میرا پہلا افسانہ سنگم ہے۔ جب یہ افسانہ قرطاس ابیض پر منتقل ہوا تو مجھے ایسا لگا میرے جسم کے ایک انجانے، خفتہ اور بند دروازے کا قفل کھل گیا ہے۔ میں نے حلقہ میں اسے پڑھا۔ داد کی مجھے پرواہ نہ تھی۔ بس پھر کام چالو ہوگیا۔ جناب میں نے ایک زمانے میں روزانہ ایک افسانہ لکھا ہے۔

جی ہاں، ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ ایوب خان کا مارشل لا شباب پر تھا کہ ادبی افق پہ چند بے فکرے انوکھوں کی سعی ہوشیار و بیدار سے نئے پن (NEWNESS) نے جنم لیا۔ پاکستان کے ادبی آسمان پہ یہ انوکھی اڑن طشتریاں بے سمت اور دائیں بائیں سے لاپرواہ نمودار ہوئیں۔ حالات اور ان کے مضمرات سے یہ حضرات بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بقائے ذات اور اس کے فروغ کے دور میں مبتلا یہ نیا گروہ ہر کہنہ روش، امدپارینہ روایات کے پیچھے لٹھ لے کر جت گیا۔ اس نرالے گروہ کا طغرائی امتیاز تردید تھا۔ اچھی بری طبیعاتی۔ مابعد الطبیعاتی، نفسیاتی اور جدلی مادیت میں گندھی ہر بات، ہر مفروضے، ہر کلیئے کو رد کرنا ان کے نزدیک اس انوکھے ادبی چلن کا عنوان تھا۔ اپنی ذات کو سیاسی وابستگی اور اخلاقی و سماجی ذمہ داریوں سے مبرا قرار دے کر، غیر منسلک سیاسی و سماجی جدیدیت کے علمبردار اس گروہ نے دانستہ مارشل لا کے شکنجے کے اثرات و مضمرات سے چشم پوشی کی اور اپنے ماحول کے انتہائی ڈراؤنے غیر یقینی حالات میں اپنے گرد خود غرضی کے خول کا محفوظ حصار کھڑا کر لیا۔ ان دانشوروں اور ادبار کی پورے معاشرے اور زبوں حال قوم سے مکمل طور پہ لاتعلقی (ALIENNESS) سے دانشمند حکام وقت شناس اور صاحبانِ بست و کشاد بہت محظوظ ہوئے۔ خوش ہوئے۔ لہٰذا انہیں خوب کھل کھیلنے دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اور ایوبی آمرانہ دور میں ایسی

مہمل، غیر ادبیانہ، غیر فطری جدیدیت ۱۹۶۸ء تک ردّیت کا پھاوڑا لے کر وطن عزیز میں فعال، شعوری اور فطری وابستگی والے ادب کے لئے گہری، اندھی، بے نام قبریں کھودتی رہی۔ ایسی بے مروّت، کٹھور اور گمراہ کن جدیدیت کی کوکھ کون سے کوٹھے پر پھوٹی اس کا سراغ نہیں ملا۔ لیکن ان میں افتخار جالب اور ڈاکٹر انور سجاد جیسے مشاہیر ہراول دستوں میں تھے۔ انھوں نے یہ انوکھا علم خوب لہرایا اور اس میں خاصا نام پایا۔

ترقی پسندوں کو گالی دینا ردّیت کی شرطِ اوّل مقرر ہوئی۔ پھر انھیں بے سروپا بنانا ان علمبرداروں کے نزدیک اپنے محفوظ حصار کو مزید مستحکم بنانے کی قدر اوّلیٰ قرار پائی تھی۔ نان کومٹڈ (NON-COMMITTED) یہ ٹولہ ادب کی ہر صنف اور خیال کو رد کرنے میں باک محسوس نہ کرتا جو انسان کی خستگی، زبوں حالی اور بیچارگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہو۔ حق بات کو برملا کہنے کے بجائے اسے بنا ڈکار لئے پی جانا اور سچ کو ہضم کر جانا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ زندگی سے متعلق کسی بھی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہر تحریر کو ریزہ ریزہ کرنا، اس کے پرخچے اڑانا اور ردّ کرنا اس فرقۂ ادب میں جرأت مندانہ فعل تصور کیا جاتا تھا۔ دراصل یہ ان کی ذات کا دانشمندانہ عمل تھا۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اپنی اپنی ذات اور ضمیر کو اپنی ہی ذات کے خود غرض محل میں مقیّد و محفوظ کر چکے تھے ـــــ کہا رشید امجد ایسی آزادانہ بے راہ روی ہمارے ادب میں ہپّی ازم کے مترادف تھی۔ جناب یوں ہی سمجھ لیں۔ پھر شاعری میں مہمل استعارے استعمال ہونا شروع ہو گئے اور افسانے میں کہانی اور انسان دونوں ادبی ترقی کی شاہراہ پر کسی منزل پر پہنچنے کی بجائے مہملات کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ ان کرم فرماؤں نے گمراہی کا وہ کام کر دکھایا جو فرعون کو بھی نہ سوجھا تھا اور قاری ان کے نئے نیل کی گھمن گھیریوں میں گھر گیا ـــــ کنفیوز ہو گیا ـــــ پھر؟؟

جناب ڈاکٹر صاحب پھر ۱۹۶۸ء میں دورِ آمریت کے کرب سے لوگ بلبلا اٹھے۔ اور ان زیرک ہوشیار ہپّی ادیبوں کے باوصف ایک غلغلۂ مستانہ بلند ہوا۔ عوام جاگ اٹھے۔ ایک تحریک ابھری۔ ایسی تحریک ابھری کہ سب کچھ اتھل پتھل ہوتا نظر آنے لگا۔ اور بدلتے حالات کے ساتھ نیونیس (NEWNESS) کے ان دانشوروں نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ پرانا جامہ اتار پھینکا اور عوامیت کا خوبصورت لبادہ اوڑھ کر انھوں نے باہر جھانکا۔ ان کے خیمے سے آواز بلند ہوئی۔ استعاروں میں شاعری کرنا منافقت ہے اور اس فرقے کے متعدد

ادبا و شعرا اپنے طرفداروں سمیت آناً فاناً اس تحریک میں کود پڑے ۔ اب انھوں نے اپنے انوکھے علم سرنگوں کر دیئے اور نرالے چپو توڑ ڈالے ۔ ان میں سے متعدد ادبا و شعرا عوامی تحریک کے ریلے میں سرپٹ دوڑتے پائے گئے ۔ اب عوام سے ہٹ کر بقیہ سارا ادب ان کے نزدیک مہمل تھا ۔ پہیہ پورا گھوم چکا تھا ـــــ پھر ؟

پھر حالات نے ایک بار پھر الٹی کروٹ لی ۔ نیا مارشل لا آیا ۔ اور انھیں کے سرخیل کوٹ لکھپت جیل سے ہوتے ہوئے اپنے عاقبت اندیش یاروں کے طفیل مارشل لا کے ہیڈکوارٹر میں بیعت کرتے پائے گئے ۔ رشید امجد یہ تو ادبی دنیا میں خود غرضی سے سینچا ہوا لایعنی پودا تھا جس کی پیدائش خوف حرص اور قرب اقتدار کی خواہش کے واحد جرثومہ کی مرہونِ منت تھی ۔ یہ اسی آرزو کا کارنامہ تھا ۔ ڈاکٹر صاحب ! میرا مطلب ہے دیکھئے نا ! آپ سمجھتے ہیں یہ جو اس قسم کی نام نہاد ادبی تحریکیں ہیں ، یہ جو عمل اور ردعمل کا چکر ہے ، میرا مطلب ہے یہ جو لہر چلی تھی ، آپ جانتے ہیں نا ، یہ نیم پختہ اور خام تحریکیں جنھیں ادب کے نام پر آگے لایا گیا یا بڑھایا جاتا ہے ۔ وہ جناب میرا مطلب ہے سب فراڈ ہے ۔ یہ منافقت ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ محض فروعی قسم کے رجحانات ہیں ۔ لہذا ایسے رجحانات میں پلا ہوا ادیب آج ترقی پسندی کا جامہ زیب تن کر لیتا ہے تو کل چی گیویرا کا ، پھر انتہائی رجعتی حاکم وقت کے لئے مرصع صدارتی (کسی تقریب کے لئے) تقریر تحریر کرکے نئی ٹوپی اوڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ قاری اس کی دانائی سے نادان ہے ۔

ایسے میں یعنی ایسے دور میں میرا مطلب ہے انصاف کے حاجت مندوں اور انصاف پسندوں کے لئے بڑی گھٹن ہے ۔ جناب بڑا فریب بڑی گھٹن کو جنم دیتا ہے

رشید امجد کی زبان نانک پورہ کی گلیوں میں گنگ تھی ، اب بولے چلے جا رہا تھا اور میں اس کے ذہن کے خلیوں میں دفن کرب اور دل کے درد دکھ کے قریب ہونے کی لاحاصل کوشش میں مصروف تھا ۔ پوچھا رشید امجد جبر کی دنیا میں سخت جان ہائے ہی ذہن اور روح کو یک جان اور قائم رکھ سکتی ہے ۔ تمھارا علامتی افسانہ اور استعاراتی کاوشیں اور سارا ایسا ادب جبر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے ۔ عالم جبریت میں سیاسی ، سماجی اور اقتصادی دباؤ کے بوجھ سے پ ی فضا مضمحل ہو جاتی ہے ۔ ایسے دور میں ادیب لامحالہ یا تو جبر کی زد میں آکر اس دباؤ ئ ـ جاتا ہے اور دم سادھ لیتا ہے یا چپ رہنے کی جگہ وہ جابروں

کی ہمنوائی میں STATUS QUE کا رطب اللسان ہوجاتا ہے کیوں کہ اسی میں وہ اپنی سلامتی وعافیت تلاش کرتا اور پاتا ہے۔ایک مقولہ ہے IF YOU CAN NOT BEAT THEM, JOIN THEM یہ حضرات اس غلط اور لاغر مقولے کے پابند نظر آتے ہیں۔یہ کمزور، بزدل اور ناتواں انسانوں کی راہِ فرار ہے۔تیسرے چندے محدود دانشور ادبا، اور مفکرین خاموش رہنے کی بجائے جبر کی فضا میں سانس لیتے ہوئے تاثراتی اندازِ فکر میں تشبیہات اور استعارات کے رنگ و روغن سے اور کبھی کبھی تجریدی برش سے اپنے ادبی محل میں مینا کاری کرتے ہیں۔ نقش و نگارِ حیات نکھارنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ نقش و نگار قاری کی قوت ابلاغ سے بالا ہوں اور اسے سمجھنے میں دقت ہو۔مگر ان محلات میں بات تلاش کی جاسکتی ہے۔چوتھے ایسے دانشور بھی ہوتے ہیں جو چپ کا پیرہن آتار پھینکتے ہیں اور احتجاجی ادب تخلیق کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ یہ ایک نوعیت سے قلمی جہاد ہے۔جن کے نصیب میں یہ جہاد ودیعت ہوا ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ طاغوتی طاقتوں سے ٹکراؤ میں یہ اندیشۂ سود و زیاں سے گزر چکے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ کی بات برحق! لیکن میرے خیال میں روایت سے انحراف محض کسی فن پارے کو یا ادبی تخلیقی کاوش کو جدید نہیں بناتا۔یا روایت میں خالصتاً فنی تجربہ برائے تجربہ بھی جدید کے زمرے میں نہیں آتا۔ مجھے تو لفظ جدید کا بے مہارا استعمال ہی مشکوک نظر آتا ہے۔آپ جانتے ہیں بدلتے ہوئے زمانے کے نئے حالات میں نئے تقاضے جنم لیتے ہیں۔ رشید امجد تو پھر ان نئے تقاضوں کو نئے مفہوم کے پیرہن میں ابلاغ عامہ کے روبرو پیش کرنا بھی تو ادیب اور شاعر کی سماجی، اخلاقی اور تاریخی ذمہ داری ہے۔اس ذمہ داری سے چشم پوشی اور پہلوتہی کیسے برتی جاسکتی ہے؟

جی ہاں ڈاکٹر صاحب ذمہ داری تو ہے! میرا مطلب ہے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ہر سطح پر سماجی اور ثقافتی ادراک رکھنے والے باشعور دانشور، ادبا اور شعرا اپنے نئے محسوسات کی دنیا میں نئے تجربات کے سہارے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں اور زندگی کے نئے مطالب کو اظہار کے نئے قالب میں ڈھالتے رہتے ہیں تاکہ کسی انوکھے پن کی جریب سے ان کا روپ بگاڑتے جائیں۔ جدیدیت کا یہی مستحسن اور قابلِ فہم عمل اور رجحان ہے۔ جناب جدیدیت درحقیقت روایت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے

اور گذرے وقت کی لوریاں سنتے سنتے جوان ہوتی ہے ۔ یہ زندگی کے تسلسل کی ہی ایک کڑی ہے ۔ پوچھا اور جدید ترین ادب ؟ وہ کیا ہے ؟ رشید امجد نے آگے پیچھے نظر دوڑائی پھر بولا جناب یہ مجذوب کی بڑ ہے ۔ کہا رشید امجد ادب میں انوکھے نرالے لایعنی تجربات سے اجتناب برتنا بالغ نظری کی دلیل ہے ۔ کچے پکے تجربات اور عملیات سے عقل انسانی کو ضعف پہنچتا ہے ۔ تجربہ برائے تجربہ کے شوق میں سبقت لے جانے کی آرزو تضیع اوقات کے علاوہ آرزو کی رسوائی بھی تو ہے ۔ ڈاکٹر صاحب ہے ــ اور بالکل یہی بات ہے ۔

پوچھا سمبل ازم اور تجریدیت ؟ بولا جناب سمبل ازم کی امتیازی خاصیت یہ ہے کہ الفاظ کا ایسا استعمال ہو کہ مفہوم نہ صرف ذو معنی ہو بلکہ ہمہ جہت بھی ہو ۔ اور قاری جان جائے کہ معاملہ کیا ہے ؟ کیا بات ہو رہی ہے اور تجرید کے میدان میں الفاظ کی تصوراتی نشست و برخاست کچھ اس انداز سے ترتیب پاتی ہے کہ قاری اپنے تصور کے زور سے کہانی کی رو یا لہر کے قریب پہنچتا ہے ۔ پھر اسی لہر کے ساتھ ساتھ چل کر بات کو پاتا ہے ۔ تجرید میں سمبل کا سہارا نہیں لیا جاتا ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی فن پارے میں سمبل ازم اور تجریدیت شانہ بشانہ اپنے اپنے جوہر دکھا رہی ہوں ۔ اردو ادب میں ایسے افسانے موجود ہیں ۔ جناب بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قاری تجریدی تحریر کی لکیروں میں ہاتھ پاؤں مارتا گم ہو جاتا ہے ۔ کہانی یا تحریر کا مفہوم اس کے پلے نہیں پڑتا ۔ اس کے سر سے گزر جاتا ہے ۔ ظاہر ہے سمبل ازم کی نسبت تجریدی کہانی دقت آمیز ہوتی ہے اور خاصی ذہنی مشقت کے بعد سمجھ آتی ہیں ۔ جی کیا فرمایا یہ کسی تحریک کی نمائندگی کرتی ہیں ؟ ہرگز نہیں ! جناب والا اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک رجحان کی سی ہے ۔ تحریک کسی نظریئے یا مخصوص مسلک کے ادب کو کہا جا سکتا ہے ۔ بلاحق تجریدی قسم کی تحریروں کو تحریک کا درجہ دینا جائز نہیں ہے ۔ ادب کے دریا میں یہ ایک موج کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ان میں پرانی چٹانوں سے ٹکرانے کی کتنی سکت ہے ، ان کی افادیت اور مقصدیت کا فیصلہ وقت کرے گا ۔ ان کا مستقبل کیا ہے اس کا فیصلہ بھی مستقبل ہی کرے گا ۔ وقت بہت بڑا جج ہے ۔

کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز کے مصداق لوگ باگ ذاتی گروہ بندی ، نظریاتی گروہ بندی ، سیاسی جماعتیں وغیرہ وغیرہ غالباً اسی مقولے کی رو میں بناتے ہیں ۔ رشید امجد گروہ بندی کا قائل ہے لیکن اس کے گروہ میں یکساں نظریات و احساسات ، حسیات اور

سیاست کو چنداں دخل نہیں ہے، محض دلبستگی کا معاملہ لگتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ اس کے ہاں اکثر ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں۔ یا تو یہ از خود زاغوں کے تصرف میں ہے یا پھر ہنس کی چال چلتے چلتے ڈولنے لگتا ہے۔ اب اس کی اپنی جنس مشکوک ہوگئی ہے۔

اس کے اکثر ہم جنسوں کی پرواز میں مطلق کوتاہی نہیں آتی اور باد مخالف کی تندی انھیں اونچی چٹانوں پر بٹھادیتی ہے۔ انھیں بدترین قحط سالی میں بھی رزق کی مار نہیں پڑتی۔ سوائے اعجاز راہی کے! وہ اپنے راستہ کے اعجاز کا شکار ہے۔ وہ مار کھاتا ہے اور ہاتھ پاؤں مارنے سے باز نہیں آتا۔ ویسے بھی وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بیقرار چیتے کی طرح شکار کی جستجو میں رہتا ہے۔ شکست کی اسے پرواہ نہیں، غم نہیں ہے۔ ولولہ جانانہ اور غوغائے دلبرانہ کا بھرا فتراک کاندھے پر لٹکائے غم روزگار سے لاچار و آزردہ وہ اسلام آباد سے پشاور تک کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ یہ رشید امجد کا پچیس برس پرانا یار ہے!

لحنِ داؤدی سے آزاد، فقیہہ شہر کی طرح اشتعال دلانے میں یکتائے روزگار، ہمہ وقت اندھی چوکھی چلانے والا سیانا، جو گزند سے پرہیز کرتا ہے، یاروں کا بیمار ساز اور اغیار کا بیمار دار ہر کسی کا دم ساز ــــ رشید امجد کا ۱۴ سال پرانا یار ہے۔

اس کا یار منظر الاسلام جو اکثر رشید امجد کے ساتھ لاہور شہر میں گھوڑے بیچنے خوشی خوشی جایا کرتا تھا، اب اپنے گھوڑے بیچ کر اسلام آباد ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کی رکھ میں پناہ گزیں ہے اور چڑھتے سورج کی کرن اولیں کے ساتھ ہی ورد کرتا ہے۔ سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت! اب اسے سائیس کی حاجت نہیں رہی ہے۔ فی زمانہ دانا دنکا کی تلاش اور اس کا پیار گھوڑوں کی جستجو اور فروخت سے زیادہ قسمت آزما ہے۔ طالع رقیب کی اسے پرواہ نہیں۔ لیکن اگر وہ زیادہ چمکنے لگے تو تلملا کر زیادہ دمکنے کی حسرت میں ماند پڑ جاتا ہے۔ شاہسواروں کی رکاب میں پاؤں ڈالنا قسمت کو انگاروں بھری قبر میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اور منظر الاسلام جینا چاہتا ہے اور درازیٔ عمر کے لئے اپنے خضر راہ شورش کا عصا تھا راہ وراہِ خاموش چلے چلا جارہا ہے۔ یہ رشید امجد کا بیس سال پرانا بچھڑا یار ہے۔

اور پھر نشا یاد اس کا پرانا اوورسیئر، جیسے سی۔ڈی۔اے۔ کی سلطنت کے عیش میں یاد رشید امجد نہ رہی اور اسلام آباد کا پلاٹ اس سے منہ موڑ گیا۔

اور پھر سمیع آہوجہ اپنے جنم میں کے ساتھ اور شبنم مناروی ــ مشتے از خروارے ہیں۔

یہ سب فضل والے علم و دانش کی پری سے سلوک سیف الملوک کرنے والے شہزادے کوہ قاف کے جغرافیے میں گرم جھیل کے اردگرد تیر و تفنگ لیے بھٹک رہے ہیں۔

ان بھانت بھانت کے لوگوں میں رشید امجد دائیں بائیں ٹہلتا رہتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ذی تھنکنگ کے دائرے میں فریڈم آف تھاٹ کا قائل ہے۔ وہ حدود و قیود سے نفرت کرتا ہے۔ حد نظر تک لبرل باؤنڈری کے اندر ہر مقام اس کا منظور نظر ہے۔

ایک دن میں پریشان تھا۔ رشید امجد نے پوچھا۔ نصیب دشمناں طبیعت تو برقرار اور بحال ہے؟ کہا رشید امجد دشمن موجاں مار دے نیں۔ یہاں خرچا پورا نہیں ہوتا۔ گذارہ نہیں ہوتا۔ مہنگائی قحط کی حدود کو چھو رہی ہے۔ مسکرا کر بولا ڈاکٹر صاحب آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ بازار میں جتنے دام بڑھتے ہیں آپ لوگ اتنے ہی مریض سے وصول کر لیتے ہیں۔ مارے تو ہم لوگ گئے۔ ہم جیسوں کا تو بھرتہ ہو گیا ہے۔ تنخواہ دار کدھر جائیں۔ گذارہ دشوار ہو گیا ہے۔ احتیاج کا یارا نہیں۔ نوکری زد میں آتی ہے۔ میرا مطلب ہے تنخواہ بڑھنے کی امید نہیں ٹیوشن ہم نہیں کرتے۔ یہ جانے دیں کہ کیوں نہیں کرتے۔ جناب ٹیوشن۔ میرا مطلب ہے ٹیوشن اچھی چیز نہیں۔ نہ طالب علم کے لئے نہ استاد کے لئے یہ مناسب اور موزوں ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ سب مارے گئے۔ انتہا درجہ کی گرانی ہے۔

گرانی سے بات فراوانی کی طرف سرک گئی۔ بولے ہمارے وطن میں آج کل دو چیزوں کی فراوانی ہے۔ پوچھا کون سی دو اشیا کی فراوانی ہے؟ بولے جناب گرانی طبع اور منافقت کی! گرانی پر قابو پانا آسان نہیں۔ یہ وہ جن ہے جس پر کوڑے، جرمانے اور زندان خانے فیل ہو چکے ہیں۔ یہاں مارشل لا عاجز ہے۔ وہ ہر شے پر قابو پا سکتا ہے لیکن گرانی کی ضرب سے چت پڑا عوام کی طرف ٹر ٹر دیکھ رہا ہے۔ اور عوام نڈھال مارشل لا کو دیکھ رہے ہیں۔ دونوں شل ہیں۔

اور جناب منافقت معاشرے کی شاہ رگ سے گزرتی ہوئی وطن عزیز کے جسم کی باریک ترین رگوں میں سرایت کر گئی ہے۔ اس کے سدباب کی جستجو ہے نہ تلاش۔ نہ فلک تک حل کہیں نظر آتا ہے۔ اور رشید امجد منافقت کے سائے میں پلنے والی معصوم نئی جنریشن سے خوف کھاتا ہے۔ کہتا ہے ڈاکٹر صاحب معصوم جنریشن خونخوار

ہو جائے گی ۔ یہ انسان کا گوشت کھانا شروع کر دے گی ۔ ہائے ربّا میرے !

کہا رشید امجد اب تو بھاؤ پوچھتے ہوئے ڈوبتے سورج کی شفق کے موافق رنگ زرد پڑ جاتا ہے ۔ یہاں عزتِ نفس کے علاوہ ہر چیز بڑھ رہی ہے اور ہر طرف سے بے بھاؤ کی برس رہی ہیں ۔ ڈر ہے عزتِ نفس اور پاکیزگی اور ذہنی سہارت لٹ نہ جائے ۔ غلاظت اور تعفن کے گھیرے میں وضو قائم رکھنا شیوۂ پیغمبری ہے ۔ رشید امجد قریب آیا ۔ ہستہ سے بولا ڈاکٹر صاحب بھلائی اسی میں ہے وہ کم تولیں اور ہم کم بولیں ۔

اور میں فکر میں ہوں کہ منافقت کی اس گرم بازاری میں صدق وصفا والے دلوں کو ہمہ وقت ریا کی تپتی سلاخوں سے داغا جاتا ہے ۔ آئین شہر یار ماری ہے ۔ سلوک کی طریقت تپیدہ ذہنوں پر دغا کے تپتے تیل کا چھڑکاؤ کرتی ہے ۔ جہاں ہر وقت بات بنائی جاتی ہے اور معاملہ فہمی کی صفت معاملہ بندی سے انصاف ، شرافت اور ایمان سے پہلو بچاتی ، پتے جھاڑتی نوسربازی کی دہلیز پار کر جائے ۔ جہاں جہانِ نو کی تعمیر کے معماروں کے لئے زنگی بوسیدہ کدالیں لئے آدم نو کے لئے قبریں کھود رہے ہوں جھوٹ کا دیدار عام ہو اور سچ بغل میں منہ چھپائے ناموس کے بچے کھچے سانسوں کے طفیل زندہ ہو ۔ وہاں میں فکر میں ہوں ۔ فکر ہے کہ ہم مکمل طور پر لٹ نہ جائیں ۔ اور رشید امجد کے چہرے پر قبل از وقت گہری جھریاں ابھر آئی ہیں ۔ تفکر اور مدبر کے عصا پر گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے ۔

منافقت کی محیر العقول داستانیں سناتے ہوئے رشید امجد رکا پھر بولا ڈاکٹر صاحب دم گھٹتا ہے ۔ کہا رشید امجد پوری تانی بگڑ چکی ہے اور بگڑی ہوئی تانی کی کوئی تند اسے سلجھا نہیں سکتی ۔ بیشک بیکار ہے ۔ جب سارا معاشرہ ناسور بن جائے اور اس میں کیڑے کلبلا رہے ہوں تو اینٹی بائیوٹک کی سٹیج گذر چکی ہوتی ہے اور جب گناہ اس قدر پھیل جائے بڑھ جائے اور اسے گناہ تصور کرنے والے گناہ گار ٹھہرائے جائیں اور گناہوں میں نہائے ہوئے منافقین معتبر ٹھہریں تو پھر آپریشن ضروری ہو جاتا ہے ۔ پھر اتھل پتھل ــــ رشید امجد تلملایا ــــ بولا ڈاکٹر صاحب بس بس ، سننے کی تاب نہیں ہے ۔ رہنے دیں ایسی باتوں کو ــــ شام اتر چکی ہے ۔ یہ معاشرہ شاید ٹھیک ہو جائے گا ، یا پھر شاید ٹھیک نہیں ہوگا ۔ مہنگائی کی آندھی گزر جائے گی یا پھر شاید نہیں گزرے گی ۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب آج یہ ا

استہ تو تباہ ہو ہی چکا ہے۔ اب گھر چلتا ہوں۔ رخسانہ سرگراں ہوگی۔ یا شاید رخسانہ سرگرا
یں ہوگی۔ سعدیا کی گڑیا بہت مہنگی تھی۔ حُسن کا ناچنے والا بندر آسمان سے باتیں کر رہا
ما۔ میں دونوں نہیں خرید سکا۔ صرف ننھے حسین کے لئے مصنوعی شہد والی چوسنی لی ہے۔
سانہ مجھ پر ضرور گرم ہوگی یا شاید پھر نہیں ہوگی۔ اگر گرم ہوگی تو کہہ دوں گا یہ چیزیں بازار
ے غائب ہیں۔ صرف چوسنیاں ہیں۔ وہ مجھے جانتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں اس کا خاوند
دں۔ ملت کی بیویاں کہاں بولتی ہیں۔ اچھا جناب میں چلا۔ خدا سب کا نگہبان ہو۔ □

رشید امجد
۱۸۵۔اے، نانک پورہ
راولپنڈی، پاکستان

سہ پہر کا مکالمہ

صبح سے پہلے بیوی نے دیکھا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔
کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہ باتھ روم میں نہ ہو، اس نے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا، دوبارہ ایک ایک کمرہ دیکھا پھر بڑے بیٹے کو جگایا۔

"کیا بات ہے؟" بڑا بیٹا ہڑبڑا کر اٹھا۔

"تمھارے ابو" آواز رندھ گئی۔

"کیا ہوا ـــ کیا ہوا؟" بیٹا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"تمھارے ابو ـــ گھر میں نہیں ہیں۔"

بڑے بیٹے نے بے یقینی اور جھنجھلاہٹ سے اس کی طرف دیکھا ـــ "کیا مطلب؟"

"میں نے ایک ایک کمرہ دیکھ لیا ہے، وہ کہیں نہیں ہیں۔"

گفتگو سن کر بیٹی بھی اٹھ گئی ـــ "تو پھر کہاں ہیں؟"

"باہر والا دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔" اب آنسو رو کے نہیں رکتے۔

چند لمحے عجیب پُراسرار سکوت۔

پھر وہ سب اپنے بستروں سے نکل کر اسے تلاش کرتے ہیں۔ باتھ روم میں سوتے کے کمروں میں، ڈرائنگ روم میں، باورچی خانے میں اسٹور میں۔

بڑا بیٹا کہتا ہے ـــ "کہیں صبح سویرے باہر نہ نکل گئے ہوں۔"

ماں جھنجھلا کر کہتی ہے "لیکن دروازہ اندر سے بند ہے۔"

چھوٹا بیٹا چند لمحے سوچتا رہتا ہے ـــ "کیا معلوم رات ہی کو گھر نہ آئے ہوں۔"

بیٹی نفی میں سر ہلاتی ہے "میں نے خود دروازہ کھولا تھا، جب انھوں نے گھنٹی

بجائی تھی۔"

چھوٹا بیٹا اسے گھورتا ہے "تم تو ہر وقت اپنے ہی خیالوں میں رہتی ہو، کیا پتہ وہ باہر ہی رہ گئے ہوں اور تم نے دروازہ بند کر لیا ہو۔ یا وہ گھنٹی ہی بجاتے رہے ہوں اور تم نے دروازہ کھولا ہی نہ ہو۔"

بیٹی غصّے سے اسے دیکھتی ہے "تم تو ہر وقت میرے ہی پیچھے پڑے رہتے ہو۔"

ماں بستر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔"رات کو وہ یہاں سوئے تھے۔"

بڑا بیٹا مشکوک نظروں سے ماں کی طرف دیکھتا ہے ۔۔۔ "کیا معلوم؟"

چھوٹا بیٹا کہتا ہے "مجھے ساری رات باہر کھڑکھڑ سنائی دیتی رہی ہے، میرا خیال ہے وہی ہوں گے، وہ ضرور رات کو باہر ہی رہ گئے ہیں۔"

"کیا معلوم وہ گھر ہی میں کہیں ہوں؟" ماں بڑبڑاتی ہے۔

وہ پھر اسے تلاش کرنے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔

ایک ایک کمرہ دیکھتے ہیں۔

"رات کو انھیں کھانا کس نے دیا تھا؟" بڑا بیٹا ماں اور بہن کی طرف دیکھ کر سوال کرتا ہے۔

ماں کو یاد آتا ہے اس نے انھیں کھانا دیا تھا، پھر یاد آتا ہے شاید اس نے نہیں دیا تھا۔

بیٹی کو یاد آتا ہے شاید اس نے ۔۔۔ یا شاید اس نے نہیں۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ رہتی ہیں۔

"سوال ہے اب انھیں کہاں تلاش کیا جائے؟" بڑبڑاتا ہے۔

"کیوں نہ ان کے سارے دوستوں کے گھر فون کیا جائے۔ شاید دیر ہونے کی وجہ سے کہیں رک گئے ہوں۔" چھوٹا بیٹا رائے دیتا ہے۔

بیٹی جھنجھلا کر کہتی ہے "میں نے خود دروازہ کھولا تھا۔ وہ رات گھر آئے تھے۔ کیوں امّی؟"

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا ہے وہ آئے تھے۔ اس نے ان کے لئے کھانا گرم کیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر کتاب۔ کبھی خیال آتا ہے

وہ آئے ہی نہیں۔ وہ ساری رات انتظار اوڑھ کر ان کی راہ تکتی رہی ہے۔

"کیوں امّی؟"

"لیکن فون کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"دروازہ اندر سے بند ہے۔" بڑا بیٹا بڑبڑاتا ہے۔ "اس کا مطلب ہے وہ آئے ہی نہیں، اور اگر آئے ہیں تو پھر کہیں گئے نہیں۔"

تو پھر کہاں؟

وہ پھر اسے تلاش کرنے کے لئے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔

ایک ایک کمرہ، ایک ایک کونا، ایک ایک الماری۔

"میرا خیال ہے وہ رات کو آئے ہی نہیں۔" بڑا بیٹا صوفے میں گرتے ہوئے مایوسی سے کہتا ہے۔ "امّی آپ بتائیں نا!"

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا ہے اس نے کھانا گرم ــــ کبھی نہیں، ساری رات انتظار

"مجھے کچھ پتا نہیں، کچھ معلوم نہیں۔" وہ روہانسی ہو جاتی ہے۔

بیٹی آگے بڑھ کر اسے سنبھالتی ہے۔

چھوٹا بیٹا فون کی طرف چلا جاتا ہے۔

بڑا بیٹا کہتا ہے ــــ میں ذرا باہر تو دیکھ لوں، کہیں وہ ابھی تک دروازے پر ہی نہ کھڑے ہوں۔ وہ باہر جاتا ہے پھر اندر آکر مایوسی سے سر ہلاتا ہے۔

ماں اب رونے لگتی ہے ــــ وہ کبھی رات کو باہر نہیں رہے، یہ پہلی رات ہے۔"

"خالی بستر پر شکنیں ہیں بھی اور نہیں بھی۔"

وہ رات کو سوئے تھے یا شاید نہیں۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹا بیٹا منہ لٹکائے آتا ہے۔ "وہ کسی دوست کے یہاں بھی نہیں۔"

"تو پھر کہاں گئے؟" اب بیٹی کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے ہیں۔ کہیں میں نے واقعی انھیں باہر چھوڑ کر دروازہ بند نہ کر لیا ہو؟ کبھی یاد آتا ہے وہ آئے تھے گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھولا تھا۔ انھوں نے اسے پیار کیا تھا پھر اس کے پاس

سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ کبھی یاد آتا گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔ گھنٹی بار بار بجی رہی تھی مگر اس نے ؟"

" نہیں نہیں وہ اندر آئے تھے، وہ اندر آئے تھے، وہ ہزیانی انداز میں چیختی ہے۔" وہ اندر نہیں آئے تھے ــــ نہیں ــــ نہیں۔"

ماں اور بڑا بیٹا اسے شانوں سے پکڑ کر صوفے پر دھکیل دیتے ہیں۔

چھوٹا بیٹا بڑبڑاتا ہے۔" وہ آئے ہی نہیں۔ اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا ہوگا۔"

بڑا بیٹا اسے ڈانٹتا ہے۔" تم چپ رہو۔"

خود وہ رات گئے تک ناول پڑھتا رہا تھا۔ کبھی یاد آتا کہ گھنٹی کی آواز آئی تھی اور کسی نے دروازہ کھولا تھا اور کوئی اندر آیا تھا۔ کبھی یاد آتا ہے کہ گھنٹی بجی ہی نہیں۔ چھوٹا بیٹا اصرار کئے جاتا ہے " رات کو کوئی ضرور باہر تھا، ساری رات کھڑ کھڑ ہوتی رہی ہے۔"

اسے کبھی یاد آتا ہے کہ ساری رات کوئی دیواروں کھڑکیوں اور دروازوں پر دستک دیتا رہا ہے۔ کبھی یاد آتا ہے کہ وہ ساری رات مزے سے سویا رہا ہے، ذرا بھی آواز نہیں آئی۔

" تو وہ گھر کے اندر بھی نہیں باہر بھی نہیں۔" ماں افسوس سے سر ہلاتی ہے۔

دنوں، سالوں اور مہینوں کے کئی بند تھان خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ رنگ برنگی کھٹی میٹھی تصویریں، ذائقے، کڑواہٹیں، مٹھاسیں، دکھ سکھ کے کئی لمبے سال سمٹ کر سوئی کے ناکے میں سما جاتے ہیں۔

" تو وہ نہیں ہیں۔" وہ چیخ مار کر بیٹی سے لپٹ جاتی ہے۔

دروازہ اندر سے بند ہے، یا شاید نہیں ہے۔

کسی نے دروازہ کھولا، شاید نہیں کھولا۔

وہ ساری رات باہر ہی کھڑے رہے یا اندر آگئے۔

شاید، یا شاید نہیں۔

وہ سارے ڈرائنگ روم میں صوفوں میں دھنسے اپنے اپنے جنم کو سمیٹ رہے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ بس کبھی سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اور دوسرے

ہی لمبے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اپنے اپنے صوفوں میں دبک جاتے ہیں۔

ایک عجیب پراسرار خاموشی۔

اور ان سب سے الگ وہ ۔۔۔ جیسے یہ سارے تلاش کر رہے ہیں، لکھنے کی میز پر بیٹھا سر جھکائے کتاب پڑھے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر ان کی بوکھلاہٹیں، اداس چہرے اور مایوس باتیں سنتا ہے اور پھر سر جھکا کر پڑھنے لگتا ہے۔

یہ کہانیاں بھی کمبخت عجیب ہوتی ہیں، کبھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں اور کبھی شروع ہو کر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ □

ساقی فاروقی
لندن

غزل

جو میرے دل میں ہے وہ آگ ماہتاب میں ہے
یہ نور کار سیہ خانۂ حجاب میں ہے
جو ایک روز میرے آنسوؤں میں گونجے گی
یہ خامشی اسی آواز کے حساب میں ہے
وہ آنکھ اٹھے گی تو یہ دل بھی کروٹیں لے گا
یہ آفتاب ابھی عرصۂ عذاب میں ہے
جو چل رہا ہے اسے پانیوں پہ چلنے دو
کہ روحِ آب بھی خیمۂ حباب میں ہے

منظور ہاشمی
نور منزل، دودھ پور، علی گڑھ

غزلیں

خواب ایسے نہ کسی کے ڈھل جائیں
نیند کے نام سے آنکھیں کھُل جائیں
اب تو دیوار کو حیرانی دے
آج تو دھوپ میں سائے گھُل جائیں
خوں مگر رنگ کہاں لاتا ہے ؟
جان دینے پہ تو ہم بھی تل جائیں !
اب ہوا ہے، نہ کناروں کی خبر
بادباں کس کے لئے کھُل جائیں ؟
اور پھیلے گی لہو کی خوشبو !
داغ دامن کے اگر دھل جائیں !
لفظ ہونٹوں پہ پھیلنے لگتے ہیں
سچ کی میزان میں کیسے تل جائیں

اداس آنکھوں کو جب سے زباں بنایا ہے
خموشیوں کو بھی ہم نے بیاں بنایا ہے
اک اور دل بھی دھڑکتا ہے اسکے سینے میں
عجیب سلسلۂ ربطِ جاں بنایا ہے
بس ایک نام تھا جو بار بار لیتا تھا
بس اتنی بات کو اک داستاں بنایا ہے
ہماری پیاس بھی بادل کی سمت دیکھتی ہے
اسی تصور نے صحرا بجاں بنایا ہے
یہ طول و عرض زمیں صرف آشیاں بھر ہے
اڑان بھر ہی فقط آسماں بنایا ہے
ہمیں خبر ہی نہیں ہے کہ کس لئے ہم نے
لہو کو آگ بدن کو دھواں بنایا ہے

عتیق احمد

195/R بلاک نمبر ۱۵
دستگیر سوسائٹی، کراچی، پاکستان

آگ کا دریا ——— ایک تجزیاتی مطالعہ

یہ تو خیر آج کی جدیدیت پسند نسل کی اپنی پسند کی بات ہے کہ اس نے زمین و زماں کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کا حل کر کے گارڈ، کافکا، ہیگرڈ، کامیو اور سارتر کی "خردبین" قسم کی ذاتوں کی خانہ تلاشی کے سپرد کر کے ساری سماجی ذمہ داریوں سے دامن چھڑا بیٹھی ہے۔ البتہ تخلیقی ادب اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صف سے اپنے پیش رووں کی تضحیک اور ان کے اخراج کا کام بڑی ذمہ داری کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ عالمی ادب اور خود اردو ادب میں بھی (حالی کے بعد بالخصوص) ایسے دور آتے رہے ہیں کہ ایک مخصوص طرزِ فکر یا اندازِ نگارش نے زور باندھا، مگر ان دنوں یہ جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنے پیش رووں کو پڑھنا ترک کر دیا ہو، اور محض من گھڑت یا خیالی باتوں پر ان کی تحریروں کو رد کر دینا شعار بنا لیا ہو۔

اب سے پندرہ بیس برس پہلے کے حوالے سے بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ کسی لکھنے والے کو اس کے ہم عصروں نے بالکل ہی اپنی صفوں سے خارج کر دیا ہو، لیکن یہ عمل بھی کسی خلائی یا خیالی بات کا ردِعمل نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً منٹو اور حسن عسکری کے خلاف ترقی پسند ادیبوں کا ردِعمل نظریاتی اختلاف کی بنا پر تھا۔ اس فیصلے کے خلاف بھی ایک ردِعمل ہوا، جس کی اپنی وجوہات تھیں (اسلامی ادب کا نعرہ) جدیدیت پسند نسل کے حوالے سے جو بات ابھی کہی گئی ہے اس کا آغاز تو نہیں البتہ پہلا چھینٹا ۱۹۶۰ء میں پڑا اس کا تعلق جدیدیت پسندی سے یوں ضرور تھا کہ، معاشرہ کو نظرانداز کر کے محض اور خالص "ادبی تجربے" کی ابتدا ان ہی دنوں ہو رہی تھی۔ ۱۹۶۰ء کے اشارہ سے دوسری بات قرۃ العین حیدر کی پاکستان سے بھارت کو مراجعت کے واقعہ کی یاد دہانی کرانا بھی مقصود ہے۔

اس واقعہ کے پس منظر میں ان کا ناول "آگ کا دریا" تھا۔ ان پر فتویٰ لگایا گیا تھا کہ پاکستان میں بیٹھ کر انھوں نے پاکستان کے قیام اور وجود کی مخالفت اور نفی کی تھی۔ خیر یہ تو ایک سیاسی مسئلہ تھا، اپنی جگہ صحیح تھا یا غلط اب یہ بحث بیکار ہے کہ اب نہ قرۃ العین حیدر ہمارے یہاں ہیں اور نہ

ان کا ناول پڑھنے والے قاری رہے، اب تو سب ادیب ہوگئے ہیں، اور شاید دوسروں کی تحریر پڑھنا ادبی منصب کی توہین قرار پاگئی ہے۔

اس طویل تمہید پر کسی معذرت کی اس لئے گنجائش نہیں ہے کہ اپنی سرزمین کے ادیبوں (اور بالخصوص اپنے پیش رووں کا لکھا ہوا نہ پڑھنا آج ہمارے یہاں " وجودیت پسندی" کا لازمہ قرار پا گیا ہے۔ اشارتاً عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بن بادل کی برسات کا پہلا چھینٹا بھی ان ہی دنوں پڑا تھا جب "آگ کا دریا" کی مصنفہ کے خلاف پاکستان سے اخراج کی فضا تیار کی جارہی تھی۔ تب بھی یہی حیرت تھی کہ اس ناول کو سمجھے بغیر یہ سب واویلا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا سچ بولنا ہمارے یہاں ہمیشہ ہی ممنوع رہے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے آخری حصے میں بہت بے باکانہ سچ بولی دیا ہے۔ مثلاً اس میں مشرقی پاکستان (حالیہ بانگلادیش) والوں کے ساتھ مغربی پاکستان (حالیہ پاکستان) کے افسروں، دفتری کارکنوں، تجارت پیشہ افراد اور یہاں سے وہاں جانے والوں کا سلوک اور رویہ بڑا اہتک آمیز بیان کیا گیا تھا، اور اس کے ردعمل کے طور پر ان دنوں کے مشرقی پاکستان میں اس طرف کے لوگوں کے خلاف غم و نفرت اور دبی گھٹی علیحدگی پسندی کی ننھی ننھی سلگتی چنگاریوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ "آگ کا دریا" ۱۹۵۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔ اس وقت پاکستان کو وجود میں آئے صرف گیارہ برس ہوئے تھے۔ ۱۹۷۰ء تک اس ناول کو چھپے ہوئے مزید گیارہ برس گزرے۔ اور صرف گیارہ برس بعد (یعنی ۱۹۷۰ء) میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اب اس سوال کا کون جواب دے گا کہ ۱۹۷۰ء سے گیارہ برس پہلے اگر ایک لکھنے والی نے اس نو تعمیر عمارت کی دیواروں میں پڑتی ہوئی دراڑوں کو دیکھ کر اس کے کیئر ٹیکرز کو بتا دینا چاہا تھا تو اس نے کون سا گناہ کر دیا تھا؟

اس ہی طرح سے ان دنوں کی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی دس گیارہ برس طویل فضا کو دیکھتے ہوئے اگر اس ناول کا کردار (کمال) اپنی چچازاد بہن (چمپا احمد) کو یہ لکھ دیتا ہے کہ یہاں (یعنی مغربی پاکستان میں) اکثریت میں لوگ محض جائیدادیں بنانے، روپیہ کمانے، راتوں رات لکھپتی بن جانے کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاسی ابتری اور انتظامی نااہلی کے سبب یہاں کے " سیاسی بصیرت رکھنے والے لوگ " اب اس ملک کی حاکمیت کے لئے فوج سے توقعات وابستہ کرنے لگے ہیں، تو بتائیے کہ اس میں پاکستان کے وجود کو کیا خطرہ لاحق ہوگیا تھا؟ (آخر ۱۹۵۸ء میں ان " سیاسی بصیرت والوں " کی توقعات پوری ہوئیں یا نہیں؟)

"آگ کا دریا" میں ان دو مخصوص نکات کا حوالہ صرف اس ہی لئے نہیں دیا گیا کہ سیاسی اعتبار سے ایوب خاں کے دور کے "خالص پاکستانی" دانشوروں کو (موقع محل دیکھ کر یہ سب ہی دانشور آج کل بڑے صوفی اور اللہ والے بنے ہوئے ہیں) وہ باتیں سخت ناگوار گزری تھیں (یعنی یہ سب کچھ اینٹی پاکستانی خیالات تھے) جن کو اِس پوری ناول میں کہیں بھی بنیادی نکتہ نہیں بنایا گیا تھا، البتہ ان دانشوروں کے مربیوں کو چونکہ قرۃ العین حیدر کا سچ بہت ناگوار گزرا تھا لہذا ناول نگار کو دیش نکالا دینے والے جال کا تانا بانا بن دیا گیا تھا خیر یہ باتیں اس ناول کے حوالے سے بہت ضمنی نوعیت کی ہیں۔ اصل بات ان دو نکات کے حوالے سے کہنے اور سمجھنے کی یہ ہے کہ "آگ کا دریا" کی سب سے بنیادی خصوصیت اس میں تاریخی، سماجی اور سیاسی بصیرت کی ہے اور دوسری اہم بات وہ سچائی اور جرأت ہے جو ہر لکھنے والے سے متوقع ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں اگر تحریروں میں نہ ہوں تو معاشرہ کو متحرک اور رواں دواں رکھنے والی اقدار و روایات کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ اور پھر معاشرے کا ہر متحرک عنصر بے جان پتھر بن جاتا ہے جس کی حرکت اور جنبش کسی راہ گیر کی ٹھوکر پر منحصر ہوتی ہے کہ ٹھوکر لگے تو فٹ دو فٹ اپنی جگہ سے پتھر ہل گیا ورنہ روایتی اور کہاوتی "گل محمد" ہونے میں تو کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

ہوا یہ کہ اس ناول کے چھپتے ہی ایک تو وہی "اینٹی پاکستانی" والا ایکٹ اس کے خلاف چلا دیا گیا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس پہلو سے ان دنوں کے "مقتدر دانشوروں کا حد سے زیادہ ایکٹو ہو جانا ان کی بڑی" سماجی ذمہ داری" گردانی جاتی تھی۔ سو اس سے عہدہ برآ ہوا گیا۔ مگر ادبی سطح پر اس ناول کے ساتھ جو سلوک ہوا (دو ایک واقعات سے صرف ادبی سطح کی بات ـــ تحریر سے ان کو چھوڑ کر) وہ خاصا عبرت آموز تھا۔

مثلاً کہا گیا کہ چونکہ اس ناول میں نہ کردار نگاری ہے، نہ واقعاتی تسلسل ہے، نہ اس کوئی آغاز ہے، نہ کلائمکس، نہ اینٹی کلائمکس، نہ انجام اس کو کہیں سے پڑھنا شروع کر دو کوئی فرق نہیں پڑے گا، صفحات کی صفحات چھوڑ کر پڑھنے لگو تسلسل کے ٹوٹنے کا گمان ہی نہیں ہوگا ـــ یہ ناول ہی نہیں ہے۔

کبھی کہا گیا کہ اس میں آواگون کے فلسفہ کے تحت تسلسل پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لہذا یہ ہمارے عقیدے کے خلاف اور ہماری اردو ناول نگاری (مراد مسلم ناول نگاری) کا

بہت زیادہ فلسفیانہ سطح پر گفتگو کر کے اس ناول کو ردادر اپنی علمیت کا جھنڈا بلند کرنے کی سعی و کاوش میں اس کو شعوری رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کا ایک ناکام تجربہ کہا گیا۔ کبھی اسے ویدانتی فلسفہ کا پرچارک کہہ کر رد کیا گیا، اور کبھی وجودیت (EXISTENTIALISM) کا شاخسانہ کہا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ناول میں تکنیک اور مواد کو برتنے کے سلسلے میں جتنے تجربات کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر متذکرہ بالا تقریباً تمام ہی "الزامات" کسی نہ کسی شکل میں اس پر صادق آسکتے ہیں۔ مگر دقت یہ ہوئی کہ ایک تو ان "الزامات" کو کسی ایک لکھنے والے نے بھی یک جا کر کے اس ناول کا تجزیہ نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ ہر لکھنے والے نے کسی ایک بات کو اٹھا کر نہ اسے اختتام تک پہنچایا اور نہ ہی اپنے موقف کی بنیاد اس تحریر کو ناول کہنے پر رکھی۔ گویا اپنی بات بھی ادھوری رکھی اور "آگ کا دریا" کو ناول کے طور پر رد بھی کر دیا۔ مثلاً آواگون والی بات ہی لے لیجئے تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ "آواگون" کے تحت ہر شخص مر کر کسی دوسری شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر پچھلی زندگی میں اس کے اعمال اچھے رہے ہیں تو وہ نئی زندگی میں ان کا سکھ دیکھتا ہے۔ بصورت دیگر وہ کسی جانور کی شکل میں پیدا ہوتا ہے (یا کسی بہت ہی نیچ طبقۂ انسانی میں زندگی پاتا ہے) اور پچھلے کرم کا دکھ بھوگتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اس ناول کے کسی کردار کے صفحۂ ناول سے انتقال کے بعد دوسری دفعہ صفحۂ ناول پر نمودار ہوتے ہوئے نہ اس کی جون بدلتی ہے، نہ وہ اپنی موجودہ زندگی کو پچھتاوا یا پچھلے اعمال کی سزا محسوس کرتا یا کہتا ہے، نہ اس کی سماجی حیثیت پہلے سے کمتر ہوتی ہے۔ ایسی کوئی بات بھی تو نہیں ہوتی۔ پھر ان کرداروں میں عیسائی ہندو اور مسلمان دونوں ہی کردار شامل ہیں گوتم نیلمبر، ہری شنکر، چمپک، نند بالا، اکلیش، سجاتا، آنند، ابوالمنصور کمال الدین، چمپا احمد، کمال الدین علی رضا، سرل ایشلے، امبیکا وغیرہ وغیرہ۔ سو کیا قرۃ العین حیدر عیسائی اور مسلمان کرداروں کو بھی فلسفۂ آواگون کے تحت تین تین چار چار بار زندہ کرنے کی قائل ہیں؟ رہ گئی ہندو فلسفہ یا [illegible]نت والی بات تو اس پورے ناول میں صرف ایک جگہ چند مکالمات محمود غزنی کے سالار [illegible] الدین ابوالمنصور) اور دربار اشوک کی شہزادی چمپاوتی کے درمیان آتے ہیں، جن میں [illegible]ی کمال الدین ابوالمنصور کو ہندوستان پر حملہ کرنے والے محمود غزنی اور اس کے لشکریوں [illegible]ت لڑتے بھڑتے رہنے، تلوار ساتھ رکھنے اور خون بہانے پر کمر بستہ رہنے کا طعنہ دیتی

ہے۔ اس پر بہت دنوں بعد جب کمال الدین ابوالمنصور جو اپنے سلطان کے حکم کے مطابق سنسکرت جاننے والے عالموں کی مدد سے "تانب پتروں" پر لکھی ہوئی تحریروں کو فارسی میں ترجمہ کرنے کے لئے جون پور پہنچتا ہے اور وہاں رہتے ہوئے ہندی فلسفہ کا خوگر ہوکر "تلوار" کمر سے کھول دیتا ہے تو یہ کسی جپا کے احتجاج یا کسی پنڈت کی تبلیغ کا ردعمل نہیں دکھایا گیا ہے بلکہ تاریخ کا وہ عمل ہے کہ جب باہر سے آنے والے اپنے آپ کو، اپنے مزاج کو، اپنی روایات اور اقدار اور علم کو فطری طور پر کچھ یہاں کی فضا میں تحلیل کرنے میں کامیاب ہونے لگے اور یہ کچھ یہاں کی باتوں کو اپنے علم، اپنے مزاج اور اپنی اقدار و روایات میں جذب کرنے لگے تھے۔ تو ان کا اپنی بعض روایاتِ اسلاف کو ترک کر دینا ایک فطری عمل بن گیا تھا۔ ایک استثناء صرف اورنگ زیب عالمگیر کا دور اور دربار ہے ورنہ تو خاندانِ تغلق سے لے کر خاندان مغلیہ کے آخری تاجداروں تک اثر اندازی اور تاثر پذیری کا دوطرفہ عمل یہاں کی پوری ہندی اور مغل تہذیب میں بالکل ویسے ہی ملتا ہے جیسے کہ انگریزوں کے عہد میں اینگلو انڈین اور اینگلو مغل تہذیبوں کے پروان چڑھنے کا عمل تھا۔ ہمارے یہاں آج بھی اینگلو مغل تہذیب کی واضح نشانیاں مل جاتی ہیں۔ خود موجودہ بھارت میں خالص ہندی تہذیب کی برتری اور بالادستی کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہاں کے تعلیم یافتہ اور موڈرن طبقوں میں ابھی تک اینگلو مغل اور اینگلو انڈین تہذیبوں کے نقوش مدھم نہیں پڑے ہیں۔ پاکستان میں بسنت کا تہوار منانے کی رسم، میلہ، چراغاں، شب برات پر آتش بازی اور چراغاں، اولیاء کے ہزاروں میلے وغیرہ کا آخری تجزیہ کیا ہمیں مغل تہذیب میں ہندی تہذیب کی UNDER-CURRENTS کا احساس اور یقین نہیں دلاتا؟ موہنجو داڑو، ہڑپہ اور گندھارا تہذیبیں ہماری سرزمین پر آج بھی سانس لے رہی ہیں۔ "آگ کا دریا" میں گوتم نیلمبر اور ہری شنکر کے منبع علم و عرفان کی درسگاہ ٹیکسلا بھی ہماری سرزمین پر واقع ہے۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ عربی اور فارسی ادبیات تو سکتی ہے۔ یونانی یا ساسانی تہذیب اور مغل اثرات چونکہ ہمارا شناختی کارڈ ہیں اس لئے ہم قدیم ہندی کے ان آثار کو بیرونی سیاحوں کے حوالے کر کے اپنے کلچر کو اس ہی طرح پاک صا[illegible] کر لیا ہے جس طرح سے موجودہ بھارت میں آگرہ اور دہلی کے شاہی قلعوں، دہلی کی شاہی مسجد پورے ہندوستان کی سرزمین پر بکھرے ہوئے ایسے ہی لاتعداد مسلمان تہذیب کے [illegible] و شواہد کو محکمہ سیاحت کی خبرگیری کی نذر کر دیا گیا ہے، جو نہایت بے روح الفاظ میں اپ[illegible]

گائیڈز کے ذریعے سیاحوں کو سپاٹ اور رسمی اطلاعات بہم پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔

لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے جس دور میں یہ ناول لکھا تھا، اس وقت نہ ہندوستان میں تغلق، خلجیوں اور مغلوں کی تہذیب کی اور نہ خود پاکستان میں مسلم تہذیب پر ہندی اثرات کی تطہیر کے عمل میں تیزی آئی تھی۔ پھر جس بڑے کینوس پر "آگ کا دریا" لکھا گیا ہے، اگر اس میں ہندی اثرات اور ویدانت کے زیر اثر پنپنے والے کرداروں کی جلت پھرت کے سائے گھرے ہیں تو کیا یہ ناول ہندی تہذیب اور ویدانت کے پرچار یا دوسری طرف پاکستانی تہذیب کی نفی کرتا ہے؟ اب کہ پاکستان اور بھارت کے قیام کو چوتھائی صدی پر بھی دس برس اوپر ہونے والے ہیں۔ پاکستان اپنی جغرافیائی ہیئت میں کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ اور خود قرۃ العین حیدر کو بھارت بسائے بیس بائیس برس ہو چکے ہیں، پاکستان کی مخالفت کرنے پر اب ان پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے تو انھوں نے پاکستان کے خلاف کتنا کچھ لکھا ہے؟ ان کی تازہ کتاب "کارِ جہاں دراز ہے"، ہی کو لیجیے یہ ان کی آپ بیتی اور اس اعتبار سے ان کے عقائد کا بے روک ٹوک اور فطری بہاؤ کا بہترین صحیفہ ہے۔ اس میں کتنا اینٹی پاکستان پروپیگنڈہ ہے؟ جب کہ وہ اپنی موجودہ پناہ گاہ (بھارت) میں بیٹھ کر یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتی تھیں؟

اس ناول کے خارجی ماحول کے سلسلے میں اب صرف ایک آخری بات۔ خارجی ماحول، خارجی وجود یا اعتبار سے یہ ناول تین ادوار میں بٹا ہوا ہے (ناول میں یہ تقسیم حصہ اول، دوم یا سوم لکھ کر نہیں کی گئی ہے) پہلا دور مہابھارت کے بعد سے لے کر سلطان محمود غزنوی کے آمد تک کو محیط ہے۔ یہ خالص ویدک بھارت ہے لیکن اس میں بھی براہمن اور بودھ فلسفوں، تہذیبی اور عقائد کی کشمکش اور کھینچا تانی کے دھارے موجود ہیں۔ مگر یہ جغرافیائی سرحدوں، تاریخی وحدت، اور تہذیبی اور جذباتی سطح پر تھوڑی بہت کشمکش کے باوجود راس کماری سے درۂ خیبر اور بنگال سے وادیٔ دریائے سندھ تک ایک رنگ اور ایک روپ کا ہندوستان ہے جس میں علم النفس فلسفہ، کائنات پر غور و خوض اور رام بھگتی کے ملے جلے دھاروں نے قوس قزح کی رنگینی پیدا کر رکھی ہے۔ دوسرا دور مسلمان حکومتوں کی یکے بعد دیگرے قیام کی کوششوں کے بعد سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں سلطان محمود سبکتگین اور ان کے آخری عمر میں صوفی ہو جانے والے بھانجے (مسعود سالار شہید) کے دور کا بنگال زیادہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا دور تقسیم برصغیر اور دو آزاد مملکتوں یعنی پاکستان اور بھارت کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ اس

حصے میں بھارت اور پاکستان دونوں جگہوں میں انتقالِ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل اور نئی مملکتوں کے قیام کے بعد بد انتظامی، افراتفری اور پاکستان میں راتوں رات صاحب جائیداد اور صاحبِ ثروت ہو جانے کی اندھی دوڑ کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ اس ناول کا خارجی وجود ہے یعنی اس ناول کا وہ مواد ہے جس سے اس کی تعمیر کی گئی ہے۔

ہر ناول میں، قصے میں، کہانی اور افسانے میں خارجی وجود (یعنی واقعات اور مواد) کی طرح اس کا اندرونی یا باطنی وجود اور تانا بانا بھی ہوتا ہے۔ کسی بھی ناول یا افسانہ کی اچھائی یا برائی کے معنی اس میں پوشیدہ نہیں ہیں کہ اس نے خارجی گرد و پیش واقعات اور خام مواد کو سلیقے یا پھوہڑپن سے پیش کیا ہے۔ یہ تو صرف اظہار کی ابتدائی یا اوپری سطح ہے۔ ناول میں خارج اور باطن کے درمیان اصل تعلق اس اندازِ فکر سے ہے جو فنکار اپناتا ہے۔ یہی بات کسی بھی ادبی تحریر میں معنویت پیدا کرتی ہے۔ یہ معنویت واقعات اور کرداروں کے حوالے سے قاری کو بھی ایک نئی بصیرت، نیا فکری انداز دیتی ہے۔ ان کے اندازِ فکر اور اعتقاد اور جذبے کو نئی طرح سے مرتب کرتی ہے۔ ان ہی سب باتوں سے پڑھنے والے کے اندر گرد و پیش کی زندگی کو سمجھنے، برتنے اور گزارنے کا سلیقہ اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد اب ہمیں اس ناول پر ان پہلوؤں سے بھی نظر ڈال لینا چاہئے۔

شاید ہی کوئی لکھنے والا ایسا ہو کہ جس نے "آگ کا دریا" پر قلم اٹھایا اور اس میں لامتعلق مواد اور کرداروں کے ساتھ بے انصافی اور نتیجتاً اس کو ایک ناکام ناول نہ کہا ہو۔ بعض حضرات نے تو اسے ناول ہی ماننے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ رہی کہ دو ایک نقادوں کے علاوہ جن میں مجتبیٰ حسین سرِفہرست ہیں کوئی بھی ناول کے تانے بانے میں حقیقی یا بنیادی عنصر کی گرفت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجتبیٰ حسین نے اسے عام کرداروں اور واقعات سے زیادہ "وقت" کی مرکزی اور بنیادی تعلیم کا ناول مانا ہے، اور یہی وہ دھاگا (THREAD) ہے جس کے سرے کی گرفت کسی چٹکی میں نہیں آسکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کے لئے اسے شعور کی رو کا ناول کہہ دیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دو ایک مقامات کو چھوڑ کر اس تکنیک کا "آگ کا دریا" میں بہت کم عمل دخل ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین "وقت" کو مرکزی کردار مانتے ہوئے بھی اس حوالے سے ناول کے تانے بانے کو سلجھانے کا وقت نہیں نکال سکے اور یہ کہہ کر اُس بحث ہی کو ختم کر دیا۔ رہ گیا "وقت" کے مرکزی کردار ہونے کا سوال —— تو اس سلسلے میں

اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ "وقت" ہر اچھے ناول کا مرکزی کردار ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔
"آگ کا دریا" کا مرکزی کردار وقت بھی ہو سکتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان بھی ہو سکتا ہے،
تہذیب بھی ہو سکتی ہے اور چار باغ کا اسٹیشن بھی، یہاں سے اس ناول کے مختلف کردار منزل
مرادیا نامرادی کی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔" (تین کتابیں تین نسلیں)

یہ بات بالکل بنیادی ہے کہ 'وقت' ہر اچھے ناول کا مرکزی کردار ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ "اچھے" یا 'ناول' ہی کی کیا شرط ہے۔ وقت تو فکشن کی دوسری اصناف کا
(بلکہ شاعری تک کا) مرکزی کردار رہی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ وقت کس حیثیت میں یہ مرکزی
کردار ادا کرتا ہے؟ وقت کی ایک وہ نوعیت ہے کہ وہ کرداروں کی حرکات و سکنات اور رفتار
و گفتار کے حوالے سے بلا اعلان PASSIVE یا غیر فعال حیثیت میں بین السطور گزرتا چلا
جاتا ہے۔ قاری ایسی تحریریں پڑھتے ہوئے ٹائم کونشس نہیں ہوتا۔ اس کی دوسری نوعیت
بالکل برعکس ہے کہ فنکار وقت کے حوالے سے کرداروں کو چلاتا پھراتا ہے اور ان کی رفتار و
گفتار کو ٹائم کونشس نیس (TIME CONSCIOUSNESS) کے تابع کر دیتا ہے۔ یہاں پڑھنے
والے کو کرداروں کے ساتھ ساتھ وقت کی رفتار اور نوعیت پر زیادہ توجہ رکھنی پڑتی ہے۔
"آگ کا دریا" میں جب گوتم نیلمبر "تم کون ہو بھائی" کے جواب میں "میں ہوں" کہتا ہے تو
کردار کی شناخت نہیں ہوتی، بلکہ "وقت" کی شناخت ہوتی ہے، اس لئے کہ یہاں کردار کی آواز
میں اس کا "وقت" (زمانہ) گونجتا ہے۔ پڑھنے والا ایک جھٹکے کے ساتھ وقت آگہی اور
وقت شناسی کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی ردعمل ابوالمنصور کمال الدین کے دریائے
سرجو پر یکایک نمودار ہونے کے لمحہ میں، اور یہی کچھ کمال رضا کے گوتم نیلمبر دت کے، چمپک کے،
چمپا دتی کے اور چمپا احمد کے سامنے آنے پر ہوتا ہے۔ کرداروں کے ناموں میں تسلسل اور یکسانیت
سے اگر وقت آگہی اور وقت شناسی کا کام ناول نگار کو لینا مقصود نہ ہوتا تو یہ تمام نام 'وقت'
کے دائرے میں اسیر ہو کر جامد اور ساکت ہو جاتے، اور یوں وقت اس ناول کا مرکزی کردار
تو کیا ثانوی کردار بھی نہ بن پاتا۔

سو اصل بات ناول یا افسانے یا شاعری میں وقت کے مرکزی کردار ہونے سے زیادہ
"آگ کا دریا" کے حوالے سے وقت کی اس نوعیت کو سمجھنے کی ہے کہ یہ مرکزی کردار کیا ہے؟
ایک بات کی طرف تو اشارہ کیا جا چکا ہے کہ 'وقت' یہاں کردار کے ظاہر اور باطن دونوں سے

اپنی شناخت کا اعلان کرتا ہے۔ ایک بار پھر عرض ہے کہ یہ وہ "وقت" نہیں ہے جسے ہم عام ناولوں میں غیر فعال حیثیت کی وجہ سے محسوس کئے بغیر (کرداروں کی مدد سے) پورے ناول یا افسانے میں گزرتے ہوئے بس دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں اور کہیں TIME CONFLICT کی زد میں نہیں آتے ہمارے یہاں "آگ کا دریا" سے ملتی جلتی تھیمز پر "آنگن" "سنگم" "اداس نسلیں" "ایلی پور کا ایلی" اور "نئے چراغنے لگے" بھی ہیں۔ ان سب ناولوں میں بھی 'وقت' مرکزی کردار ہے۔ ایک "نئے چراغنے لگے" کو چھوڑ کر یہ ساری ناولیں مروجہ اندازِ نگارش کی ناولیں ہیں۔ مگر ان میں وقت حسبِ معمول دبے پاؤں، بلا اعلان بغیر کسی CONFLICT کے گزرتا چلا جاتا ہے ـــــ "نئے چراغنے لگے" البتہ ان ساری ناولوں میں "آگ کا دریا" جیسی انفرادیت رکھتی ہے "آگ کا دریا" میں 'وقت' خود کردار ہے۔ نثار عزیز نے اپنے ناول میں جدیدیت کے ایک اہم اور قابلِ ذکر رجحان یعنی DOCUMENTALISM کو برتا ہے۔ بہت پہلے ٹالسٹائی نے اپنے ناول وار اینڈ پیس میں کچھ اس ہی سے ملتی جلتی تکنیک استعمال کی تھی۔ لیکن وہاں سیاسی احوال و کوائف کے سیلف اور سیدھے سادے طویل بیان کی حد تک ہی بات پہنچی تھی) اور یوں یہاں بھی 'وقت' سب کرداروں کا "کردار" بن جاتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔

اب دوسری بات کو لیجئے۔ یعنی وقت؟ (یعنی چہ) مثبت؟ یا منفی؟ وہ وقت جو ہر موجود شے کو نفی کی طرف، ماضی کی طرف یا عدم اور کالعدم کی حدود میں دھکیل رہا ہے؟ ابھی ہے! ۔ ابھی نہیں ہے؟ یا وہ وقت جو منفی کے بطن سے اثبات کے گل بوٹے کھلاتا ہے۔ جس سے ہمارا حال اور مستقبل وجود پاتے ہیں؟ یا وہ وقت جسے ہم گھڑی کی ریڈیم لگی ہوئی سوئیوں کی رفتار سے یا پھر کلینڈر کے اوراق پر چھپے ہوئے ہندسوں اور خود اپنے وضع کردہ ہفتہ کے دنوں کے ناموں (شنبہ۔ یک شنبہ۔ وغیرہ وغیرہ) کی مدد سے شناخت کرتے ہیں؟ یا وہ وقت جو ہماری تہذیبی تاریخ کے صفحات میں نہ مٹنے والی روشنائی سے لازوال حروف اور عبارتیں بن جاتے ہیں۔ جن کے بطون سے مستقبل کی تعمیر کے اشارے ملتے ہیں یعنی اثبات کی راہ؟ سیدھا سوال یہ ہے کہ "آگ کا دریا" میں وقت کا مرکزی کردار نفی کا ہے اثبات کا؟ یا دونوں ہی صورتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے؟ پھر اس آخری صورت میں کس کی ہوتی ہے؟ انکار کی؟ یا اثبات کی؟

نہ جانے کس مصلحت یا کس غفلت کے تحت ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی اس نظم کو نہ

کیا جارہا ہے جس کی اکا دن سطروں کو قرۃ العین حیدر نے بڑے اہتمام اور انتخاب کے ساتھ اس ناول کا پیرائیہ آغاز بنایا ہے۔ اس نظم کا نام THE DRY. SALVAGES ہے۔ یہ نظم ایلیٹ کی ایک طویل نظم FOUR QUARTETS کا حصہ ہے۔ ڈرائی سیلویجس کا بالعموم (اور بالخصوص اُن مصرعوں کا جن کا یہاں) انتخاب کیا گیا ہے ان کا مرکزی کردار بھی "وقت" ہے۔ چنانچہ ان مصرعوں اور ناول کے مرکزی کردار میں پہلی ہی نظر میں خاصی مماثلت ملتی ہے۔ بلا تبصرہ یہ چند مصرعے پڑھیے (ترجمہ قرۃ العین حیدر کا ہے)

خاتمہ کہاں ہے؟ ___ بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے؟

خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
سوال یہ نہیں ہے کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا۔ یا غلط چیزوں کے خوف کا
یہ لمحے مستقل ہیں۔ جس طرح وقت مستقل ہے۔
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔
کیوں کہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا۔
لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے۔ قایم بھی رکھتا ہے۔

خط کشیدہ مصرعوں میں خاص طور سے وقت کا وہی تصور ہے جسے قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول میں مرکزی کردار دیا ہے ۔ یعنی وقت جو اپنی فطرت میں ایک سیلاب کی طرح ہے کہ ہر چیز کو اپنے بہاؤ کے رُخ بہاتا ہوا لے جاتا ہے ۔ لیکن وقت کے اس بہاؤ میں صرف تخریب ہی تخریب نہیں ہے ، اس میں تعمیر بھی ہے —— " وقت جو تباہ کن ہے ۔ قایم بھی رکھتا ہے ۔ " " وقت " کے اس تصور سے ہی " آگ کا دریا " میں اس تکنیک کی کلید بھی مل جاتی ہے جہاں ایک ہی نام کے کردار مختلف ادوار میں ملتے ہیں ۔ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس ناول میں ان کرداروں کا بار بار اور مختلف ادوار میں سامنے آنا آواگون کے تحت نہیں ہے ۔ دراصل اس غلط فہمی کی گنجائش یوں پیدا ہوئی ہے کہ ایلیٹ کے یہاں کرشن مہاراج کی اُس بات کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے مہابھارت کی جنگ میں رتھ بان کی حیثیت سے راج کمار ارجن سے کہی تھی —— میں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے ... وغیرہ وغیرہ اور یہ بات کسی انکشاف کا درجہ نہیں رکھتی کہ سری کرشن کی فکر پر سانکھیہ یوگا کا گہرا اثر تھا ۔

بظاہر تو ایلیٹ نے سری کرشن کا حوالہ دے کر اس تمام فلسفے کو جوں کا توں دی ڈرائی سیلو یجس میں برتا ہے لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے ۔ ایلیٹ نے اس پوری نظم (اور بالخصوص قرۃ العین حیدر کے منتخب مصرعوں) میں جس نوعیت کے سمبلز کو استعمال کیا ہے انھوں نے اس ہندو نقطۂ نظر کو بالکل الٹ دیا ہے کہ " کرم " یا " نہ کرم " اگلی پچھلی زندگیوں کی شکل میں بھوگ بن جاتے ہیں " ان مصرعوں کو دیکھئے :۔

آگے بڑھو مسافرو ۔ ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
روان نہیں ہو ۔
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو
یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں ۔ جانو
کہ موت کے لمحے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو (اور موت کا لمحہ ہر لحظہ ہے)
وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا

کرم کے پھل کا خیال نہ کرو ۔ آگے چلو ۔

یہ سارے ہی مصرعے جو سری کرشن کی تقریر کے طور پر لکھے گئے ہیں، ہندو مت کے فلسفۂ آواگون سے کتنے متضاد فلسفۂ فکر کو پیش کرتے ہیں؟ ایلیٹ نے کہا ہے کہ مرتے وقت انسان اپنی زندگی (وجود) کے جن لمحات (یہاں مراد اعمال ہے) کو زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے، بس وہی اس کی تمام زندگی کا پھل ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی اگر نیکیوں سے عبارت رہی ہے تو وہ اور اگر برائیوں سے عبارت رہی ہے تو وہی اس کا پھل ہے اور آنے والی نسلوں کو انسان کے ان اعمال کی جزا یا سزا کو بھگتنا ہوگا " وہ محض ایک کرم ہے جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا ۔"

ایک اور اہم بات بریکیٹ میں دیئے ہوئے الفاظ (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے) سے بھی سمجھنے کی ہے ۔ وہ حضرات جو یونان کے فلسفی ہرقلیط (HERACLITUS) کے فلسفۂ فکر سے واقف ہیں، اس کے اس مشہور قول کو جانتے ہیں " انسان کا اگلا قدم بہتے ہوئے دریا میں دوبارہ اس ہی دریا میں نہیں پڑتا اس لئے کہ ہر لمحہ پانی اپنی اس ہی حالت میں نہیں ہوتا کہ یہ مسلسل ہو رہا ہے" (YOU CANNOT STEP TWICE INTO THE SAME RIVER, FOR OTHER AND YET OTHER WATERS ARE EVER FLOWING ON) بس یہی کیفیت یہاں ایلیٹ نے موت کی بھی بتائی ہے ۔" اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے " یعنی موت ایک مسلسل عمل ہے ۔ چونکہ انسانی زندگی بھی ایک مسلسل عمل (PHENOMENA) ہے لہذا موت اور زندگی کے اس منفی اور مثبت عمل کی بنا پر ہر لمحہ ۔ ہر لحظہ موت کے تسلسل کا نہیں، زندگی کے تسلسل کا عمل بن جاتا ہے ۔ قرۃ العین حیدر کے کرداروں میں تسلسل کی یہی نوعیت ہے ۔ کسی کردار کی اگلی زندگی اس کے پچھلے اعمال کی شکل نہیں ہے ۔ یہاں ایک اور مصرعے کی یاد دہانی ضروری ہے :-

" خاتمہ کہیں نہیں ہے ۔ صرف اضافہ ہے "

چنانچہ " آگ کا دریا " میں سارے ہی کردار پچھلی زندگی کی بازگشت نہیں ہیں بلکہ تاریخ کے ہر بدلتے ہوئے دور میں ہر کردار اپنی علمی، فکری، سماجی اور معاشرتی سطح میں " وقت " ــــ لمحہ موجود یا NOW میں نئے اضافوں کے ساتھ، عہد جدید کی بدلتی ہوئی اقدار و روایات کے ساتھ آتا ہے HERACLITIAN فلسفے کے مطابق انسان کا نیا روپ (REBIRTH)

صرف اس کا لمحۂ موجود (NOW) کا تجربہ ہوتا ہے۔ اگلے جنم کے اچھے یا بہتر تصور یا بہتر شکل میں پانے کے لئے نہیں ہوتا۔ صرف لمحۂ موجود (حال) میں آگے بڑھتے رہنے کا تجربہ یا بڑھتے رہنے کی خاطر تجربات سے گزرتے رہنا ——— اور بس ——— بقول پروفیسر فلپ وہیل رائٹ ایلیٹ کی اس نظم کے بھی آخری مصرعے یہی ہیں۔ A RESOLUTE FARING FORWARD

کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا
الوداع نہیں ——— بلکہ آگے۔ بڑھو
مسافرو

اِن تمام وضاحتوں کا مقصد صرف " وقت " کی اس نوعیت اس کردار کو تلاش کرنا تھا جس کو قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ " وقت " کہ جو ایک فعال قوت کے طور پر انسان کی بدلتی ہوئی، نئی بنتی ہوئی تاریخ کا جزو ہے۔ تاریخ تو ہمات سے نہیں ٹھوس حقیقتوں کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ وہ واہموں کو نہیں ٹھوس حقیقتوں ہی کو جنم دیتی ہے۔ تاریخ کے دھاروں سے نبرد آزما انسان ہمیشہ ہی اس " وقت " سے نبرد آزما رہتا ہے ... "جو تباہ کن ہے۔ قایم بھی رکھتا ہے"۔ " آگ کا دریا " کا ہر کردار یہی وقت ہے، تاریخ ہے، اضافہ ہے۔ موت کا نہیں زندگی کا تسلسل ہے۔ عمل کا تسلسل ہے۔ وہ الوداع نہیں کہتا۔ وہ ہر آواز پر 'میں ہوں' کہہ کر اس تسلسل، اس آگے بڑھتے رہنے کے عمل (FARING FORWORD) کی دلیل بن جاتا ہے۔ وہ فرد بھی ہے اور کردار بھی ہے، وہ لمحہ بھی ہے اور لمحوں کا تسلسل یعنی 'وقت' بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ " آگ کا دریا " میں مہابھارت سے پہلے اور بعد کا دور، اشوک کا دور، مسعود غازی کا دور، سلطان محمود غزنوی کا دور، مغلوں کا دور، انگریزوں کا دور اور پھر سب سے آخر میں برصغیر کی تقسیم کے بعد پھر سے بھارت ورش اور پاکستان کا وجود میں آنا، سب ایک تسلسل ہے۔ وقت کا تسلسل، ٹوٹ پھوٹ کا تسلسل، تشکیل نو کا تسلسل۔ تہذیبوں اور مسرتوں کا تسلسل پرانی تہذیبوں اور معاشروں کے بطون سے جدید سے جدید تر کی تشکیل کا تسلسل۔

اس اتنے بڑے تسلسل کی مربوط فلسفیانہ اور تواریخی داستان کو بیان کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ کہہ دینا کہ اس ناول میں کچھ نہیں ہے بس واقعات کی پیوند کاری کی گئی ہے۔ ہزاروں برس کی تاریخ سے " اثبات " کی تادش نکال دکھانا اتنا آسان

نہیں ہے جتنا یہ کہہ دینا کہ قرۃ العین حیدر کا رد یہ سراسر منفی ہے۔ وہ تاریخ کی دشمن نہیں بڑی کھری، سچی اور سمجھ دار دوست ہیں۔ نہ جانے ہم دوست اور دشمن کا فرق سمجھنے کے لائق کب ہوں گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پاکستان کے تشخص پر ہی نہیں بھارت کے تشخص پر بھی اگر کوئی اس کے دسویں حصے کے برابر کا ناول لکھ کر دکھا دے تو میں اسے قرۃ العین حیدر سے ہزار گنا بڑا ناول نگار تسلیم کر لوں گا۔ □

شجاعت علی راہی
سی سی ۴۵۲ ص ب ۹۶۷
جدہ ۲۱۲۳۱ (سعودی عربیہ)

یہ خواب اپنے ہی پاس رکھو

عذاب اپنے ہی پاس رکھو
یہ خواب اپنے ہی پاس رکھو
کوئی سنے گا تو ہنس پڑے گا

دماغ میں یہ فتور کیسا
گھمنڈ ایسا، غرور ایسا
جلا ہی دو گے چراغ جیسے
مٹا ہی دو گے یہ داغ جیسے
لگا ہی دو گے ہر ایک لب سے
محبتوں کے ایاغ جیسے
کہ دیکھتے ہو یہ خواب کیسے
نجوم، مہر، آفتاب جیسے
چکا ہی دو گے حساب جیسے
مٹا ہی دو گے عذاب جیسے
کما ہی لو گے ثواب جیسے
جہاں میں ہو انتخاب جیسے
پڑے ہو کس مخمصے میں بھائی
ابھی تو ہو مدرسے میں بھائی

یہ خواب اپنے ہی پاس رکھو
کوئی سنے گا تو ہنس پڑے گا

مری جو مانو تو کچھ نہ بولو
جو بولنا ہے تو موتی رولو
فضا میں سچ کا نہ زہر گھولو
زباں کو رس میں ڈبو کے بولو
مصیبتوں کے نہ باب کھولو
اگر ہے رونا تو خود ہی رو لو
جلے جو سینہ تو چپ ہی رہنا
عذاب ٹوٹے تو کچھ نہ کہنا
اگر ہنسو گے تو سب ہنسیں گے
جو روؤ گے تو نہ ساتھ دیں گے
عذاب اپنے ہی پاس رکھو
ثواب اپنے ہی پاس رکھو
حساب اپنے ہی پاس رکھو

یہ خواب اپنے ہی پاس رکھو
کوئی سنے گا تو ہنس پڑے گا

بڑے بڑے آ کے جا چکے ہیں
بڑے بڑے زخم کھا چکے ہیں
بری طرح تلملا چکے ہیں
لہو سے شمعیں جلا چکے ہیں
ثواب ڈھیروں کما چکے ہیں
صحیفے لاکھوں ہی لا چکے ہیں
وہ حربے سب آزما چکے ہیں
ہزاروں رستے دکھا چکے ہیں
کوئی رشی تھا، کوئی ولی تھا
کوئی خفی تھا، کوئی جلی تھا
مگر چلا زور کب کسی کا
نہ جب کسی کا، نہ اب کسی کا
مری جو مانو تو میرے بھائی
نہ دو دہائی، نہ دو دہائی

یہ خواب اپنے ہی پاس رکھو
کوئی سنے گا تو ہنس پڑے گا

ابھی تو کمسن ہو بھائی میرے
ابھی تمھیں دنیا دیکھتی ہے
ابھی بہت سنگ کوٹنے ہیں
ابھی مری جان، ٹوٹنے ہیں
شہاب کی طرح خواب کتنے
حباب کتنے، عذاب کتنے
ابھی تو ہیں زیرِ آب کتنے
سوال کتنے، جواب کتنے
ثواب کیسا، عذاب کیسا
کتاب کیسی، حساب کیسا
عذاب لاکھوں ہی کاٹنے ہیں
تو زخم ڈھیروں ہی چاٹنے ہیں
ابھی رکھو حوصلہ ذرا سا
ابھی ذرا وقت بیتنے دو
ذرا زمانے کو جیتنے دو

ابھی یہ خواب اپنے پاس رکھو
کوئی سنے گا تو ہنس پڑے گا

نیّر جہاں
721, HILL STREET
SANTA MONICA, CAL.
90405

قصۂ آدم

دریچے بند کر رکھے تھے سارے
گھٹن تھی — حبس تھی — بوجھل فضا تھی
عجب تاریک خاموشی بچھی تھی
نہ جھونکے کی کوئی دستک
نہ خوشبو کی کوئی آہٹ
کسی روشن کرن کی جگمگاہٹ کا کوئی امکاں
نہیں تھا
فقط اک نیم جاں احساس دل کی خلوتوں میں
محوِ تسبیحِ وفا آواز دیتا تھا
کہ ہم محفوظ ہیں دیکھو — دریچے بند ہی رکھنا
نہ کوئی شوخ جھونکا دستکیں دیتا ہوا آئے
نہ خوشبو کی کوئی البیلی آہٹ گدگدا جائے
حسین کرنوں کی چاہت میں بصارت کھو
بھی جاتی ہے

ترنم ریز بارش میں سدا سیلاب لاتی ہے
بلائے آسمانی کی کوئی رنگت
کوئی صورت
کوئی آہٹ نہیں ہوتی
دریچے بند ہی رکھنا — کہ ہم محفوظ ہیں دیکھو
دریچے بند ہی رکھنا —"
مگر معصوم سا روزن
کہ خوشبو کی چاہت میں
کہ جو کرنوں کو پینے کی تمنا میں
کہ جو تازہ ہوا کے وصل کی خاطر
مجسم آنکھ بن بیٹھا

خداوندا! ترے مضبوط بندے
اتنے کیوں کمزور ہوتے ہیں!!!

C/O M. G. RAHMAN ADVOCATE
DAHANDA BASE, P.O. AKOLA (CITY)
444002 (M.S.)

بلقیس شبیہ

انگنا کی دھول

نوکری سے استعفیٰ دے کر سپنا گھر پہنچی۔ اس نے ساری بات گھر والوں کو بھی بتادی۔ سب ایک دم سناٹے میں آگئے ــــ

"اتنی بڑھیا نوکری کے ساتھ اتنا عمدہ رشتہ، بنی بنائی عزت، اور برتری کو بھی لات مار دیا بیوقوف نے ــــ"

پتاجی پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولے

بہنیں بھی روہانسی ہوگئیں، دادی ماں بڑبڑائیں۔ شدتِ غم سے ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

دراصل ان سب کو بنگلہ نوکر چاکر، اور نوکری کے دم سے میسر آنے والی ساری سہولتیں چھن جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن سپنا کو اس کا کوئی ملال نہ تھا۔ وہ جانتی تھی آج نہیں تو کل کسی اور فرم میں دوسری نوکری مل جائے گی۔ لیکن اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے اس سے بہتر موقع میسر نہ آتا۔ اپنے دو خواہشمند پہلوانوں کو پچھاڑ کر وہ بہت خوش تھی۔

اک زمانہ تھا کہ سماج کے ٹھیکیدار یہ مرد اسے ٹھکراتے رہے تھے۔ آج انھیں ٹھکرا کر اسے کسی فتح مندی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی اس خوشی میں اس کے گھر والے شریک نہ تھے۔ اپنی شکست خوردگی کا صدمہ بھی صرف اسی نے جھیلا تھا۔ ہر آنے والا اسے روند کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اپنی پسپائی اور چوٹوں کے گھاؤ نظر نہ آنے والے احساس کے پرتوں میں دبے اسے کچوکے لگاتے رہتے۔ اور گھر والے اس کی زخمی انا کے اس کرب سے نا آشنا رہے۔

اس کے سیاہ فام چیچک زدہ شریر کے اندر آرزؤں بھرا جوان خوبصورت دل تھا۔ شباب کی منزل پر قدم رکھنے کے بعد عام لڑکیوں کی طرح اس نے بھی چاہنے اور چاہے جانے کے خواب دیکھے تھے۔

ص

سپنے! جو نوجوان لڑکیوں کا ورثہ ہوتے ہیں۔

مگر ___ پھر ___!!

بہت آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو اپنی بہنوں سے کم رو سمجھنے لگی۔۔

یہ احساس بھی اُسے آئینے نے نہیں بلکہ ان اپنوں نے دیا جو اس کی سیرت، ہنرمندی سلیقہ اور شعور کے گن گاتے تھے۔ اپنی بدصورتی کا احساس دھیرے دھیرے اس کے شجرِ حیات پر اک پھل کی طرح پختہ ہوتا گیا۔

اس دوران اس پر کتنی قیامتیں گزریں.......

اور جب وہ ان میں سے صحیح سلامت نکلی تو کندن کی طرح دہک رہی تھی۔ مگر اس کا یہ نکھار دیدہ وروں کے لئے باعثِ کشش نہ تھا۔

سماج کے فرسودہ رسم ورواج کو توڑنے کی طاقت! کچھ کر گزرنے کا حوصلہ.....اور اس دنیا میں تن تنہا زندگی گزارنے کا عزم اس میں پیدا ہوگیا تھا ___

اپنی ماتا پتا کے بگیا میں کھلنے والا وہ پہلا پھول تھی ___

مگر نہیں ___ شگفتہ خوش رنگ پھولوں سے بھلا اس کی کیا مشابہت ___

ماں نے اس کا نام سپنا رکھا ___ جانے کیا سوچ کر ___ ویسے بھی وہ اپنے آپ کو خواب ہی سمجھنے لگی۔ بھیانک اور ڈراؤنا خواب....

"روپا نے یہ کالی کلوٹی لڑکی کو جنم دیا ہے ___" اس کی پیدائش پر سب کی طرف سے ماں کو بدھائی میں یہ بول ملے تھے ___

"ایک تو چھوکری ذات اوپر سے بدصورت ___" ساس نے بہو کی جھولی میں فکر کا یہ پہلا پتھر پھینکا ___

چیچک کے سسکتے ہوئے آبلوں میں وہ نیم کے بستر پر ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی ماتا کا جذبہ دیا کل تھا تب پتی نے بیوی کو یوں تسلی دی تھی۔

"تم چنتا نہ کرو روپا ___ اسپنا سہاگن نہیں ___"

[illegible] ___ وہ بڑی ہوگئی۔

[illegible] آنے والے [illegible] پھیرتے رہے.....اسے جینے کا سا

اپنے علاج معالجے کے سلسلے میں مامی گاؤں سے جب بھی اپنے گھر آتیں سپنا کی سیرت کے بہت گن گاتیں ــــ "روپا! تیری سپنا تو بہت سگھڑ ہے۔ گرہستی کے دھندوں اور چتورائی میں تو وہ تجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ ماں خوش ہوتی۔ چلو! بھابی اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لئے نہ سہی ماسٹر کے لئے تو ضرور ہی میری سپنا کو پسند کریگی۔ جبھی تو اتنا سراہ رہی ہیں سپنا کو۔

وہ اور زیادہ مامی کی سیوا کرتی۔ گھر کے کام دھندوں میں اور زیادہ لگن اور دلچسپی دکھاتی۔ مامی کے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھتی۔ اس کی چھوٹی بہن ہنستے ہوئے کہتی۔

"سپنا! پرکاش کا اجالا تیرے بھاگیہ میں نہیں ــــ"

اور واقعی مامی نے اس کی سیرت کے حسن کو نظر انداز کر کے اپنے بیٹے پرکاش کے لئے اس کی چھوٹی بہن کو پسند کر لیا۔ وہ اپنے اندر جیسے بکھر کر رہ گئی ــــ

اپنی مامی کی لڑکی پدما سے سپنا کو بہت محبت تھی۔ دونوں ہم عمر بھی تھیں اور ہم مزاج بھی سپنا کو ٹھکرا کر اس کی چھوٹی بہن کو پسند کرنے والوں نے اسے جو احساس شکست بخشا تھا پدما اس کے اس غم میں برابر کی شریک تھی۔ وہ اسے حوصلہ دیتی اور اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔

جب پدما کی شادی ہوئی تو اس کے جہیز کی تیاری اور پورے کپڑوں کی سلائی سپنا ہی نے کی۔ "سپنا!" پدما نے فرطِ مسرت سے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاتھ جس گھر میں جائیں گے وہاں گرہستی کے پھول کھلائیں گے ــــ"

لیکن پدما نے اپنے دیور کے لئے اِن پھول کھلانے والے ہاتھوں کو بھلا کر اس کی چھوٹی بہن کو پسند کیا۔ جو بظاہر خوبصورت تھی۔ یہ دوسرا تیر تھا۔ اس کا گھاؤ شدید اور احساسِ بدصورتی کا جان لیوا کرب بن گیا۔

اس کے بدصورت چہرے پر صرف اس کی دو آنکھیں خوبصورت تھیں۔ خواب دیکھنے والی آنکھیں۔ لمبی سیاہ گھنیری پلکیں جانے کتنے خوابوں کے تانے بانے سمیٹے ہوئی تھیں۔

گھر میں جب بھی بر دکھائی کا موقع آتا اس کی ماں اور بہنیں اس کی بدصورتی کو گہنے پاتے اور میک اپ کے پرتوں میں چھپانے کی کوشش کرتیں۔ اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ڈشوں کے ساتھ بھی وہاں سجا دیا جاتا ــــ مگر نتیجہ وہی صفر......

اک دفعہ پھر گھر میں کسی کے سواگت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اسے پھر ہلدی، ابٹن ملے ...ید ہونے لگی "پتاجی نے اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس سے وٹامنس سے بھرپور ٹانک، سیرپ

اور دوائیاں لائیں لیکن وہ بیمار کب تھی ..... گھر والوں سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس شبد نہیں تھے ۔بس وہ ان کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتی رہی ۔

"دوبا جو ہی بھی ! جسم پر ہلدی کا داغ تو لگ جائے گا۔" دادی ماں نے گویا اسے سہاگن بنا کر مرنے سے پہلے سکھ کا سانس لیا ۔

"اور کیا ــــ ! ماں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی "کسی طرح ایک بار مانگ میں سیندور رچ جائے "

"ساڑی نہیں ماں ــــ شلوار پہناؤ ــــ" پرکھا نے سمجھا دیا "شلوار کے گھیر میں دبلا پن چھپ جائے گا ۔"

"سفید رنگ کا ڈریس پہنو ــــ" کامنا نے گویا حکم دیا ــــ

"گردن کوتاہ ہے اس لئے اونچا جوڑا باندھو ــــ" پڑوسن نے بھی گویا حق ہمسائگی ادا کیا ــــ

"پیشانی سپاٹ ہے ماتھے پر بندیا چپکا دو ــــ" دادی ماں نے بھی اپنا فرض ادا کیا ۔

"نہیں نتھنی نہیں ــــ !" ماں گڑبڑا کر بولی "ناک چپٹی ہے اس لئے لونگ مناسب رہے گی ۔"

غرض جس نے جو کہا اس نے وہ کیا ــــ بے چون و چرا کئے ــــ لیکن ــــ

وہ پھر رد کر دی گئی ــــ

آدھا درجن بچوں کے باپ کے لئے بھی ــــ

بابل کے انگنا کی دھول میں اس کے وجود کا پھول پتی پتی ہو کر بکھر گیا ــــ

جیسے کوئی ضدی بچہ اپنا گھروندہ اپنے ہاتھوں توڑتا ہے سپنا نے بھی اسی طرح اپنے زیورات نئے کپڑے بال سب نوچ پھینکے ــــ دو دن تک وہ اپنے کمرے کے باہر نہیں نکلی ۔

عمر بھر ناکامی اور جنم جنم کی بدصورتی پر ماتم کرنے کے لئے یہ دو دن کافی تھے ۔

"بھگوان نے میرے ساتھ کیوں یہ انیائے کیا ؟ احساس کا زہر پی کر وہ اک دم دش کنیا ہو گئی ۔

تیسرے دن وہ اک عزم کے ساتھ بستر سے اٹھ بیٹھی ۔ اپنی جوان امنگوں کے مرقد میں عزم دیا جلانے ــــ طوفان گذر چکا تھا ــــ

وہ آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہو گئی ۔
میں زندہ رہوں گی ۔۔۔۔ کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے ۔۔۔۔۔
"پھر وہ پتاجی کے پاس پہنچی ۔۔۔۔ اپنا فیصلہ سنانے کے لئے ــــ
"میں اب شادی نہیں کروں گی ــــ پڑھوں گی اور نوکری کروں گی ــــ"
"ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی ــــ" پتاجی، دادی ماں اور ماں
تینوں کی یہی رائے تھی ۔
لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی ۔ کسی کی ایک نہ چلنے دی ۔
سب کے ہاتھوں میں پکڑے اس کٹھ پتلی کی ڈور ٹوٹ چکی تھی ۔
پھر اس نے اپنے آپ کو سمیٹا ۔ نئے سرے سے اپنے مستقبل کی بنیاد رکھی ۔ ایسی پھرتی ایسا جوش، ایسی قوتِ عمل، جیسے کسی نے اس کے جسم میں پارہ بھر دیا ہو ــــ پتہ نہیں وہ واقعی ذہین تھی یا پھر کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس سے یہ تعلیمی مدارج طے کروا رہا تھا ۔
آخر کار اس نے تعلیم مکمل کر لی ۔ لیکن وہ جانتی تھی گورنمنٹ سروس کے لئے OVERAGE ہو چکی ہے ۔ اس لئے کمپنیوں کی سروس کے لئے جن ڈگریوں کی اہمیت اور ضرورت ہے اس نے ان ہی پر توجہ دی ۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ پر بھی عبور حاصل کیا ۔
اور ایک دن وہ اک بہت بڑی فرم میں اک چھوٹے سے عہدے پر فائز ہو گئی ــــ
اس کی بہنوں اور اس کے خاندان والوں نے حتیٰ کہ اس کی سہیلیوں نے بھی اس کی اس نوکری کا بہت مذاق اڑایا، لیکن وہ نروس نہ ہوئی ۔ عمل کی دنیا میں اس کے قدم نہ لڑکھڑائے ــــ اس کے بازؤں میں قوتِ پرواز تھی اس لئے وہ ترقی کرتے کرتے ایک دن اسی فرم کی چیف اکاؤنٹینٹ (CHIEF ACCOUNTANT) بن گئی ۔
اب اس کے پاس بنگلہ تھا ــــ اس کا اپنا ــــ
خوبصورت موٹر کار تھی ــــ
خدمت کے لئے نوکر چاکر تھے ۔
وہ بہنیں جو اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اب اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں ۔ دادی کے لئے بھی وہ منحوس ابھاگن بدصورت سپنا سے رانی بٹیا بن گئی ۔ ماں بھی اسے بڑے دلار سے میرا سپنا پکارنے لگیں ۔ اور پتاجی اسے ڈھیروں دعائیں دینے لگے ــــ ہزاروں سال زندہ رہنے کی ــــ

سپنا اپنی اسپیشل ڈیوٹی پر دوسرے شہر جا رہی تھی ــــ

اس نے اپنے لمبے بالوں کا جوڑا باندھا۔ اس میں سفید گلاب لگایا۔ سفید ساری باندھی آنکھوں پر بڑے رنگین شیشوں کا گاگلز چڑھایا۔ اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

جیسے سفید لبادے میں سنگ سیاہ کی مورتی۔

عورت پھر عورت ہے۔ اس کے سراپے کے کسی نہ کسی پہلو سے تھوڑا بہت حسن تو جھلکتا ہی ہے۔ چاہے وہ روپ رنگ کا ہو یا نسوانیت کا۔ یا پھر اقتدار کا۔

بلرام واڈکر بھی اس شہر کی اسی فرم میں سکریٹری INSPECTION تھا۔ سپنا کے آنے کی اطلاع ملتے ہی وہ اپنے عملے کی کارکردگی کی رپورٹ اس کے سامنے پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ اسے دیکھتے ہی سپنا چونک گئی ــــ

وہ اپنے جوانی بہار خوابوں کی سرشاریوں میں بدمست تھی یہی بلرام واڈکر اس کے شباب کی چوکھٹ پر پہلا خواہشمند بن کر آیا اور اسے اپنی بدصورتی کا احساس بخش کر چلتا بنا۔ تب سے آج تک اس کی انا اس کی خودداری زخمی پرندے کی طرح اس کے شریر کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہی تھی ــــ

واڈکر کو اپنے روبرو مودب انداز میں کھڑا پاکر سپنا کو مسرت ہوئی۔ واڈکر کے تئیں اپنی برتری کا احساس اس کے لئے بڑا خوش کن تھا۔ سپنا نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود فائلوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ بہت پہلے اپنی ایک سہیلی کے ذریعہ اسے معلوم ہوا تھا کہ واڈکر کی گرہستی برباد ہو گئی ہے ــــ

سپنا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ان دس سالوں میں بلرام پانچ بچوں کا باپ بن کر کھٹارا مشین ہو گیا تھا۔ بیوی دنیا سے چل بسی تھی۔ پانچ بچے اور زندگی کی گاڑی کا بوجھ اکیلے پہیے پر آ گیا تھا۔ عمر کا چکا اس کے وجود کو کچل کر اس طرح آگے بڑھ گیا کہ وہ وقت سے پہلے بوڑھا نظر آ رہا تھا۔
سپنا کو انجانی مسرت کا احساس ہوا اور وہ دل ہی دل میں گنگنانے لگی ے "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

کافی دیر تک سپنا فائلوں کی ورق گردانی کرتی رہی، لیکن ذہن کے پردے پہ ماضی کی فلم چلتی رہی۔ واڈکر کھانس کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کرتا رہا۔
بہت دیر بعد اس نے گاگلز اتار کر ٹیبل پر رکھا۔ بڑی تمکنت سے گلدان میں سے اک پھول

نکال کر اسے دیکھتی ہوئی سرد مہری سے بولی "تم جا سکتے ہو" اس نے واڈکر کو آپ کے بجائے تم کہا ــــ

نفرت اور حقارت کے درمیان انسان شائستہ کلامی بھول جاتا ہے - مگر واڈکر اسے سپنا کا اندازِ یگانت سمجھا - اور بڑی اپنائیت سے بولا - "آپ مجھے پہچان گئی ہیں نا ــ؟"

"تم کو ......" سپنا نے سر سے پیر تک اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا -

"جی - !" بلرام اپنی نکٹائی درست کرنے لگا ــــ

سپنا ہاتھ میں تھامے پھول کی ڈنٹھل گھمانے لگی - پھر پھول کو اس نے واپس گلدان میں رکھ دیا - اور کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتی ہوئی بولی "تیر چلانے والا عام طور پر یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کب، کہاں کس مقام پر نشانہ لگایا ہے ــــ لیکن نشانہ بننے والا اپنے تیر انداز کو کبھی نہیں بھولتا ــ"

اچانک پلٹ کر اس نے بلرام کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی "آپ کی بدولت ہی آج میں اس کرسی پر نظر آرہی ہوں ــ"

اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا -

"سچ سچ جی ــ" واڈکر احمق کی طرح ہنسا "آپ کو اس عہدے پر دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوں ــــ میں تو آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا.... آپ بالکل نہیں بدلیں" وہ گفتگو کے دوران کبھی بالوں پر ہاتھ گھماتا کبھی کالر برابر کرتا -

"وہی دس سال پہلے والی سپنا جی ہیں .... بائی گاڈ! بلکہ اب تو پہلے سے خوبصورت نظر آرہی ہیں - شورلی (SURELY)"

سپنا کو یوں لگا جیسے واڈکر نے اسے گالی دے دی ہے - اس کا دل چاہا وہ بھی اسے چانٹے گھونسے لگا کر یہاں سے نکال دے، لیکن اپنے اقداروں کی خاطر اس نے بڑے تحمل سے کام لیا - اپنی جگہ پر واپس آکر بیٹھ گئی - اور تبسم کے ساتھ کہا "تم کو دُم ہلانا بہت اچھا آتا ہے واڈکر ــ"

"ہی ہی ہی ...." وہ ہنسا "دم صرف مالک کے سامنے ہلائی جاتی ہے -"

"مگر میں نے تو دیکھا ہے پالتو کتے بھی کسی کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اسی کے سامنے دم ہلانے لگ جاتے ہیں - ان کی اسی عادت کی وجہ سے میں ان سے نفرت کرتی ہوں - دوسرے وہ کاٹ بھی کھاتے ہیں -"

"میڈم! وفادار کتے اپنے مالک پر جان بھی تو نثار کر دیتے ہیں۔" داڈ کر جیسے سچ مچ دم ہلا رہا ہو۔
"پھر بھی کتوں کو دھتکار کر ہی رکھنا چاہیے ــ" سپنا طنز سے بولی ــ
"سپنا جی!" داڈ کر بے تکلفی سے بولا "کتا اپنے مالک کی دھتکار پر کبھی خفا نہیں ہوتا۔"
سپنا کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ ناگواری سے بولی "مجھے دم ہلانا قطعی پسند نہیں۔ کام کی بات کرو۔"
"کام کی بات تو کر رہا ہوں میڈم!" سپنا برجستہ بولا ــ "سپنا جی!" اس سے کے
ب بڑی تمنا تھی "مجھے صرف اک بار موقع دے دیجئے .... کہ میں ......"
"شٹ اپ ــ" اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ پڑی۔ "یو کین گو ــ"
پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ کرسی پھینک کر کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف اشارہ کرتی
بولی ... گو ..... گو ..... گو آؤٹ ...."
وہ حلق سے چلائی۔ پورا فلور گرج اٹھا۔
پھر اس نے کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر سے شکایت کی۔
"سر! میں اس کمینے شخص کو اک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ یا تو آپ اسے نکلوایئے
یا میں اپنا استعفیٰ ...."
"نائیں نائیں!" کرسچن باس اس کی بات کاٹ کر بولا "تم کو نئیں جاتا مس سپنا جی۔
کا ٹم ویری ویری ریسپیکٹیبل پرسن (VERY RESPECTABLE PERSON)
کام اچھا ..... ٹم بہت اچھا۔ اِدر اُدر فرم میں ٹمارا باہوت تاریپھ (تعریف) جی! کمپنی کا
صاب لوگ ٹم سے باہوت کھوش ویری پرسن۔ ابی سڈنلی (SUDDENLY) ٹمارا
ن (PROMOTION) ہوٹا جی۔ ام ٹم کو CONGRATULATION دیتا۔
"تھینک یو سر!" سپنا مسکرا کر بولی۔
ام ٹم سے باہوت کھوش مس سپنا جی۔ ام ٹم کو باہوت پسند کرتا۔ یو آر اے ڈیوٹی فل
بیوٹی فل وومن (YOU ARE A DUTYFUL AND BEAUTIFUL WOMAN)
ـدے (گدھے) کو ام ابی SUSPEND کرتا جو زعفران مانگتا۔ تم جیسی سمپل،
ADMINISTRATIVE، اس کے نہیں بلکہ ہمارے لائق ہے ــ"
کالا بھجنگ بوڑھا حبشی کہہ رہا تھا ــ
سپنا کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ــ □

ترجمہ : عقیل احمد
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ایلن سیلیٹو سے ایک ملاقات

تعارف —— HALPERIN سدرن کیلیفورنیا کی یونیورسٹی میں انگلش کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مشہور ناولسٹ سیلیٹو سے یہ انٹرویو مارچ ۱۹۷۸ء میں لندن میں لیا جو ماڈرن فکشن اسٹڈیز کے ۱۹۷۹ء کے SUMMER کے شمارہ میں شایع ہوا۔

ایلن سیلیٹو (ALLAN SILITOE) ایک مشہور ناولسٹ ہے۔ اس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس کا نقطۂ نظر مارکسی ہے لیکن اس نقطۂ نظر سے سیلیٹو کے فن کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ویسے یہ اپنے عہد کا مشہور ناولسٹ ہے۔ اس کے دو ناول، گو ابتدائی ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ "SATURDAY NIGHT AND SUNDAY MORNING" جسے عام طور پر مزدور طبقہ کا ناول سمجھا جاتا ہے، دوسرا مشہور ناول "THE LONELINESS OF THE LONG-DISTANCE RUNNER" ہے۔

اپنے اس انٹرویو میں ناول نگار نے اپنے فنی کارناموں کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل پر بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو ممکن ہے کہ حرف آخر نہ ہو لیکن سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور اگر سوچنے کا موقع فراہم ہو جائے تو اسی کو غنیمت جانئے۔

ھلپرن : آپ کی دو شروع کی کتابیں "SATURDAY NIGHT & SUNDAY MORNING" اور "THE LONG-DISTANCE RUNNER" بیس سال پہلے لکھی گئی تھیں جب آپ بھی کوئی تیس سال کے تھے، اور اب آپ کی عمر غالباً پچاس سال ہوگی۔

سیلیٹو : جی ہاں میں نے پچاس سال پورے کر لئے ہیں۔

ط : وہ کتابیں آپ کو اب کیسی لگتی ہیں؟ ان کے موضوعات اور وہ معاشرہ جس کے بارے میں آپ نے لکھا، کیا آپ کو اب بھی اپیل کرتے ہیں؟ کیا آپ کی نظر میں دنیا کی حقیقی تصویر وہی ہے جو آپ نے ان کتابوں میں پیش کیا ہے؟

س : صحیح! یہ سوال قابل غور ہے۔ اس لئے کہ ان دنوں میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ میں دنیا کی کوئی حقیقی تصویر پیش کر رہا تھا۔ یا کہ زندگی کا نظریہ ترتیب دے رہا تھا۔ میں مجبور کا میں رہتا تھا اور کہانیاں اور ناول لکھتا یا لکھنے کے منصوبے بناتا رہتا۔ اس امید پر کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی تو ضرور شایع ہوگی۔ اور جو شایع ہوئیں وہ اتفاق سے یہی دو کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں میرا تجربہ ہیں اور جہاں تک پس منظر کی بات ہے تو یہ میری خود نوشت سوانح حیات نہیں ہے، لیکن زندگی میں میری جو حقیقت تھی اس سے ان کتابوں کا گہرا تعلق ہے۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ جب میں ان کتابوں کو دیکھتا ہوں تو کیا محسوس کرتا ہوں۔ اول تو یہ کہ میں انھیں پڑھتا ہی نہیں۔ میں نے انھیں دوبارہ پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں نے جب سے لکھا ہے ان پر سوچا ہی نہیں۔ بس اس وقت ایک صفحہ پڑھا اور سوچا "یقیناً یہ کتابیں بہت بری نہیں ہیں لیکن میں ان پر کچھ اور زیادہ محنت کر سکتا تھا"، لیکن عموماً میں اس پر غور نہیں کرتا کہ پہلے کیا لکھا ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو پڑھوں بھی تو میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ جو چیز شایع ہو چکی اب اس پر غور کرنا اور فیصلہ کرنا میرے لئے بیکار ہے۔

ط : SATURDAY NIGHT AND SUNDAY MORNING کے دیباچہ میں آپ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس ناول میں آپ نے اپنی حقیقی آواز کو پا لیا ہے۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

س : اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ میں نے کم از کم لکھنا سیکھ لیا تھا۔ واضح اور غیر مبہم طریقہ سے۔ اس سے پہلے میری تحریر واضح نہیں ہوتی تھی۔ کسی حد تک گنجلک تھی۔

ط : اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب پہلی مطبوعہ تصنیف تو تھی لیکن یہ آپ کی پہلی تحریر نہیں تھی۔ یہی مطلب ہوگا؟

س : آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے سات ناول لکھے تھے اور رفتہ رفتہ میری تحریر

میں وضاحت آرہی تھی، سوائے مختصر کہانیوں کے میری کہانیاں ایک معنی میں شروع سے ہی واضح ہوتی تھیں۔ SATURDAY NIGHT سے مجھ پر کھلا کہ اس کتاب میں وضاحت تو تھی ہی چاہے دوسری خوبیاں ہوں یا نہ ہوں۔ اور میں نے اپنے ذہن میں ایک آئیڈیا ضرور بنا رکھا تھا کہ اچھی انگریزی وہی ہے جو واضح اور صاف وشستہ ہو اور ایک شخص کو اس منزل کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اس میں پیچیدہ مسائل کو آسان زبان میں لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ یہ دوسری منزل ہے اور تیسری منزل کدھر لے جاتی ہے میں اب تک اس کے بارے میں لاعلم ہوں۔

ھ : آپ SATURDAY NIGHT کے پیش لفظ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس ناول کی زبردست کامیابی نے آپ کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اسے آپ بڑی کامیابی کیوں خیال کرتے ہیں؟

س : میں تو بس یہ سوچ سکتا ہوں کہ اس ناول میں اتنی ڈھیر ساری چیزیں نہیں تھیں کہ کوئی شخص اسے اٹھاتا اور اس میں اپنے سے قریب زندگی کو پڑھتا۔ اس سے پہلے بھی، ایسی کتابیں یقیناً لکھی گئی ہیں لیکن کبھی کبھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسی زندگی سے زیادہ قریب تھا یا اس حد تک قریب کہ اس ناول کو سیاسی یا دہشت زدہ بنائے بغیر میں ہر ایک کے لئے پسندیدہ بنا دیتا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ہمیشہ ہی لاکھوں مزدور طبقہ قاری موجود تھے اور اگر آپ دوسری یا تیسری دہائی یا اس سے پہلے دیکھیں تو کلاسک پڑھنے والوں کی بڑی تعداد نظر آئے گی لیکن ان کا معیار زیادہ اچھا نہیں تھا بلکہ یوں کہئے کہ ان کی ضیافت طبع کے لئے ایسے ناول نہیں تھے جنھیں میں اچھا کہہ سکوں اور جو ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرسکیں۔

ھ : دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی میں اگر لوگ ناول پڑھتے تھے تو غالباً وہ ڈکنس کے علاوہ اور لوگوں کو پڑھتے تھے؟

س : ہاں، وہ یقیناً پڑھنے کے شوقین تھے۔ میرا مطلب ہے کہ جنگ کے دنوں میں پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ PENGUIN BOOKS سے اچھی کتابیں بڑی تعداد میں شایع ہوئی تھیں۔

ھ : کیا آپ کا خیال ہے کہ جنگ نے نئی ریڈرشپ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے؟

س : ضروری نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے لوگوں کے پاس خالی وقت کافی تھا اور فوج کے لئے بھی تو کتابوں کی سپلائی ضروری تھی اور اگر آپ فوج میں بذاتِ خود نہیں ہیں

تو بھی ہر طرف انتظار کی شدت بڑھ جاتی ہے اور وقت کو بہر حال گزارنا ہے اس لئے کہ اگر جنگ کا تماشا آپ دیکھ رہے ہوں یا بمبار طیاروں کی زد سے بچنے کے لئے پناہ لئے ہوئے ہوں تو آپ سینما وغیرہ جا نہیں سکتے تو پھر آپ اپنے کو مشغول تو رکھیں گے ہی۔

ک : لیکن یہ مخصوص ناول ہی کیوں ؟ SATURDAY NIGHT کے علاوہ اور کوئی دوسرا ناول کیوں نہیں ؟

س : صحیح، میں صرف بنیادی خیال کی طرف لوٹ سکتا ہوں جس کے مطابق لوگوں کی مخصوص تعداد کے لیے یہ فنی کارنامہ تھا اور جو ان کی زندگی کے بیچ سے لکھا گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر وہ اسی لئے اعتماد کرتے ہوں کہ یہ ایک ایسے شخص نے لکھا تھا جو بیس سال تک ان کی زندگی جیتا رہا۔ میں ایسا نہیں کہوں گا اور نہ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص اس ناول کو لکھ ہی نہیں سکتا جس نے اس زندگی کا تجربہ ہی نہ کیا ہو۔ میرے خیال میں ایسا سوچنا ہلاکت خیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ زولا نے GERMINAL میں یہی کہا ہے، لیکن انگلستان میں یہ عام نہیں ہے۔ ادب میں تمام تر پرولتاری تحریک جنگ سے پہلے یا جنگ کے دوران ناکامیاب ہوئی۔ سوائے WALTER GREEN WOOD کے LOVE ON THE DOLE کے جو یقیناً ایک اچھا ناول تھا۔

ک : کیا آپ BLOOMS BURY کے کسی ناول نگار سے متاثر رہے ہیں ؟

س : میں نے ورجینیا وولف کو پڑھا ہے۔ اور دوسرے کون لوگ ہیں ؟

ک : فارسٹر۔

س : فارسٹر کو میں نے شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔ وہ بہت ہی اچھا رائٹر ہے۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ یقیناً وہ سب سے اچھا ہے۔

ک : کیا ورجینیا وولف سے بھی ؟

س : اوہ ہاں! کوئی فارسٹر کو نہیں چھو سکتا، میرا خیال ہے۔

ک : آپ اس کو ورجینیا وولف سے زیادہ کس وجہ سے پسند کرتے ہیں ؟

س : وہ تاثرات کے پیچھے جدو جہد نہیں کرتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ THE WAVES کا پڑھنا کتنا مشکل کام ہے۔ میں اس ناول کو پسند نہیں کرتا، بالکل نہیں۔

ک : واقعی اسے پسند کرنا مشکل ہے۔

س : بلکہ اس کی تمام کتابیں ایسی ہی ہیں۔میرا مطلب ہے کہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ورجینیا وولف کا پڑھنا پر لطف ہے۔اس کے شاعرانہ اسلوب کا کیا کہنا۔وہ اسٹائلسٹ ہے لیکن بغیر ہچکچاہٹ کے میں فارسٹر کو اس پر ترجیح دیتا ہوں۔وہ بنیادی طور پر کہانی سناتا ہے۔وہ بالآخر ناول نگار ہے اور میں کہانی کے لئے اس انسانی کمزوری کو اپنے اندر پاتا ہوں۔میں بنیادی طور پر یہ پسند کرتا ہوں کہ پڑھوں اور لوگوں کو سنا سکوں۔

ک : اور وہ کہانیاں نہیں سناتی ؟

س : وہ سناتی ضرور ہے لیکن پیچیدہ انداز میں۔اس طرح سے نہیں کہ قاری لطف اٹھا سکے اور آپ اسی لئے تو پڑھتے ہیں کہ آپ لطف لے سکیں، کھانے کی طرح۔

ک : اشرووڈ نے اپنی سوانح حیات میں یہ محسوس کیا تھا کہ بلومس بری کے لوگ لکھنے والوں کی نئی نسل سے کوئی اثر نہیں لیتے۔لارنس کا بھی یہی خیال تھا۔

س : یہ لوگ کسی حد تک بے تعلق ہو گئے تھے۔ویسے میں ان پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتا۔بحیثیت قلم کار کے ایک شخص کو جتنی مسرت ملنی چاہئے، ملے۔عام لوگوں کو کتنی مسرت ہوتی ہے اس کا مجھے یقین نہیں ہے۔آخری حقیقت یہی ہے کہ عام لوگ کوئی مسئلہ نہیں ہیں اور یہ آپ بھی جانتے ہیں۔آپ حقیقی معنوں میں عام لوگوں کے لیے نہیں لکھتے۔بنیادی طور پر آپ اپنے لئے لکھتے ہیں۔اگر عام لوگ یا ان میں سے کچھ آپ کی کتاب پسند کرتے ہیں تو بڑی اچھی بات ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ اپنی ذات کے ساتھ ابتدا کرتے ہیں۔اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی ذات کے ساتھ ختم بھی ہو جاتے ہیں۔اس لئے کہ کوئی شخص شہرت کی خاطر نہیں لکھ سکتا۔

ک : کیا آپ اس بات سے واقف ہیں کہ بحیثیت فن کار کے آپ کے ارتقاء میں کسی اور مصنف نے آپ کو متاثر کیا ہو ؟ یا آپ یہ سوچتے ہیں کہ اثر پذیری کا عمل اتنا نازک ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی ؟

س : اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ہم سبھی دوسرے کی کتابوں کے ذریعے ہی اپنا ایک مقام بناتے ہیں۔میرا مطلب ہے کہ بیس سال کی عمر سے پہلے میں نے کچھ نہیں پڑھا تھا۔اس لئے اگلے سات آٹھ سالوں میں مجھے جو کچھ پڑھنے کو ملا میں نے پڑھا۔

ک : یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ مجورکا میں تھے ؟

س : ہاں! شاید ہوسپٹل میں۔اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں ایک طرف ناول پڑھنا سیکھ رہا

تھا اور دوسری طرف لکھ بھی رہا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ ایک انوکھی صورت حال ہے اس لئے میرے ابتدائی ناول ـــــ خدا کا شکر ہے ـــــ جو شایع نہیں ہوئے، دوستوفسکی، لارنس، فارسٹر، ہکسلے وغیرہ کا چربہ ہیں۔ یہ سبھی میرے ناولوں میں گھس آئے تھے اور خوش قسمتی سے ویسے ہی نکل بھی گئے۔ میں ہر ایک شخص سے متاثر ہوا۔ ان میں سے ایک عظیم ناول نگار فیلڈنگ بھی تھا۔ اس سے آگے کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں نے پورے دس سال تک یہی کوشش کی کہ کسی طرح ان سب کے اثر سے باہر نکل جاؤں۔ دوسری طرف لکھنا بھی سیکھتا رہا۔ اس طرح میں نے اچھی انگریزی کا جو اثر ہو سکتا ہے، پالیا ـــــ واضح زبان لکھنا ـــــ اور یہ ـــــ مجھے ملا۔ پھر میں نے زبان کو کسی حد تک پیچیدہ بنا دیا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سب سے پہلے جو کرنے کی چیز ہے وہ یہی کہ آپ صاف وشستہ لکھنا سیکھیں۔

ک : ایک طرح کی جھاڑ پھونک ہوئی غالباً؟

س : ہاں۔ اپنے علاوہ ہر ایک کے اثر سے آزاد ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ آپ صرف اپنی ذات کا ہی بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔

ک : GRAVES کے علاوہ آپ کو کون سے لکھنے والے پسند ہیں؟ کس کو آپ سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

س : میرے لئے جواب دینا مشکل ہے۔ میری عادت عیب جوئی نہیں۔ ڈراما نگاروں میں جان اسبورن، ہال پنٹر، آرنلڈ ویسکر میرے لئے زیادہ اہم رہے ہیں اور شاعروں میں ٹڈ ہیوز اور کرسٹوفر لاگ۔ لیکن ناول نگار۔ بہت مشکل ہے۔ میرا مطلب ہے کہ، جب میں مشکل کہتا ہوں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں کوئی ناول اٹھاتا ہوں اور پہلے کے دس صفحے ایسے نہیں ہونے کہ جس کی نثر میرے شعور پر اثر انداز ہونے لگے تو پھر میں پرے رکھ دیتا ہوں۔

ک : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورا انڈا نہیں کھاتے۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہ خراب ہے؟

س : ہاں زندگی بڑی نہیں ہے۔

ک : کیا آپ کی نظر میں ہارڈی کے یہاں بے وجہ افسردگی ہے، یا آپ کو ہارڈی پسند ہے؟

س : مجھے ہارڈی پسند ہے اور کانریڈ بھی۔ بہت زیادہ۔ وہ میرا محبوب ناول نگار ہے۔ انگلستان کا سب سے بڑا ناول نگار POLE تھا۔ لیکن وہ بہت اچھا تھا۔ لاجواب۔

ک : پانچویں دہائی میں جب آپ کافی مشہور ہو چکے تھے، آپ کا نام، صحیح یا غلط، لکھنے والوں کے

اس گروہ کے ساتھ جوڑا جاتا تھا جسے " اینگری ینگ مین" کہا جاتا تھا۔ تو اپنے آپ کو ان میں سے ایک شمار کرتے ہیں، یا وہ قطعی مختلف شئے تھی ؟ کیا آپ اور اوسبورن اور جان برین اور دوسرے لوگ ایک دوسرے سے مختلف تھے یا آپ کے خیال میں آپ بھی وہی کر رہے تھے جو وہ لوگ کرتے تھے ؟

س : نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم سبھی قطعی مختلف کام کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ میں ۱۹۵۰ء سے پہلے انگلینڈ واپس نہیں آیا اور میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ یوں تو میں نے کچھ چیزیں پڑھی تھیں لیکن کسی کو جانتا نہیں تھا۔ پھر مجبور کا میں کتابیں تو کتابیں اخبار بھی پڑھنے کو نہیں ملتے تھے۔ اس لئے یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ سبھی اپنے محدود دائروں میں گھرے ہوئے تھے۔ مجھے "اینگری ینگ مین" کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

ک : کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ کے ناولوں کی اشاعت اس وقت اتفاقیہ تھی کہ دوسرے لوگ بھی ایسی چیزیں لکھ رہے تھے جس میں مڈل کلاس کی قدروں پر حملے کئے گئے تھے ؟

س : میرا خیال یہی ہے۔ لیکن میں نے قدروں کو جان بوجھ کر نشانہ نہیں بنایا۔ میں تو بس ایک ناول لکھ رہا تھا۔ ایک ایسے گنوار نوجوان کے بارے میں جو ایک کارخانے کا ملازم ہے، کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے۔

ک : ایسا کہا جاتا ہے کہ آپ دوسروں سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ آپ مزدور طبقہ کی زندگی پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں اور مڈل کلاس کی برائیوں پر کم۔ جب کہ برین اور اوسبورن وغیرہ بورژوا طبقہ پر تنقید کرتے ہیں۔ کیا ایسا سوچنا صحیح ہے ؟

س : جان برین حقیقت میں کسی چیز سے بحث نہیں کرتا ROOM AT THE TOP میں البتہ بنیادی تنقید ملتی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ ویسے آپ جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھا ناول نگار ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر بس ایک نشانہ کے ناول نگار ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ناول تو اب بھی لکھ رہے ہیں لیکن انھوں نے ایک ایک ناول لکھے —— اور بس۔

ک : آپ کا کیا خیال ہے کہ "اینگری ینگ مین" واقعی اینگری نہیں تھے۔ یہ محض لوگوں کا واہمہ تھا کہ لوگوں نے ان کو ایک علیحدہ گروہ کا نام دے دیا تھا ؟

س : میں نے اس "اینگری ینگ مین" جیسی چیز کے لئے کبھی نہیں سوچا۔ میرا خیال ہے کہ یہ قطعی طور پر کسی اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔

ک : پھر یہ کہاں سے آ دھمکا ہے ؟

س : یہ محض صحافیانہ ہتھکنڈا تھا۔ کوئی شخص اسے سنجیدگی سے نہیں لیتا، لیکن جیسا کہ لوگ اس طرح کے ہتھکنڈوں کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں اس سے ان کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ لوگوں پر اس طرح کے نام چسپاں کر دیتے ہیں تاکہ وہ بے ضرر سمجھ لئے جائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ "اوسبورن" دھماکہ خیز تھا۔ اینگری نہیں تھا۔ آخر اینگر ہے کیا ؟ لکھنے والوں کے لئے کوئی کار آمد شئے تو ہے نہیں۔

ک : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود کبھی ناراض نہیں ہوتے ؟

س : شدید طور پر لیکن کبھی کبھی

ک : اپنے ابتدائی ناولوں میں آپ نے دنیا کو رہنے کے ناقابل جگہ قرار دیا ہے۔ SATURDAY NIGHT میں آرتھر کہتا ہے کہ وہ دنیا کی گوشمالی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ اسے پریشان کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اور اسی ناول میں دنیا کے لئے ایک محاورہ "دشمن کائنات" کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کے لئے جنگل کی امیجری استعمال کی گئی ہے اور ناول ہم لوگوں سے خطاب کرتا ہے کہ "تم زندہ رہوگے اگر تم کمزور نہیں ہو" اور یہ کہ دنیا میں کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ کیا یہ چیزیں اس بات کا اشارہ نہیں کرتیں کہ، غصہ نہ سہی، کم از کم احتیاط ضروری ہے۔

س : یہ ایک سوال ہے جسے سامنے آنا چاہئے اور اکثر آتا ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ : اگر آپ کسی شخص کے بارے میں لکھتے ہیں اور اس کی زبان سے وہ سارے تصورات، فلسفے اگلواتے ہیں جو اس نے پیدائش سے لے کر آج تک سمجھا اور برتا ہے، اس لئے کہ وہ پیدائشی طور پر مخصوص اور انوکھی صورت حال سے دوچار ہے، اور آپ ناول کی مخصوص صورت حال میں اسے رکھ کر وہ ساری باتیں اس سے کہلواتے ہیں تو کیا اس کا مطلب ہے کہ لکھنے والا بھی وہی زندگی جی رہا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں، یہ محض تخیل کا عمل تھا اس لئے کہ میں اس وقت کارخانے میں ملازم نہیں تھا۔ لیکن آپ کسی شخص کے بارے میں بغیر امیجنیشن کے ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے۔ میں اس کردار کو نہیں جانتا اور نہ میں کبھی اس سے ملا۔ البتہ میں نے تخیل کا استعمال کیا اور ادھر ادھر سے جوڑ کر میں نے اس کردار کی تخلیق کی۔ کچھ چیزیں خود سے لیں، خواہ دس فیصد ہی ہو۔ بہت سی باتیں اپنے حافظہ اور دوسرے لوگوں سے لیں۔ اس طرح میں نے

اس کردار کو مکمل کیا، ایک پرند کی طرح جو اپنا گھونسلہ بناتا ہے تنکا تنکا جمع کر کے۔

ط : میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ کردار جو کچھ کہتا یا سوچتا ہے اسے لکھنے والے کے احساسات سمجھنا معاملہ کو پیچیدہ بنانا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ فن کار انتخاب کرتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے؟ جیسا کہ ہارڈی نے کہا تھا کہ "آرٹ پیٹرن ہے" فن انتخاب کا نام ہے اور فن کار کے سامنے ڈھیر ساری چیزیں بکھری شکل میں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے لئے کچھ ضروری چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے کام کی ہوتی ہیں۔

س : جی ہاں تمام چیزیں فن کار اپنے ٹیلی اسکوپ یا دوربین سے دیکھتا ہے۔

ط : تو کیا آپ ذاتی طور پر دنیا کو ایسا نہیں پاتے جو رہنے کے قابل جگہ نہ ہو' دشمن کائنات' ایک ایسی کائنات کہ جہاں چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے کندھوں پر نظر رکھنی چاہئے؟

س : جی ہاں۔ میں ایسا سمجھتا ہوں لیکن اس حد تک نہیں۔ یہ سب میرا تخیل تھا۔ حقیقی دنیا میں ہر کوئی نہیں سوچتا ہے کہ وہ اس قدر محتاط رہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی پرورش آسائشوں میں ہوئی ہو، آپ کو مشکل دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو، پھر بھی اگر آپ نیو یارک شہر یا لندن کے کسی حصے میں رہیں تو آپ کے لئے احتیاط ضروری ہے۔ یہ کوئی مخصوص فلسفہ نہیں ہے جسے فیکٹری ملازم نے پیش کیا ہے۔ یہ تو ایسا فلسفہ ہے کہ اگر آپ دنیا میں رہتے ہیں تو رکھنا ہی پڑے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اس ناول کو بہت زیادہ پسند کیا گو کہ وہ کسی فیکٹری کے ملازم نہیں تھے۔ انھوں نے آرتھر کے رویوں کو سمجھا اور تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس کے رویے آفاقی تھے۔

ط : کیا آپ نے دنیا کو کبھی آرتھر کی نگاہ سے دیکھا ہے؟

س : جب میں کارخانے میں ملازم تھا تو میں نے بہت حد تک اسی طرح دیکھا لیکن پورے طور پر نہیں۔ میں نے اپنے ان احساسات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جو مجھے ملازمت کے دوران حاصل ہوئے اور ان احساسات کو میں نے آرتھر کے کردار میں جاگزیں کر دیا۔ اس لئے کہ کھلی اور خطرناک زندگی گزار رہا تھا لیکن آپ مجھے ان لوگوں سے علیحدہ نہیں کر سکتے جن کے بارے میں میں لکھتا ہوں۔ میرے افسانوی کردار میں آپ کو میرے ذاتی تجربوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ جس زندگی میں، حفاظت اور احتیاط، کامل ضروری ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے۔

ط : آپ کے ناولوں میں اکثر مزدور طبقوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان جنگ کی سی محاذ آرائی ملتی ہے۔ آرتھر اپنی زندگی کو جنگ تصور کرتا ہے۔ آپ کے دوسرے ناول THE LONELINESS OF THE LONG DISTANCE RUNNER کا ہیرو کہتا ہے کہ "میرے اور ان لوگوں کے درمیان جنگ ہے، میں ان میں سے ایک میں پیدا ہوا۔" یعنی کہ جنگ میں تو کیا یہ طبقاتی جنگ ہے یا کہ محض زندہ رہنے کی جدو جہد یا ...

س : اس مخصوص ناول میں کوئی طبقاتی جنگ نہیں ہے۔ وہ خود اپنے ہی طبقہ کے لوگوں سے الجھا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ میں طبقہ پر یقین کبھی نہیں رکھتا۔ میں ا سے ی تک افراد پر یقین رکھتا ہوں۔

ط : آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ دنیا میں طبقاتی تقسیم ہو یا آپ طبقہ کے وجود کے منکر ہیں ؟

س : میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ طبقاتی تقسیم نہیں ہونی چاہئے۔ ویسے اس کا وجود ہے چونکہ پیسہ کلاس پیدا کرتا ہے، جو کہ ظاہر ہے۔ لیکن بحیثیت قلم کار کے میں لوگوں کو طبقاتی پس منظر میں نہیں دیکھتا۔ آپ جانتے ہیں کہ مارکسی نظریہ میں طبقہ تجارت ہے۔ میں اس طریقہ سے نہیں دیکھتا، اس وقت بھی جب کہ میں کارخانے میں ملازم تھا۔ میں نے دھاندھلیاں دیکھی ہیں، میں نے لوگوں کو پیسے کے ساتھ اور پیسے کے بغیر بھی دیکھا ہے لیکن میں نے اپنے شعور میں انھیں کبھی طبقوں میں تقسیم نہیں کیا۔ میں صلاحیت اور فطانت میں یقین رکھتا ہوں، اپنے لئے راستہ خود ہموار کرنا چاہئے۔

ط : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سوشلسٹ کی جنت میں اپنا راستہ آپ بنانا ممکن ہے ؟

س : مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ سوشلسٹ کی جنت کدھر ہے۔

ط : یہ تو مسئلہ ہے۔

س : چوں کہ ان کا کوئی وجود نہیں ہے اس لئے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔

ط : کیا آج دنیا میں یہ ممکن ہے کہ صلاحیتوں کو تسلیم کیا جائے ؟

س : یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کسی غریب خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ کے پاس اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع مسدود ہیں، لیکن اگر آپ جذبہ رکھتے ہیں، آپ ذہین ہیں تو اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں وقت لگتا ہے

لیکن آپ منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور ماضی میں لوگوں نے ایسا کیا بھی ہے۔

ط : ہم فارسٹر کے بارے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کا مشہور مقولہ ہے کہ دنیا میں "صرف رابطہ" چاہئے تو کیا یہ ممکن ہے؟ کیا سیاسی، سماجی یا روحانی طور پر ممکن ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوسکیں یا یہ طبقاتی جنگ، یہ گیپ، لوگوں کے درمیان فاصلے ناگزیر ہیں؟ کیا اس کے بارے میں آپ سوچتے ہیں یا یہ سوال کبھی آپ کو پریشان کرتا ہے؟

س : میرا خیال ہے کہ اس کے لئے کوشش ہونی چاہئے لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاملات میں قسمت کو بڑا دخل ہے۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ چھین لینے اور بے دخل کر دینے کی دنیا ہے۔ ہم لوگوں نے کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں کیا ہے کہ جس سے پیسوں کی تقسیم برابر ہوسکے۔ ایک کے پاس زیادہ ہے تو دوسرے کے پاس کم تو چھیننے جھپٹنے کا عمل جاری رہے گا۔ یہ تو انسانی فطرت ہے۔

ط : دولت کی دوبارہ تقسیم کیا اس مسئلہ کا حل ہوسکتی ہے؟

س : نہیں، ویسے تو یہ بڑا ہی عمدہ خیال ہے، لیکن اگر آپ دولت کی ازسرِنو تقسیم کرتے ہیں تو ایسے لوگ آپ کو ملیں گے جو زیادہ چاہیں گے۔ اور جب تک آپ دولت کی مساویانہ تقسیم نہ کریں، خواہ ان لوگوں کے لئے آپ کو طاقت کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے جو زیادہ کے خواہاں ہیں، تو بات نہیں بنے گی اور یہ تقریباً ناممکن ہے اس لئے دولت کی مساویانہ تقسیم بھی تقریباً ناممکن ہے۔

ط : کیا ایسا خیال کرنا قنوطیت نہیں ہے؟

س : یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ایسی صورت میں حقیقت پسندی کا دوسرا نام قنوطیت ہو۔

ط : آپ کا یہ EQUATION درست ہے لیکن آپ ایسا کیوں خیال کرتے ہیں؟

س : اس لئے کہ آئیڈیلزم کے خلاف جاتا ہے جسے ہر شخص اپنانا چاہتا ہے۔

ط : لیکن کیا آپ ایک ہی وقت میں آئیڈیلسٹ اور ریلسٹ دونوں نہیں ہوسکتے۔ جارج ایلیٹ کی طرح؟

س : کیوں نہیں۔ ایک طرح سے تمام لکھنے والے ایسے ہی ہیں ورنہ وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے۔ پھر یہ کہ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ اس لئے کہ لکھنے والا کوئی واحد شے نہیں ہوتا۔ وہ سینکڑوں

چیزیں بیک وقت ہوتا ہے ، وہ اتنی چیزیں ہو سکتا ہے جتنے کہ آسمان میں ستارے ہیں۔ آپ کبھی اپنے ایک شخص میں کتنے اشخاص کو چھپائے رکھتے ہیں۔

ط : کیا آپ موروثی دولت کے مخالف ہیں ؟

س : میں اس موروثی جائداد کا مخالف ہوں جو آپ کو دوسروں پر طاقت ور بناتا ہے۔ یعنی کہ اگر کوئی ورثہ میں ہزاروں روپے پاتا ہے اور اس سے عیش کرتا ہے ، دوسروں کے لئے کارآمد نہیں ہے یا کہ اس کے ذریعے طاقت حاصل کرتا ہے تو یہ غلط ہے۔

ط : کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ آپ کے ناولوں میں مزدور طبقہ کو اپنے مالکوں کے مقابلہ میں زیادہ شرپسند قرار دیا گیا ہے گو کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔ اور یہ کہ مزدوروں کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنے مالکوں کو اس سے کہیں زیادہ سمجھنے کی کوشش کریں جتنا کہ ان کے مالک انھیں سمجھتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا یہ صحیح بیان ہے ؟

س : میں مزدور طبقہ کی گفتگو نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف افراد کی گفتگو کر سکتا ہوں۔ مخصوص افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو اپنے حکمرانوں کو سمجھنے کی کوشش کریں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی ایسا ہتھیار ان کے ہاتھ لگ جائے جس سے موقع پڑنے پر وہ الٹا وار کر سکیں اور ایسے لوگ لٹاڑی ہیں۔ وہ بدقسمتی سے غیر موثر ہتھیار ہیں۔ جب تک آپ کے پاس بندوق نہ ہو تو آپ ان چیزوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے اور دس میں سے نو معاملوں میں اگر آپ کے پاس بندوق ہوگی تو ان کے پاس مشین گن ہوگی۔ یہ تو اصل میں تصادم ہے اور ہر تصادم کا انجام المناک ہے اس لئے کہ ہر جنگ میں نقصان صرف ایک نہیں اٹھاتا ، دونوں ہی اٹھاتے ہیں۔ اس لئے پرامن راستہ "صرف رابطہ" کا رہ جاتا ہے۔ اور رابطہ پیدا کرنا جنگ کی صورت میں مشکل امر ہے۔

ط : کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے کہ دونوں کے نقصان اٹھانے سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جیتنے والا کم نقصان اٹھائے ؟

س : یہ تو جنگ کی صورتِ حال پر منحصر ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ نقصان دونوں ہی اٹھاتے ہیں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ جنگ میں شریک دونوں اطراف نہ صرف اپنے اخلاقی قدروں کو گنوا بیٹھتے ہیں جو بہتر انسانیت کے لئے ضروری ہیں بلکہ مادی طور پر بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔ انھیں اپنے ذرائع کو صرف میں لانا پڑتا ہے۔ جس کا بوجھ وہ برداشت نہیں کر سکتے ــــ

جو بہرحال بے فائدہ ہے۔

ک : کیا زندگی میں تصادم سے بچا جا سکتا ہے ؟ کیا تصادم بقا کے لئے ضروری نہیں ؟

س : ضروری ہے، تبھی تو میں اسے المناک کہتا ہوں۔

ک : یہ یقیناً قنوطی نقطۂ نظر ہے ؟

س : ہاں، کیوں نہیں۔

ک : اگر ہم تصادم کے لئے برے کہے جاتے ہیں۔ اور تصادم ٹریجک شئے ہے اور اس کا کوئی بدل بھی نہیں ہے تو پھر ہم سب ٹریجڈی کی زندگی گزار رہے ہیں ؟

س : کیوں نہیں، ممکن ہے کہ ہم لوگ المناک زندگی گزارتے ہوں، اس طرح سے کہ زندگی کا آخری انجام موت ہے۔ ایک طرف وہ تصادم ہے جو انسانی ذرائع کا زیاں ہے تو دوسری طرف تخلیقی تصادمات ہیں جو اس مسئلہ کو دوسری حیثیت دے دیتا ہے، جس سے آپ اس لائق ہوتے ہیں کہ آپ بہتر زندگی پیدا کر سکیں۔ یہاں آپ کی جنگ دوسرے محاذ پر ہے۔ کام کرنا بھی دراصل تصادم ہی ہے اور یہ اچھی چیز ہے۔ ہم میں تصادم کا احساس پیدائش کے وقت سے ہی ہوتا ہے۔ آپ رحم مادر سے نکلتے ہی ہوا سے ٹکراتے ہیں اور آپ پوری زندگی اس ٹکراؤ سے بچ نہیں سکتے۔ آپ آخر عمر میں موت سے متصادم ہوتے ہیں۔

ک : کیا آپ بحیثیت فن کار کے متصادم ہوتے ہیں ؟ کیا تصادم فن کے لئے ضروری ہے ؟

س : بالکل ـــــ اس وقت بھی جب آپ صرف ایک جملہ لکھتے ہیں۔ فضا میں تصادم کا احساس پایا جاتا ہے۔ اور جب آپ ایک ناول لکھتے ہیں تو ایک یا دو سال تک آپ کا خون پسینہ بن کر بہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ آپ لاشئے سے شئے بنانے میں مشغول رہتے ہیں۔

ک : آپ کا یہ تصادم داخلی ہے یا خارجی ؟

س : اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر فن کار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ان سوالات کو حل کرے جو بنیادی طور پر اس کے اندرون میں اٹھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک فن کار کے اتنے ہی چہرے ہوتے ہیں جتنے کہ اس کے ناول کے کردار ہوتے ہیں۔ میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ ایک فن کار خالی الذہن پیدا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ خالی الذہن نہیں رہ سکتا، اسی لئے وہ اپنے ذہن میں کرداروں کو بھرنا شروع کر دیتا ہے اور جب وہ کوئی کردار تخلیق کرتا ہے تو ذہن کے دوسرے سارے کردار بول اٹھتے ہیں۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ، الوداع الوداع"۔ پھر آپ

دوسرے کرداروں کو تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے آپ کا ذہن کرداروں سے بھرا ہوا ہونا چاہئے۔

ط : آپ کے ناولوں میں جنگ پر بہت کچھ ہے۔ آپ آر۔ اے۔ ایف۔ میں رہے ہیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ کچھ ناولوں میں جنگ کو لغو اور مہمل کہا کہا گیا ہے اور یہ کہ قومی دفاع، حکومت کی سرزنش کرنا لغو اور فراڈ ہیں؟

س : میں نے اتنے الفاظ میں اتنا کچھ نہیں کہا ہے۔ میں نے اپنے ناولوں میں جنگ کو موضوع بنایا ہے۔ میرا تازہ ترین ناول THE WIDOWER'S SON جنگ سے ہی متعلق ہے بلکہ ایک فوجی آفیسر کی کہانی ہے۔ وہ یتیم پیدا ہوتا ہے اور وہ فاشزم کے خلاف کھلی جنگ میں حصہ لیتا ہے اور وہ نہیں سوچتا کہ جنگ غیر ضروری شے ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں سوچتا۔ میں بھی نہیں۔ میں جنگ کو غیر ضروری نہیں سمجھتا۔ میری پرورش جنگ عظیم کے سایہ میں ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم۔ پھر میرا تمام بچپن دوسری جنگ کے خطرہ میں گزرا۔ پھر دوسری جنگ کے دوران میں جوان ہوا۔ ۱۴ سے ۱۸ سال کی عمر تک جب میں کارخانہ میں ملازم تھا۔ میں ایک نیم فوجی تنظیم میں شریک تھا اور امید کرتا تھا کہ اگر جنگ ختم نہ ہوئی تو میں جرمنی پر بم گراتے ہوئے اپنے کو ختم کرلوں گا۔ یہ میری آرزو تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں ہوا باز ہوتا اور بے وقوف لوگوں پر بم باری کرتا۔ پھر جرمنی کی جنگ ختم ہوگئی اور میں والنٹیر بن گیا۔ جب میں ۱۷ سال کا ہوا تو میں نے پائلٹ کی ٹریننگ کا ٹیسٹ پاس کر لیا اور سوچنے لگا کہ میں جاپان پر بم برساؤں گا۔ وہ جنگ بھی ختم ہوگئی۔ میں نے آر۔ اے۔ ایف میں ۴ سال گزارے۔ اس لئے کہ میں والنٹیر تھا۔ آخر میں مجھے ٹی۔ بی ہوگئی۔ جن دنوں میں ملایا کے جنگلوں میں خاک چھان رہا تھا تب مجھے ائرفورس سے پنشن مل گئی اور ۳۰ سال کی عمر میں میرا ناول شائع ہوا۔ اس طرح سے یہ ایک اچھی چیز تھی جو واقع ہوئی۔ اگر آپ خوش نصیب ہیں تو کبھی کبھی مصیبت اٹھانے کے بعد آپ کو کوئی اچھی چیز ملتی ہے۔ جنگ میں مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ جنگ کے دنوں میں جب میں بچہ تھا اور نوجوان ہوا تو جنگ کی خبریں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میری پہلی کتاب جنگ کی تاریخ پر مبنی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لیکن جنگ میں میری دلچسپی تاریخی اور سیاسی نقطہ نظر سے ہے۔ میں نے ہمیشہ ہی فوجی تاریخ پڑھی ہے۔ کیا میں اس سے کچھ سیکھ سکا ہوں، یہ میں نہیں جانتا۔ اگر اس نے مجھے کچھ سکھایا ہوتا تو وہ غلط بات ہی ہوتی لیکن پھر بھی میں

اس میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میرا پچھلا ناول جنگ سے متعلق ہے جس میں میں نے جنگ اور محبت کو EQUATE کیا ہے اگر کوئی ایسا کرسکتا ہے۔

ک : THE RAGMAN'S DAUGHTER میں ہیرو ایک جگہ شکایت کرتا ہے کہ "خدا نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے"۔ کیا آپ مذہب کا کوئی مختلف نظریہ رکھتے ہیں؟

س : اس کا مطلب ممکن ہے یہ ہو کہ عیسائیت نے چھرا گھونپا ہے۔ میں عیسائیت میں یقین نہیں رکھتا۔ میں عیسائی نہیں ہوں۔ لیکن میں بائبل کے فرمان اور اس سماجی تنظیم پر یقین رکھتا ہوں جو اس مبارک صحیفہ میں ملتا ہے۔ کیا میں خدا کے وجود کا قائل ہوں؟ میرا خیال ہے کہ ہوں۔ میں اس کے لئے لڑنے مرنے پر آمادہ نہیں ہوں لیکن میں اس بنیادی انسانی تنظیم پر یقین رکھتا ہوں جو عام لوگوں کا خیال رکھتی ہے اور عام لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا خیال رکھیں ــــ یعنی ایک سماجی مفاہمت ــــ یا یوں کہئے کہ ایسی محبت اور بھائی چارگی۔ خدا جانتا ہے کہ میری زندگی ایسی نہیں گزری لیکن میری خواہش ہوگی کہ میرا اگلا قدم اسی راستے پر ہو۔

ک : کیا آپ اب بھی زندگی کو "LONG DISTANCE RUN" تسلیم کرتے ہیں یا یہ ممکن ہے کہ کسی مرحلہ پر زندگی دھیمی ہو جائے؟

س : میرا خیال یہ ہے کہ میں اب بھی بھاگ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کس سے۔ غالباً خالی پن سے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

ک : کیا یہ صحیح ہوگا کہ آپ کے نظریۂ حیات کا موازنہ ایلیٹ کے نظریۂ حیات سے کیا جائے جو کہ "ویسٹ لینڈ" میں ہے۔

س : نہیں نہیں۔ میں ایلیٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ ویسٹ لینڈ کو میں نہیں جانتا۔ اس میں نغمگی بہت ہے لیکن میں کبھی 'ویسٹ لینڈ' میں نہیں گیا بلکہ اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اس کی لے تیز ہے، اس حد تک ٹھیک ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جب تک لکھنے والے لکھ رہے ہیں ہم لوگ روحانی عہد میں ہیں نہ کہ "ویسٹ لینڈ" عہد میں۔

ک : کیا آپ اپنے آپ کو MANNERS کا ناولسٹ نہیں سمجھتے؟

س : میں ایسا نہیں سوچتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو میرے لئے عمدہ بات ہوتی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس حد تک اچھا یا گہرا نہیں ہوں۔ میں زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوں۔

ط : کیا بحیثیت ناول نگار کے آپ خود کو عظیم تصور نہیں کرتے ؟

س : میں اپنی قدر وقیمت کا اندازہ نہیں لگاتا۔ یہ غیر ممکن بھی ہے۔ میں اپنے مخصوص انفرادی راستے پر گامزن ہوں۔ اس سے آگے کچھ نہیں جانتا۔ اس سے آگے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں یہ ہوں یا وہ۔ □

غزلیں

بدر منیر الدین بدر

دن کو ہم نے جلتے دیکھا رات ٹھٹھرتے دیکھی
سجل رتوں کی تلخ قیامت خوب گزرتے دیکھی
جسم کی کھیتی پر نت برسیں زخموں کی برساتیں
لیکن کب دنیا والوں نے بیخ ابھرتے دیکھی
لمحہ لمحہ شریانوں میں اتری جب بے چینی
دل نے اپنی دھڑکن بھی کچھ ڈرتے ڈرتے دیکھی
جن کو دیکھ کے ہو جاتے تھے موسم بھی مستانے
آج کیوں ان آنکھوں کی شوخی آہیں بھرتے دیکھی
آنکھوں کے پھولوں پر شبنم بن کر بکھرے آنسو
جب برسوں کی چاہت ہم نے پل میں مرتے دیکھی
من میں آگ لگائی جس نے تن کو کر کے بھیگا
بارش کے سنگ اب کے ایسی پیاس اترتے دیکھی
کس کا رستہ دیکھ رہے ہیں دل نگری کے باسی
ہم نے تو جیون بھر اک اک خواہش مرتے دیکھی

کمال جعفری
فلیٹ نمبر ۴۹، آل انڈیا ریڈیو، ہاسٹل
کرزن روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

خوشبو گلاب بادِ صبا ڈھونڈتے رہو
صحنِ چمن میں شانِ خدا ڈھونڈتے رہو
جو مانگنا تھا مانگ چکا میں بصد خلوص
ہونٹوں پہ میرے حرفِ دعا ڈھونڈتے رہو
مجھ کو مری برائی کی مل جائے گی سزا
تم اپنی نیکیوں کا صلہ ڈھونڈتے رہو
ہے بھیڑ رہزنوں کی بہت راہ میں مگر
سنجیدگی سے راہنما ڈھونڈتے رہو
مانا کہ سخت دھوپ ہے، دشوار ہے سفر
پیڑوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوا ڈھونڈتے رہو
برکت سے جس کی چہرۂ انساں سنور سکے
دھرتی پہ وہ سکوں کی فضا ڈھونڈتے رہو
تم خانۂ کمال میں آئے ہو شکریہ
دامن دریدہ چاک قبا ڈھونڈتے رہو

یاسمین حزیں

رہ گیروں پر بھونکنے لگے گلیوں کے آوارہ کتے
اوپر سے لٹکا کر رسّی نکلیں گے ہم آج کنویں سے
گھر کی دیواریں اونچی ہیں تازہ ہوا کیسے یاں آئے
بے شک اپنی ہی غلطی تھی سانپوں کو ہم انساں سمجھے
ہم بھی اپنے آپ کو ڈھک لیں
پردہ پوش ہیں سارے چہرے

ڈاکٹر سید حامد حسین

عہدِ حاضر اور نثری پیرایۂ اظہار

ہمارا عہد، نثر کا عہد ہے اور یہ صورت حال ایک لمبے تاریخی عمل اور انسان کے ذہنی ارتقا سے ساتھ ساتھ جدید دور کی اظہاری ضرورتوں کا نتیجہ ہے۔

نثر لفظی اظہار کا سب سے زیادہ سادہ اور راست پیرایہ ہے اور اسی لئے اس نے اظہار سے تعلق رکھنے والی انسان کی بنیادی ضرورتوں کے لئے ایک ناگزیر حد تک اہم اور مفید کردار ادا کیا ہے۔ یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ اظہار کے معاملے میں انسان کا اولین تجربہ نثر کی ہی ابتدائی شکل میں ہوا ہوگا۔ ضرورتوں کے اظہار، تجربات کے بیان اور خبر و اطلاع کے لئے قدیم ترین انسان نے اسی طرح نثر کے پیرائے کو مفید اور کارآمد پایا ہوگا جس طرح بچہ اپنے شعور کی ابتدائی منزلوں میں نثری اظہار کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن جس طرح اس کے باوجود کہ انسانی افعال کا ایک بہت بڑا حصہ وقتی تحریکات کا ردعمل یا فوری تقاضوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بعض افعال اپنی قدر و قیمت کی بنا پر اس کے ضرورت مند ہوتے ہیں کہ انھیں فوراً فراموش نہ کر دیا جائے بلکہ مستقبل کے لئے بھی محفوظ رکھا جائے، اسی طرح اظہار کا کچھ حصہ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسے زیادہ پائدار اہمیت کا مالک سمجھا گیا ہے۔ دوام کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قدیم انسان کو خارجی وسائل سے تو بہت زیادہ مدد ملنے کے امکانات سامنے نہ تھے لیکن اس کے لئے اپنے جسمانی نظام سے اس نے ضرور کچھ معاونت حاصل کی۔ لفظ و بیان کو محفوظ رکھنے کا کام قدیم انسان نے اپنے حافظے سے لیا۔ لیکن انسانی ذہن سے یہ توقع تو نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ ہر قسم کے اظہار کو میکانکی طور پر یادداشت میں محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ اس کے لئے قدرتی طور پر ایک انتخاب کی ضرورت ہوئی جس کی بنیاد بیان کی معنوی اہمیت پر تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ انسانی تجربے نے یہ سکھایا کہ اظہار کی بعض اشکال جو کسی خاص ترتیب و تکرار پر مشتمل ہوں، حافظے کو زیادہ مدد پہنچاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ پیرایہ ظہور میں آیا جس نے ایک واضح شکل اختیار کرنے کے بعد نظم کا نام پایا۔

یہاں نظم (VERSE) اور شعر (POETRY) کا بنیادی فرق سمجھنا ضروری ہے۔ نظم اظہار

کے ایک ایسے پیرایہ کا نام ہے جس کی خصوصیات آہنگ، لے اور صوتی ترتیب و تکرار کا ایک مخصوص نظام ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک قسم کا صوتی و صوری نظام ہے جسے بنیادی طور پر ادائیگی کی سہولت اور یادداشت کو مدد پہنچانے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے۔ صوت و آہنگ کے توازن و تواتر سے ایک ایسی فضا تیار ہوتی ہے جو سلسلۂ اظہار کو ایک مخصوص نظام میں مرتب ہونے کی وجہ سے، ذہن کے لئے متوقع اور مقبول بنا کر پیش کرتی ہے اور اس پر ذہنی گرفت زیادہ آسان ہوتی ہے۔ لہذا نظم سے ہم اظہار کا ایک ایسا پیرایہ مراد لے سکتے ہیں جسے تاریخی اعتبار سے ذہن کی سہولت اور یادداشت کی معاونت کے لئے ایجاد کیا گیا۔ اس پیرائے میں کسی بھی قسم کا مواد پیش کیا جا سکتا ہے، جب کہ شعر سے ہم نظم کا ایک ایسا مخصوص انداز مراد لے سکتے ہیں جس میں ایک داخلی معنویت رکھنے والا مواد پیش کیا گیا ہو۔ شعر محض متوازن اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تاثرات و کیفیات کی موثر پیش کش، تخیل کی دلفریب کارفرمائی اور فکر و جذبے کو گرفت میں لینے کی اہلیت بھی ہوتی ہے۔ شعر کی شناخت اس معنوی اور تاثراتی ارتکاز سے مرتب ہوتی ہے جو فکر و احساس کے جزوی تاثرات کو اپنی بلیغ ایمائیت کے ذریعے ایک معنوی افق تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔

چنانچہ شعری اظہار، نثری اظہار سے مواد اور طریق عمل دونوں اعتبار سے مختلف ہے۔ شعر کا رجحان داخلیت کی جانب ہوتا ہے، جب کہ نثر کا میدان خارجی مسائل و موضوعات ہیں۔ شعر انکشافِ ذات اور عرفان حیات سے اعتبار حاصل کرتا ہے، جب کہ نثر فہم و شعور کے لئے حالات و واقعات کی گتھیاں سلجھانے کا کام کرتی ہے۔ شعر کا عمل تجربے کو چٹکی میں پکڑنے کا ہے، جب کہ نثر کا کام مسئلے کی تہیں کھول کر ذہن کی سطح پر پھیلا دینے کا ہے۔ چنانچہ شعر ایمائیت سے کام لیتا ہے اور ابہام اس کے لئے حسن کا کام دے سکتا ہے۔ جب کہ نثر وضاحت کو اپنا مقصد سمجھتی ہے اور بیان میں الجھاؤ اور ابہام اس کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔ شعر اور نثر اس طرح دو الگ الگ قسم کے ذہنی تجربوں کو پیش کرتے ہیں اور دو مختلف قسم کی شعوری ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

لیکن یہاں شعر (POETRY) سے نہیں نظم (VERSE) سے بحث ہے جسے نہ صرف شعری اظہار کے لئے ضروری سمجھا گیا بلکہ لفظی اظہار کی ابتدائی تاریخ میں اس کو اُن بیانات کے لئے بھی استعمال کیا گیا جن کے لئے عملی زندگی میں نثر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روزمرہ کے واقعات کے بیان کی طرح قدیم انسان عام حالات میں قصے کہانیوں کے لئے بھی نثر کا استعمال کرتا ہوگا۔ لیکن ایسی کہانیاں جو رفتہ رفتہ سماجی روایت کا حصہ بن گئیں اور جن کو ایک

نسل سے دوسری نسل کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کا عمل شروع ہوا تو ان کے لئے منظوم پیرایہ اختیار کیا گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان منظوم کہانیوں میں انسانی فطرت اور حیات و کائنات سے تعلق رکھنے والے ایسے موضوعات کے لئے جو ایک وسیع اور آفاقی معنویت رکھتے تھے، شعری عناصر بھی ترقی پاتے گئے اور آج رزمیہ داستانیں صرف بیانیہ فن کی ہی نہیں بلکہ شعری اظہار کی بھی قابلِ قدر مثالیں بن گئی ہیں۔ ان داستانوں کے لئے بہر حال منظوم پیرایہ ابتدائی عام بیانیہ اظہار کو حافظے میں بآسانی محفوظ رکھنے کی خاطر اختیار کیا گیا تھا۔ انسان کے شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے مذہب، اخلاق، طب، نجوم وغیرہ علوم اور سیاسی و معاشرتی مسائل پر غور و فکر کی نوبت آئی جس کے لئے بحث و مباحثے اور تبادلۂ خیال کے دوران ظاہر ہے کہ نثر کو استعمال کیا گیا ہوگا لیکن ان مسائل کو چٹکلوں، کلیوں، حکیمانہ اقوال اور بآسانی یاد ہو جانے والی تعریفات کی شکل میں پیش کرنے کے لئے نظم کا ہی پیرایہ اختیار کیا گیا۔ نثر نے فوری اظہار کی ضرورت کو یقیناً پورا کیا، لیکن اس کی افادیت وقتی اور عارضی رہی اور اسے اس وقت تک محفوظ رکھے جانے کا حق نہیں ملا، جب تک تحریر کا فن ایجاد نہ ہو گیا۔

فنِ تحریر کی ایجاد کے بعد انسان کو اپنے رسمی اور کاروباری اظہار کے لئے استعمال کی جانے والی نثر کو محفوظ کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ چنانچہ پتھروں، دھات کی تختیوں، چھال اور چمڑے وغیرہ پر اس نے نثری عبارتوں کا ریکارڈ چھوڑا ہے۔ لیکن یہ وسائل محدود اور محنت طلب تھے اور پھر خواندگی عام نہ تھی اور تحریری اظہار کو زیادہ وسیع دائرے میں رسائی حاصل کرنے کے مواقع بھی نہ تھے۔ چنانچہ زبانی طور پر حاصل کئے جانے والے علم کے لئے مواقع زیادہ تھے اور یادداشت ہی اس علم کو محفوظ رکھنے کا کارگر طریقہ تھا۔ لہٰذا یادداشت کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے علوم کی ترویج کے لئے، منظوم اظہار کو فوقیت حاصل رہی۔

صورت حال چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد بدلنا شروع ہوئی۔ پریس کی وجہ سے ابلاغ کے امکانات وسیع تر ہوئے اور ترسیل خیال و خبر کے عمل میں تیزی آئی۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ جب رسائل و اخبارات بھی چھپنے لگے تو نثر کو بھی زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن منظوم اظہار کے پاس جو صدیوں پرانی روایات تھیں انھیں ثقافتی اعتبار حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ نثر کے رسمی استعمال سے ہٹ کر جب فنی کمال کی بات آئی تو نظم میں مستعمل اشکال و اسالیب، صنائع و تلازمات کی طرف نظر جانا اور ان سے اثر قبول کرنا قدرتی تھا۔ لہٰذا شعری اسلوب کی رمزیت، تخیل کے ہاتھ میں قلم

تھما دینے کا انداز، وزن اور آہنگ کی جانب رجحان کسی نہ کسی درجے میں نثر کے لئے قابلِ قبول بنا رہا۔

اس اثر میں کمی جدید علوم کے فروغ کے نتیجے میں آئی۔ علمی مسائل پر منطقی بحث، کاروباری اور قانونی مباحث اور صحافیانہ تحریرات نے واضح، راست اور منطقی نثری اسلوب کے لئے راہ ہموار کی۔ زندگی کے حقائق کی ترجمانی کے رجحان نے جدید ناول اور افسانے کو فروغ دیا اور ان میں رفتہ رفتہ گفتگو کی زبان کو تحریری اعتبار حاصل ہونا شروع ہوا، حالانکہ یہ بات بہت پرانی نہیں کہ علماء عام بول چال کی زبان کو نثر کا نام دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ گفتگو کو نثر کی بنیاد تو سمجھتے تھے لیکن انھیں اسے باضابطہ نثر کا درجہ دینے میں اس وجہ سے تامل ہوتا تھا کہ گفتگو بسا اوقات بے ربط، قواعد سے بے نیاز اور فقروں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گفتگو کے بے حجاب اکھڑپن، سطحیت، اور سوقیت سے بھی ہراساں تھے۔

لیکن دور حاضر میں ایسی تین اہم باتیں رونما ہوئیں جنھوں نے گفتگو کی زبان کو قابلِ اعتنا بنایا۔ پہلے تو مقناطیسی ٹیپ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بولے گئے لفظ کو محفوظ کر کے ایک وسیع دائرے میں پہنچایا۔ دوسرے جدید ماہرین لسانیات نے گفتگو کی زبان کو فطری اظہار کی بنیاد تسلیم کر کے قواعدِ زبان اور اسلوبیات کے مسائل پر بحث کرنے کی ابتدا کی اور تیسرے ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور فلمی کہانیوں میں فطری گفتگو کے پیرائے کو منتقل کرنے کا رجحان پیدا ہوا جس کی مدد سے اس پیرائے کی توانائی کا احساس ہوا۔ اس کی وجہ سے یہ شعور پیدا ہوا کہ زبان کا سب سے زیادہ فطری، توانا اور کارگر استعمال گفتگو کی شکل میں ہوتا ہے اور گفتگو ہی اُن معیاری اشکال کو جنم دیتی ہے جن سے کسی زبان کے الفاظ اپنی معنوی فضا اور اظہاری ترتیب حاصل کرتے ہیں۔

نثری پیرایہ بھی اسی فطری سرچشمے سے زور، طاقت، توانائی اور جواز حاصل کرتا ہے کیونکہ وہ فطری اظہار کی بے حجابی، تندی، رنگارنگی اور پیچ و خم کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی گنجائش رکھتا ہے لہذا دورِ حاضر تک آتے آتے نثر خود کو شعری اسلوب کی "استعاریت" سے آزاد کرانے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے اور اپنے معیار اور جواز آزادانہ بنیادوں پر قائم کرتی ہے۔ چنانچہ آج نثر، نظم کا ایک کم درجہ، بے اثر، ذیلی پیرایہ نہیں بلکہ اس نے ایک جداگانہ واضح حقیقت کی حیثیت سے فروغ پایا ہے۔ اس میں اگر ایک جانب منطقی اظہار کے لئے ضروری نظم و ترتیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے تو دوسری طرف اس میں گفتگو کے اچانک پن، الفاظ کے برقیاتی استعمال اور اظہار کی

زیر کر لینے والی بے ساختگی کے امکانات بھی ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارا عہد نثر کا عہد ہے۔ نثر کو دورِ حاضر میں وقعت دینے والے تین پہلوؤں پر خاص توجہ دی جانی چاہئے۔ ہمارے عہد میں ٹکنالوجی کی نت نئی فتوحات کے نتیجے میں ابلاغ اور رسل و رسائل کے ترقی یافتہ وسائل ظہور میں آئے ہیں۔ ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ نے خبر رسانی اور ترسیلِ خیال کے پہلے سے کہیں زیادہ تیز رفتار اور کارگر مواقع پیدا کئے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک زیادہ بڑے دائرے میں پیغام رسانی ممکن ہوئی ہے اور اِس سلسلے میں نہ صرف مکانی حدود کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے بلکہ زبانوں کے اختلاف سے پیدا ہونے والی رکاوٹوں پر بھی رفتہ رفتہ قابو پانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ بین الاقوامی اجتماعات میں نہ صرف فوری ترجمے کا بندوبست عام ہو گیا ہے بلکہ ترجمے کے کام میں کمپیوٹر سے بھی مدد لینے کے تجربات جاری ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کے مہیا کئے ہوئے یہ وسائل حقائق کی ٹھیک ٹھیک، سیدھی اور جامع رپورٹنگ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے جس قسم کے پیرایۂ اظہار کو ترسیل کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے وہ نثر کا پیرایہ ہے۔ نثر کا پیرایہ اپنی جامعیت کی وجہ سے نہ صرف ترجمے کی ضرورتوں کو زیادہ خوبی سے پورا کرتا ہے بلکہ اظہار کی عمومیت، جامعیت اور رسمیت کو قبول کرنے کی فطری صلاحیت کی بنا پر وہ ٹکنالوجی کے فروغ کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے آفاقیت کے رجحان سے واسطے بھی نہایت موزوں ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کی کاروباری ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نثر کو ایک معتبر مقام حاصل ہو چکا ہے اور ابلاغ اور رسل و رسائل کے بڑھتے ہوئے وسائل کے ساتھ ساتھ کاروباری ضرورتوں کے لئے نثر کا استعمال مقداری اور معیاری دونوں اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ رہا ہے اور اشتہاری زبان کی طرح اظہار کے نئے پیرایے استعمال میں آ رہے ہیں۔ پھر مقناطیسی ٹیپ، لکھی یا چھپی تحریر، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کی موجودگی میں انسان کی یادداشت اور حافظے پر اب بوجھ کم ہو گیا ہے اور اسی تناسب سے نظم کے پیرایے کی وہ افادیت بھی کم ہو گئی ہے جو اسے پہلے یادداشت سے ایک مفید آلۂ کار کی حیثیت سے حاصل تھی۔ لہٰذا رسل و رسائل کی ان سہولتوں کی وجہ سے اظہار کو اب نظم کے پابند اسلوب کا مرہونِ منت رہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے نثر سے زیادہ آزاد، لچکدار اور فطری اسلوب سے فائدہ اٹھانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

نثر کے فروغ میں مددگار ہونے والے جس دوسرے سبب پر توجہ دینا ضروری ہے اس کا تعلق دورِ حاضر کی عقلی فضا سے ہے۔ ہمارا عہد ٹکنالوجی کا ہی نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کا بھی عہد ہے۔ چنانچہ

ایک جانب سائنسی علوم کے فروغ نے مسائل کے نکتہ بہ نکتہ تجزیے، معروضی اور غیر شخصی مباحثے، حقائق کے پوری صحت اور جامعیت کے ساتھ بیان اور منطقی استدلال کی ضرورت کو نمایاں کیا اور نثر کے ایک جامع رابطے اور نیوٹرل انداز کی حوصلہ افزائی کی ہے تو دوسری جانب اس دور میں مختلف نظریات اور آئیڈیالوجی نے ہمارے سماجی اور شخصی رویوں کو متاثر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان آئیڈیالوجیز نے خود کو فلسفیانہ سطح پر منظم کر کے ہمیں عقلی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ سے ایک واضح منطقی اسلوب کو مزید وقعت حاصل ہوئی ہے۔ نظری اعتبار سے بعض آئیڈیالوجیز نے فکر و تجربے کے شخصی پہلوؤں کی حمایت کی ہے۔ لیکن انھوں نے اس کا جواز خود کو ایک فکری نظام کی حیثیت سے مرتب کر کے ہی حاصل کیا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں ادب میں ناوابستگی، تجربہ و اظہار کی بے معنویت اور کائناتی پراگندگی کی بات کہی گئی ہے وہاں بھی تجربات کے بجائے عقلی تصورات، نظریات و دلائل پر ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے اور ان نظریات کے تحت جو ادب ارادی طور پر پیدا کیا گیا ہے، اس میں بھی ایک قسم کی نظریاتی قطعیت کا رجحان غالب ہے۔ بحیثیت مجموعی ہمارا دور حوادث و افکار کو ایک عقلی ترتیب دینے کا رویہ رکھتا ہے اور نثر اس رویے کا نمائندہ پیرایۂ اظہار ہے۔

نثر کو عہد حاضر کا مقبول اسلوب بنانے کا تیسرا سبب، حقیقت کا وہ جابانہ اظہار ہے جس سے نثر نے اپنی صنفی توانائی کو ثابت کیا ہے۔ دور حاضر کے عقلی رجحان نے بات کو ٹھیک ٹھیک اور جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ کہنے کے انداز کو معیاری بنا کر ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ اس نے حقیقت کے براہ راست بے تکلفانہ اور فطری شدت کے مالک اظہار کے لئے بھی راہ ہموار کی ہے۔ شعری اظہار نے رمزیت، نزاکت اور لطافت کے ذریعے بیان کو جن نسوانی اوصاف سے متصف کیا تھا وہ ایک طویل عرصے تک نثری اظہار کے لئے ایک اسلوبی روایت کا کام کرتے رہے۔ دور حاضر میں اظہار کی بے ساختگی، لفظ کے ذریعے خیال کی دھاکہ خیزی اور بیان کے نکیلے پن کو حاصل کرنے کا رجحان ہونے کی وجہ سے نثر کو مردانہ طاقت اور وقار حاصل ہوا ہے۔ غیر آراستہ، راست اور پُر وثوق اظہار کی حیثیت سے عہد حاضر میں نثر نے نہ صرف ایک نئی وقعت حاصل کی ہے بلکہ اس نے اپنا صحیح معنوی منصب بھی حاصل کیا ہے۔ □

اسد رضوی

محمد پور مبارک، پوسٹ پرشوتم پور
مظفرپور ۸۴۲۰۰۱

غزل

سکون لٹتا رہے گا فضا ہی ایسی ہے
ہمارے شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے
کبھی نہ آسکے گی ہونٹوں پہ اب ہنسی کی طرح
وہ ایک بات کہ جس کی ادا ہی ایسی ہے
دہکتی دھوپ میں ساون کی طرح رہتا ہوں
میرے بزرگ کے لب کی دعا ہی ایسی ہے
کسی کی حسن سماعت کو ٹھیس کیوں نہ لگے
کسی کے ہونٹوں پہ اب کے صدا ہی ایسی ہے
سلگتی آگ میں شبنم کی کیفیت پاؤں
میرے گناہ کی یارو سزا ہی ایسی ہے

بلاغت

خدا کی بستی
خدا کے قصبے
خدا کا گاؤں
خدا کی دنیا
بڑے ہی دلکش
نقوش ہیں یہ
تو جا حرم میں
شراب پی لے
میں بتکدے میں
نماز پڑھ لوں

عبد المغنی

حسرت کی شاعری

حسرت کی ایک چھوٹی سی غزل ہے:

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

یہ کلیاتِ حسرت موہانی مطبوعہ ۱۹۵۹ء کے دیوان اوّل سے ماخوذ ہے جس میں ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء کا کلام ہے، جو نومشقی کے ایام (۱۸۹۴ء۔۱۹۰۳ء) کے بعد پہلے دور کے اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ ۱۹۵۰ء تک کہے ہوئے حسرت کے تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل کُل تیرہ دیوان ہیں۔ اس طرح تشکیل و تکمیل فن میں حسرت کا حصّہ کم از کم نصف صدی کا قصّہ ہے۔ اس نصف صدی میں حسرت نے کامیاب محبت بھی کی اور بامراد سیاست بھی، گرچہ سیاست ان کے لئے سراسر مشقت تھی اور محبت یکسر مسرت۔ ضدین کا یہ اجتماع ایک ایسی طبیعت کا کمال تھا جو خود بقولِ شاعر ایک طُرفہ تماشا تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنے پُرپیچ احوال میں اتنی طویل مدت تک جو فنکاری کی جائے گی اس میں پست و بلند اور رطب و یابس دونوں کا جلوہ ہوگا، خواہ خود فنکار کتنا ہی سادہ دل اور وضع دار ہو۔ حسرت کی شخصیت اور شاعری کی صورتِ حال یہی ہے۔

اس پس منظر میں مذکورِ بالا غزل کے اشعار کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن و عشق کی رسمی تصویروں اور ان کے روایتی تصورات کے باوجود کلام میں تجربے کی اصلیت، احساس کی تازگی اور اظہار کی رعنائی ہے۔ ایک اچھا شاعر بننے کے لئے فکر و فن کا اتنا سرمایہ کافی ہے اور یہ سرمایہ اس کی شاعری کی عمدگی کا ضامن ہے۔ لیکن حسرت کی شاعری کی قدر شناسی کے لئے یہ بیانِ واقعہ کافی نہیں۔ وہ صرف اچھے

شاعر نہ تھے، بہت ہی اچھے شاعر تھے، سراپا اور مکمل شاعر تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ خالص شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کی ساری سرگزشت اور اپنے خیالات و واردات کی ساری روداد اپنی شاعری ہی میں درج کر دی ہے اور شاعری اس طرح کی ہے جس طرح انسان آب و دانہ سے شغل کرتا ہے۔ یہ شاعری گویا مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا گزٹ ہے جس میں صرف گفتنی ہی نہیں بلکہ عام گزٹ کے برخلاف ناگفتنی بھی شایع کر دی گئی ہے اور آمد کی شاعری کی جو تقسیم انھوں نے خود عاشقانہ عارفانہ اور فاسقانہ کی قسموں میں کی ہے وہ سب کی سب بہ یک وقت ان کی شاعری میں پائی جاتی ہیں چنانچہ شاعری ان کی جلوت بھی ہے اور خلوت بھی۔ انھوں نے بڑے خلوص اور سادگی کے ساتھ دونوں کی ادائیں اپنے اشعار میں منقش کر دی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بے تحاشا اور بے حجابا شاعری خود انتقادی سے خالی ہے، اس میں غور و فکر اور امتیاز و انتخاب سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

بہر حال، زیر نظر غزل کا ہر شعر انتخاب ہے اور شروع سے آخر تک پوری غزل ایک خاص کیف میں ڈوبی ہوئی ہے، جو ابتدائے عشق کی نہایت معصوم، پُر شوق اور آرزو مندانہ کیفیات پر مشتمل ہے، اور ان کے اظہار و بیان میں بڑی انفرادیت، روانی اور بے ساختگی ہے، آمد کی اس شان کے باوجود ہر لفظ معنی خیز اور ہر ترکیب خیال انگیز ہے اور نہ صرف ہر شعر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے کے ساتھ بڑی چستی سے وابستہ و پیوستہ ہیں بلکہ ہر شعر دوسرے شعر کے ساتھ بھی مربوط اور ہم آہنگ نظر آتا ہے، گویا غزل مسلسل کا سماں ہے۔ اس سلسلے میں منفرد الفاظ کی سادگی اور صفائی بیان کے باوجود فارسی ترکیبوں کا استعمال کثرت، شدت اور جدت کے ساتھ کیا گیا ہے، مثلاً باوجودِ حسن، آگاہِ رعنائی، عشقِ روز افزوں، جلوۂ رنگین، نازِ یکتائی، سرگرمِ خود آرائی، محوِ آرزو، ربطِ شناسائی، یہاں تک کہ تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی جیسی توالیِ اضافات بھی موجود ہے۔ ان میں معروف و مروّج ترکیبیں بھی ہیں اور بالکل نئی اور انوکھی بھی، مگر دونوں کا استعمال یکساں بے تکلفی سے کیا گیا ہے اور ہر استعمال اپنے مخصوص خیال کے ابلاغ کے لئے بالکل فطری معلوم ہوتا ہے، حالانکہ بعض ترکیب پر ذہن چونک اٹھتا ہے۔ جیسے آگاہِ رعنائی اور ربطِ شناسائی، لیکن اپنے سیاق و سباق میں یہ ترکیبیں بڑی مانوس سی لگتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری غزل ہی فارسی تراکیب کے اشارات و مضمرات سے معمور ہے اور مقطع کے دونوں مصرعوں میں تو پورا بیان ہی توالیِ اضافات پر مبنی ہے اور یہی بیان نہ صرف خاتمۂ کلام بلکہ موضوعِ سخن کی نشان دہی کرتا ہے قبل کے چار اشعار میں حسن و عشق کے ازلی موضوع پر بالکل شخصی تجربے کا اظہار اس کی پوری تازگی و طرفگی کے ساتھ نہایت عمدگی سے کر کے پانچویں اور آخر شعر میں مقطع و تخلص کے ساتھ ایک منفرد تجربے کا یہ خلاصہ

و کارنامہ پیش کیا گیا ہے:

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

تہذیب رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی دونوں بیانات نہ صرف اپنی اپنی جگہ اقوالِ محال ہیں بلکہ آپس میں بھی تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ رسمِ عاشقی اور شانِ رسوائی بجائے خود ضرور ایک دوسرے کے ساتھ روایتی طور پر ہم آہنگ ہیں، لیکن پہلے بیان میں تہذیب اور دوسرے میں اعتبار کا اضافہ بجائے خود اور الگ الگ ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنی خاص ترکیب میں جس کے اندر واقع ہوا ہے ایک نئی شان پیدا کر دیتا ہے جو ابتداءً ترکیب کے عام معنی سے متصادم نظر آتی ہے۔ رسمِ عاشقی تو غزل کی روایات میں شانِ رسوائی ہی کا دوسرا نام ہے، اس میں تہذیب اور اس کے اعتبار کا کیا سوال؟ اس لئے کہ تہذیب اور اعتبار کا مطلب ہے ضبط و احتیاط اور یہ دونوں باتیں رسمِ عاشقی اور اس کی شانِ رسوائی کے خلاف ہیں، بالکل منافی اور مزاحم ہیں۔ حسرت کی شاعری کے ماحول پر غور کیا جائے تو غالب کے بعد انیسویں صدی کے اواخر کی غزل گوئی پر چھائی ہوئی رسمِ عاشقی اور شانِ رسوائی کی وہ حقیقت آشکار ہو جائے گی جو داغ کی شاعری سے عبارت ہے۔ تب اس فضا میں تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی سے متعلق حسرت کا دعویٰ زیادہ مبالغہ آمیز نہ معلوم ہوگا۔

بلاشبہ حسرت کے ایک بزرگ ہم عصر شاد عظیم آبادی بھی تھے جنھوں نے غزل کو مابعد غالب کے انحطاط و زوال سے نکال کر ایک ہموار ارتقا کی راہ پر دوبارہ لگا دینے میں ایک کارنامہ انجام دیا تھا اور خود حسرت کے ہم عمر ہم عصروں میں فانی، اصغر اور یگانہ جیسے باکمال تھے۔ پھر اقبال نے تو پوری غزل گوئی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس کے امکانات کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا اور ان سب شعرا میں ہر ایک کو حق ہے کہ وہی دعویٰ کرے جو حسرت نے کیا ہے۔ لیکن اپنے خاص ماحول میں یہی حق حسرت کو بھی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ بیسویں صدی کی اردو غزل گوئی میں حسرت تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی قائم کرنے کے صرف دعوے داروں میں نہیں، حق داروں میں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں حسرت کے امتیازات اور کمالات بھی ہیں، جس طرح دوسرے ان شعرا کے ہیں جن کے نام ابھی لئے گئے۔

ان امتیازات اور کمالات کو واضح کرنے کے لئے میں حسرت کے دیوان اوّل ہی کی ایک اور غزل پیش کرتا ہوں:

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی — مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش — وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے سرفراز کرے

اس غزل میں غمِ جہاں اور دردِ محبت حسرتؔ ہی کے الفاظ میں ایک دوسرے کے ساتھ بالکل ساز باز کئے ہوئے ہیں۔ شروع سے آخر تک ساتوں اشعار ایک ہی کیفیت کے غماز ہیں، جس میں مجاز اور حقیقت کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے اور صرف ایک صداقت ہے جو شاعر کے جذبے اور تجربے کی واقعیت پر مبنی ہے۔ ایک دبا دبا جوش، ایک ٹھہری ٹھہری مستی ہر شعر میں بسی اور ہر تصویر میں رچی ہوئی ہے۔ یہ شادابی اور سرشاری ظاہر ہے کہ قلب و روح کے وفور کے بغیر ممکن نہیں، جس کا وافر حصہ حسرتؔ کو ملا ہے۔ یہی وفور ان کی طبیعت کے بے پناہ سرور کا ضامن ہے اور ان کے کلام میں انبساط و نشاط کی ایک فضا پیدا کرتا ہے۔ تغزل کے اس گداز کا سرچشمہ درحقیقت رسمِ عاشقی کی وہ تہذیب ہے جس کی طرف اشارہ پہلی غزل میں کیا گیا ہے۔ حسرتؔ کا یہ مہذب عشق معلوم و معروف ہے۔ ان کی محبوبہ نہ تو کوئی خشک خیالی پیکر ہے نہ تر دامن شاہدِ بازاری بلکہ ایک پردہ نشیں خاتون جس کی عفت و عصمت اور غیرت و حیا نیز رفاقت و قناعت کی شمع زینتِ محفل بننے کی بجائے حسرتؔ کے چھوٹے سے تنگ و تاریک گھر میں پیہم جلتی رہی اور اس چراغ خانہ کے سوز و گداز نے قلبِ حسرتؔ کو ہمیشہ گرم و تپاں رکھا، اور محبت کی اس دھیمی آنچ کی لے پر شاعر کی روح مسلسل رقص کرتی رہی، نغمہ سنج رہی۔ اردو شاعری اور تنقید کے محاورے سے قطعِ نظر، یہ ایک حقیقی عشق تھا اور شاعر کے عقائد و اقدار کے بالکل مطابق تھا، یہاں تک کہ شاعری اور تنقید کے عشقِ حقیقی تک بھی اسی مجازی عشق نے حسرتؔ کی رسائی کرائی۔ یہ ایک بالکل معصوم اور فطری عشق تھا جس نے ایک انسانی حسن میں حسنِ ازل کا جلوہ دیکھا تھا۔ اس عشق کی تہوں میں حسن و صداقت گویا مترادف ہو گئے تھے۔ یہ عشق اتنا بسیط ہے کہ بیک وقت جمالیات و اخلاقیات دونوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کے ... مجاز و حقیقت کے اشارے کسی ایہام، ابہام یا اشاریت پر مبنی نہیں بلکہ ایک

ہی کیفیت کے دو مرکب عناصر ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ حسرت کے تعشق میں تصوف کی بھی ایک شان ہے یا یہ کہ ان کا اگر کوئی تصوف ہے تو وہ ان کے تعشق سے پیوستہ ہے۔ جو لوگ حسرت کی شاعری کو لخت لخت کر کے دیکھتے ہیں اور ان کے جسمانی محبوب کی ارضیت کو ان کے مذہبی احساسات اور سیاسی اشغال سے بالکل الگ بتاتے ہیں وہ تعشق و تصوف کی پیوستگی کے اس بیان پر چونکیں گے۔ لیکن انھیں غور کرنا چاہیے کہ حسرت کی شخصیت میں محبت، مذہب اور سیاست کے اجزا کی پریشانی کا عالم جو کچھ بھی ہو، ان کے فن میں ان تینوں عناصر کا ظہور ترتیب ہے اور اسی ترتیب سے اس کی زندگی و تابندگی قایم ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ حسرت کے یہاں دو رنگی نہیں، یکسوئی ہے۔ یہ یکسوئی ان کی شخصیت سے زیادہ ان کے فن میں نمودار ہوتی ہے، اس لئے کہ ان کے فن میں ایسی یکسانی ہے جو ان کی زندگی کی تمام اور متنوع اداؤں کو ایک ہی رنگ میں رنگیں کرتی اور ایک ہی آہنگ کی نغمگی بخشتی ہے۔ زیرِ نظر غزل رنگ و آہنگ کی اس یکسانی ہی کا کرشمہ ہے۔

غزل کا پہلا شعر جس نگاہِ یار کا ذکر کرتا ہے اسی کے کرم سے سرفراز ہونے کی تمنا آخری شعر میں پائی جاتی ہے۔ اس طرح مطلعے سے مقطعے تک ہمارا آشنائے راز شاعر جس خوبیِ قسمت پہ ناز کرتا ہے اس کا بہترین اظہار اس معنی خیز اور فکر انگیز شعر سے ہوتا ہے، جو مطلعے کے بعد ہی واقع ہوا ہے:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

یہ جنوں کس کا ہے جس کا سلسلہ دراز کرنے کی دعا خدا سے کی جا رہی ہے؟ کیا یہ خدا کے علاوہ کسی ہستی کا جنوں ہے؟ بہ ظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ دعا خدا سے کی جا رہی ہے کسی کے جنوں کا سلسلہ دراز کرنے کی۔ لیکن ایسا کون سا جنوں ہو سکتا ہے جو سبھی انسانوں کے دلوں کو بقولِ شاعر فکرِ دو عالم سے آزاد کر دے؟ کہنے کے لئے تو ایسا جنوں بھی گوشت پوست کے کسی محبوب کا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک انسان کے لئے جنوں کو اتنا آفاقی بنانا بڑی لمبی کھینچ تان ہوگی، جب کہ اس کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے یہاں تک کہ تیسرا شعر، خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد / جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے بھی ہمیں ایسی کھینچ تان کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ حسنِ کرشمہ ساز اگر جنوں و خرد کی تاثیر بدل سکتا اور دونوں اضداد کے درمیان یک جہتی قایم کر سکتا ہے تو وہ حسن اوّل درجے میں حسنِ ازل ہی ہوگا، اور چوتھا شعر اس سلسلے میں ہمارا امتحان لینے کے ساتھ ساتھ ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے:

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی   مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

یہ تماستم کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو کسی کو شاملِ اربابِ امتیاز کر سکتا ہے؟ بہ ظاہر یہ دو مختلف ہستیاں ہیں۔ دنیا کی کسی محبوب مخلوق کا ستم سہہ کر ہی ایک دردمند دل خدائے عزیز و کریم کے منتخب و ممتاز بندوں میں شامل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ ستم روزگار دراصل نگاہِ یار کے اشارے پر امتحانِ دل کے لئے ہوتا ہے اور اس آزمائش میں کام یاب وہی ہو سکتا ہے جو ایک بسیط غم یار سے مالا مال ہے پھر یہی کام یابی آدمی کو آشنائے راز بناتی ہے، یہاں تک کہ وہ حوادث و آفات میں ابتلا کے درمیان بھی اپنی خوبیِ قسمت پر ناز کرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ اس طرح واحد حاضر کا ستم اور واحد غائب کا کرم دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور من و تو کی تمیز ختم ہوتی نظر آتی ہے، تو عشق کی انتہا یہی ہے جو فی الواقع حاصل تو نہیں ہوتی ہے مگر زندگی کا سارا کاروبارِ شوق اسی کی آرزو میں چلتا ہے۔

ہر دو عشق کی اسی یک جہتی کا اشارہ پانچویں شعر میں ملتا ہے:

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

چھٹا اور مقطع سے قبل کا آخری شعر گویا اسی یک جہتی پر مہر لگا دیتا ہے:

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ظاہر ہے کہ ہر سمت عاشقوں کے گروہ اگر کسی ایک معشوق کی نگاہِ دل نواز کے امیدوار ہو سکتے ہیں تو وہ محبوبِ ازلی کے سوا کوئی اور نہیں۔ اسی لئے مقطع میں حسرت اس محبوب کے کرم کا سزاوار نہیں ہونے کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد بڑے عاشقانہ انداز میں اس کی رضا سے سرفراز ہونے کی آرزو کرتے ہیں:

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے سرفراز کرے

غزل کے اس مطالعے اور تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں عشق کا وہ تصور پوری طرح کارفرما ہے جو مشرق بالخصوص فارسی اور اردو تغزل کا امتیازی نشان ہے۔ اس تغزل میں رسمِ عاشقی کی ایک ایسی تہذیب ہے جس کے آداب و اقدار مادیت کو روحانیت اور روحانیت کو مادیت کے ساتھ ترکیب دے کر حیات و کائنات کا انتہائی لطیف، دبیز اور نفیس تخیل پیش کرتے ہیں۔ یہ تہذیبی انداز اردو اور فارسی غزل کو معروف معنوں میں مہذب ترین صنفِ سخن بنانے کے لئے کافی ہے

اور عصر حاضر میں حسرت کی غزل گوئی خالص تغزل کا ایک حسین ترین نمونہ ہے۔ جو بالکل روایتی غزل گوئی کے نقشے پہ بروئے عمل آیا ہے۔ احساسات کے لحاظ سے اس پہ اقبال تو کیا غالب کی بھی پرچھائیں نہ پڑی ہے۔ گرچہ فارسی تراکیب کے استعمال میں دونوں کے ساتھ مشابہت نمایاں ہے۔ لیکن یہ طرزِ بیان اردو کے دوسرے غزل گویوں مثلاً حسرت ہی کے دور میں فانی، اصغر، یگانہ اور جگر کے یہاں بھی عام ہے، اس لئے کہ اردو زبان و ادب بالخصوص شاعری کا خمیر فارسی سے ہی اٹھا ہے بہرحال، حسرت کی شاعری کا آب و گل میر سے مومن تک کا خالص، روایتی اور سکہ بند تغزل ہے اور حسرت کے کمالات اسی کے پس منظر میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان کی منفرد استعداد نے اسی معروف روایت میں تجربے کئے ہیں، توسیع کی ہے۔

رہی یہ بات کہ میں نے حسرت کی غزل کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل مسلسل ہے جس کے اشعار کے درمیان ربطِ باہمی ہے، جب کہ عام طور پہ اردو غزلوں میں ربط و ترتیب کا فقدان بتایا جاتا ہے، تو سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ تسلسل جو زیرِ نظر غزل میں عیاں ہے حسرت کی بہترین غزلوں میں پایا جاتا ہے اور اشعار میں داخلی ربط کا سُراغ تو اردو کی بے شمار ان غزلوں میں لگایا جا سکتا ہے جو اساتذۂ سخن کے قلم سے نکلی ہیں۔ لیکن اگر غزل کے اشعار متفرق بھی ہیں تو ضروری نہیں کہ انھیں انتشارِ خیال کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ غزل اپنی جگہ اسی طرح ایک ہیئت سخن ہے جس طرح قصیدہ، مثنوی، رباعی اور انگریزی نظم کی ہیئتیں۔ ہیئتِ غزل کی صنفی خصوصیت یہ ہے کہ مستقل بالذات اشعار کا مجموعہ ہے جو معانی کے اعتبار سے باہم مربوط بھی ہو سکتے ہیں اور جدا جدا بھی۔ اردو غزل کی طویل اور وسیع روایات میں دونوں قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان سب اشعار کو جو جو ہر غزل بناتا ہے وہ تغزل ہے جس میں کلام کبھی خدا سے ہوتا ہے، کبھی خودی سے اور بسا اوقات بہ یک وقت دونوں سے۔ اس کلام میں بنیادی عنصر اور عامل شاعر کی اپنی ذات ہوتی ہے جس کے ہر قسم کے کوائف کا اظہار منفرد اشعار میں ہوتا ہے، خواہ وہ عورت سے متعلق ہوں یا سیاست سے۔ غزل صریحاً اظہارِ ذات ہے، خواہ ذات کا نشانہ کائنات ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح غزل فنائے شخصیت نہیں ہے، اعلانِ شخصیت ہے، خواہ انگریزی تنقید کے بدلتے ہوئے نظریاتِ شاعری جو بھی کہتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ انگریزی تنقید اپنی ادبی تخلیقات کے نمونوں کو سامنے رکھ کر نظریہ سازی کرتی ہے، جس طرح اس کی پیش رو یونانی و رومی تنقید نے کیا تھا، اور اس تنقید کے سامنے یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل کا کوئی نمونہ نہ تھا،

یہاں تک کہ جس چیز کو انگریزی میں لیرک یا سونٹ کہتے ہیں اس کا غزل کی ہیئت اور فن سے کوئی تعلق نہیں، خواہ اس کے احساسات میں تغزل کے جو عناصر بھی پائے جاتے ہوں۔ لہٰذا غزل ایک منفرد اور مستقل صنفِ شاعری ہے اور اپنے کمالات و امکانات کے لحاظ سے دنیا کی کسی دوسری صنفِ شاعری سے کم تر نہیں ہے۔ حسرت کی غزل اپنی صنف کے ان ہی کمالات و امکانات کی سرمایہ دار اور آئینہ دار ہے۔ اس میں حسرت کی رنگا رنگ شخصیت کے تمام پیچ و خم آشکار ہوئے ہیں۔ ان کی ذات کا ہر پہلو عکس فگن ہوا ہے، ان کی زندگی کی ایک ایک ادا ضوفشاں ہے، وارداتِ محبت بھی جلوہ ساماں ہیں اور واقعاتِ سیاست بھی حشر بداماں۔ غزل کی ہیئت سخن بڑی خوبصورتی سے ان اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اس کی فنی لچک داری فکر و خیال کی ہر لہر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل ایک چشمۂ خیال ہے جس کا سوتا کبھی خشک نہیں ہوتا اور جس کے دھارے برابر رواں رہتے ہیں، راستے کے ہر کنکر پتھر کو اپنی رو میں بہاتے ہوئے، بڑی بڑی چٹانوں سے کبھی ٹکرا کر اور اکثر ان کے اوپر سے گزر کر نکلتے اور آگے کی طرف بڑھتے ہوئے۔ اردو غزل کے ایک زبردست چشمۂ خیال کی بہار حسرت کی شاعری میں نظر آتی ہے، جس میں قوسِ قزح کے رنگ بھی منعکس ہیں اور آفتاب کی کرنیں بھی۔

حسرت کی شاعری غزل گوئی کے سوا کچھ اور نہیں اور چکّی کی مشقت کے ساتھ غزل کی یہ مشقِ سخن حسرت نے پچاس سال سے زیادہ کی لمبی مدت تک کی۔ لیکن نیاز فتح پوری اور آل احمد سرور جیسے تغزل کے اداشناس اور روادار نقاد کہتے ہیں کہ حسرت کی شاعری اپنی اصلیت اور کمال کے ساتھ ان کے کلام سے دورِ اوّل یعنی دیوان دوم (۱۹۱۲-۱۶ء) تک ہی جلوہ گر رہی، جس کے بعد صرف اس کے آثار باقی رہ گئے۔ گویا یہ فقط عہدِ شباب کا افسانہ و افسوں ہے، اس لئے کہ حسرت ارضی محبت کے شاعر ہیں، چناں چہ جب تک اس کا جوش قائم رہا شاعر کا تخیل بھی بلندیوں کی طرف پرواز کرتا رہا اور جیسے جیسے یہ جوش دھیما پڑتا گیا تخیل کی پرواز پستیوں کی طرف بڑھتی رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسرت کی محبت نہ صرف ارضی بلکہ محض جسمانی اور اعصابی تھی، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے اور حسرت کے ناقد بھی اپنے تصور کا یہ نتیجہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اس لئے کہ یہ حقیقت مانی ہوئی ہے کہ حسرت ایک عاشقِ صادق تھے اور ان کا جذبۂ محبت بہت ہی گہرا اور وسیع تھا جس پر ماہ و سال اثر انداز نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ کہ حسرت کے دردِ محبت اور جنونِ عشق کے سلسلے بہت دراز تھے، نگاہِ یار نے انھیں آشنائے راز بنا دیا تھا، اس لئے غمِ یار کے ساتھ غمِ روزگار سے بھی ان کے جذبات و احساسات کو تحریک

ملتی تھی اور وہ سامان شاعری بن جاتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حسرت کے دونوں عشق ان کی زندگی میں ایک دوسرے کے اندر مدغم ہوگئے تھے۔ لہذا یہ ناممکن تھا کہ اس ادغام کا اثر ان کے فن پر نہ پڑتا، اس لئے کہ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ حسرت کے کردار میں دورنگی نہیں تھی، وہ بڑی سادہ طبیعت رکھتے تھے اور ہر کام جذبۂ بے اختیارِ شوق کے تحت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عشق بیوی کا ہو، عوام کا ہو، اولیا کا ہو، سب کا اثر طبع حسرت پر اس حد تک ہوتا تھا کہ وہ مائلِ اظہار ہو جاتی تھی، اور اس کے اظہار کی سب سے آسان صورت حسرت کے لئے ان کی غزل تھی، جس میں ہی وہ ہر رسم عاشقی کی تہذیب کرتے تھے اور اسی مہذب تغزل سے ان کی ہر شانِ رسوائی کا اعتبار قایم تھا۔ میں ذیل میں کلیاتِ حسرت کے دیوان پنجم ۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۲ء سے دورِ آخر ۱۹۵۰ء تک کی غزلوں کے صرف چند اشعار مشتے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں، جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ حسرت کے تغزل کا چراغ اپنے خاص رنگ و روغن کے ساتھ ان کی شمع حیات کی آخری لو تک جلتا رہا۔

رنگ تیری شفق جمالی کا — اک نمونہ ہے بے مثالی کا
آئینہ ہے تبسم لبِ دوست — حسنِ خوباں کی بے ملالی کا

روشن جمالِ یار سے دنیائے عشق ہے — گویا شرابِ حسن بہ مینائے عشق ہے
اب تک تلاشِ منزلِ مقصد میں دل مرا — آوارۂ مراحلِ صحرائے عشق ہے

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو — پھیلے جاتے ہیں رُخِ یار پہ سارے گیسو
نورِ ایماں کے معاون ہیں تمھارے عارض — کفرِ عشاق کے حامی ہیں تمھارے گیسو

رنج راحت ہے سکونِ غمِ ہجراں کی قسم — یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
تجھ کو مخمور جو دیکھا ہے تو اے پیکرِ ناز — مست ہم بھی ہیں تری مستیِ لرزاں کی قسم

آشنا ہو کر نظر نا آشنا کرنے لگے — ہم سے کیا دیکھا کہ تم پاسِ حیا کرنے لگے
دل ربائی کا بھی کچھ کچھ ڈھب انھیں آنے لگا — بات مطلب کی اشاروں میں ادا کرنے لگے

محبوب ہیں محبوب کی ہر بات بجا ہے — اب مجھ سے تغافل بھی وہ فرمائیں تو کیا ہے
کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن — کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

ہر سمت مری چشمِ تمنا نگراں ہے — معلوم نہیں جلوۂ جانانہ کہاں ہے
حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا — گو اس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

حسن بے پردہ نقاب نہیں — کیا حجاب نظر حجاب نہیں

عاشق وہی عاشق ہے جو رسوائے جہاں ہو — معشوق وہی حق ہے جو بے نام و نشاں ہو

گزرا اسی طرف سے ہے جو کاروانِ شوق — ہر ہر قدم پہ اب بھی ہیں پیدا نشانِ شوق

شوق کو دادِ حیا نہیں ملتی — وہ نگاہِ آشنا نہیں ملتی

ان میں بعض اشعار بالکل رسمی و روایتی قسم کے معلوم ہوں گے، لیکن جو دوسروں کا قال ہے وہ حسرت کا حال ہے۔ اردو غزل کی روایتِ عشق حسرت کا انفرادی تجربہ بھی ہے اور مجاز و حقیقت کی ہر سطح پر ہے۔ اس لئے جس حال و مقام میں بھی حسرت نے اشعار کہے ہیں وہ بالعموم ان کے ذاتی کوائف پر مبنی ہیں اور ان کوائف کے اظہار کو ایک منفرد تغزل کا اعتبار و استناد حاصل ہوتا ہے اس زبان و بیان لب و لہجہ اور طرز و اسلوب سے جو پختگی کے ساتھ ایک طرفگی بھی رکھتا ہے اور اپنی امتیازی شان کے لئے معروف ہے۔ اس شانِ امتیاز میں بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی اور روانی کے ساتھ عمدگی، خوش وضعی نزاکت، ملائمت اور شیرینی بھی ہے۔ یہ شیوہ گفتار نہ تو میر کا ہے، نہ مومن کا، نہ غالب کا، گرچہ اس کی تشکیل میں شامل ہر استاد کا فیض ہے، جیسا حسرت نے خود ہی اقرار کیا ہے۔ بہرحال روایات کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ اسلوبِ سخن منفرد اور ممتاز ہے۔ یہ طرزِ حسرت ہے۔

حسرت کی شاعری کے سلسلے میں ایک بحث ان کی اشتراکیت کی رہی ہے۔ اس موضوع پر خاص کر ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے جو جون ۱۹۴۵ء میں انھوں نے کانپور میں کہے تھے اور ان کے کلیات میں "مقامِ اشتراکیت" کے عنوان سے درج ہیں۔ پہلا ہی شعر اس طرح ہے :

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں — اخوت ہے جہاں میں ہوں سویت ہے جہاں میں ہوں

گویا حسرت سوویٹ روس کے مارکسزم لیننزم برانڈ کمیونزم کے علم بردار تھے۔ لیکن یہ حسرت کی سیاست، نہ کہ شاعری، کے اشتراکی رجحان کی بالکل غلط تعبیر و تاویل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی سیاسی تحریک اور جدوجہد میں حسرت ایک انتہاپسند تھے اور ملک میں آزادی کامل کے ساتھ معیشت میں ایک بنیادی انقلاب کے علم بردار تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنے دور میں وہ جذباتی طور پر روس کے اشتراکی نظام سے حسن ظن رکھتے تھے۔ لیکن وہ اصولاً اور عقیدۃً کمیونسٹ اور مارکسسٹ نہیں تھے، بس اپنے مکالمے کی حدود میں ان کا خیال تھا کہ سیاست کے لحاظ سے روس برطانوی سامراج کا مخالف ہے اور معاشی اعتبار سے اشتراکیت سرمایہ داری کی ضد ہے۔ چناں چہ شخصی طور پر ان کی ہم دردی روسی اشتراکیت یا اشتراکی روس کے ساتھ تھی۔ مگر اول تو حسرت روس کی دہریت کے بالکل خلاف اسلامی مذہبیت پر کامل اور والہانہ اعتقاد رکھتے تھے اور عشق رسولؐ سے محبت اولیا تک کے موضوعات پر ان کے بہتیرے پر جوش اشعار نہایت ایمان افروز ہیں۔ دوسرے خود اشتراکیت کے متعلق حسرت کے تصور کی بنیاد ”مقامِ اشتراکیت“ کے تیسرے شعر سے واضح ہو جاتی ہے:

اصولِ اشتراک آئین بیت المال سے مشتق — اساسِ کارجمع و خرچ ملت ہے جہاں میں ہوں

یعنی یہ وہی بات ہے جو اقبال نے روس میں اشتراکیت کے آغاز پر اس طرح کہی تھی کہ شاید جو فلسفۂ معاشیات قرآن کے ”حرفِ قُلِ العَفْوَ“ میں پوشیدہ ہے وہ اب ظاہر ہو، گویا حقیقت یہ ہے کہ حسرت نے اپنے خیال میں اشتراکیت کے اندر اسلام ہی کی ایک خوبی کی جھلک دیکھی تھی۔ یہ نکتہ پہلے شعر کے لفظ ”سویت“ سے بھی عیاں ہے، جس کا معنی مساوات ہے، یعنی حسرت نے روسی سُوِیٹ کا عربی ترجمہ سَوِیت کر لیا تھا اور دونوں کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ یقیناً یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ اسی لئے وہ اشتراکیت پر وہ فکری تنقید نہ کر سکے جو اقبال نے خاص کر ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ میں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ حسرت تفکر اور تعقل سے بہت کم بہرہ ور تھے اور ان کی شاعری سراسر جذباتی تعشق و تصوف پر مبنی تھی۔

بہر حال اخوت اور مساوات کے معاملے میں حسرت بڑے بڑے اشتراکیوں اور ترقی پسندوں سے زیادہ مخلص تھے، اس لئے کہ یہ ان کی فطرت کا رنگ تھا، ان کے مذہب، اسلام کا آہنگ تھا، کوئی سیاسی نعرہ یا اقتصادی نظریہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں ”مقامِ اشتراکیت“ کا پہلا ہی مصرع ایک بیّن شہادت ہے:

معیشت میں بہر سو رنگِ فطرت ہے جہاں میں ہوں

ب یہ دوسری بات ہے کہ حسرت کو خبر نہ تھی روس کی اشتراکی جنت میں بہر سو رنگ صنعت ہے ہم حسرت اپنی ذاتی زندگی میں ایک سچے اور کھرے مزدور تھے ، بالکل فطری، معصوم اور سادہ قسم کے زدور، جس کا استحصال جتنا سرمایہ داری کرتی ہے اتنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اشتراکیت کرتی ہے یلی کی مشقت جتنی حسرت نے اٹھائی ہے کم ازکم اردو کے کسی ترقی پسند یا اشتراکی شاعر نے نہیں اٹھائی ہے، سوا احسان بن دانش کے، جن کی شاعری کے ساتھ حسرت کے تغزل کا موازنہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ □

یاد آوری کا شکریہ

● ابھی "الفاظ" کا نارنگ نمبر ملا ۔ فاروقی اور مجتبیٰ کے مضمون پڑھوا کر سنے ۔ مجتبیٰ کے خاکے میں نارنگ کے علاوہ ثروت کے ذکر سے بہت لطف آیا ۔ خدا اس کو خوش رکھے اور وہ ترقی کرے ۔

آل احمد سرور

● الفاظ کو بھی چند نارنگ نمبر دیکھا ۔ بہت سلیقے سے چھوٹا سا نمبر مرتب کیا گیا ہے ۔ جس طرح ہم انسانوں کے لئے نستعلیق کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح الفاظ کے اس نمبر کو نستعلیق کہہ سکتے ہیں ۔

علی سردار جعفری ، بمبئی

● کل الفاظ کا نارنگ نمبر ملا ۔ وہ گوشہ نارنگ کے بجائے نارنگ نمبر ہی لگتا ہے ۔ پرچہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی ، دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔ مضامین اچھے ہیں تشنگی کا احساس تو ہوتا ہے ۔ مگر یہ تو ابھی ابتدا ہے ۔ ابھی نہ جانے نارنگ کی شخصیت اور نارنگ کے کارناموں پر کتنے نمبر نکلیں گے اور وہ بلاشبہ اس کا پورا پورا استحقاق رکھتے ہیں ۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ، سرینگر

● الفاظ میں نارنگ پر گوشہ دیکھ لیا ہے ۔ دل خوش ہو گیا ۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون تو اتنا اچھا تھا کہ "زود اندیش" نے اس پر جسارت میں کالم بھی لکھ ڈالا ۔ میں اس کی فوٹو کاپی آپ کو الگ بھجوا رہا ہوں اور آپ کی جو رائے ملی وہ زود اندیش کو مرسل کر دوں گا ۔

انور سدید ، لاہور

● اس وقت الفاظ کا نارنگ نمبر میرے لئے ایک پناہ گاہ ہے ۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے خط نما مضمون کا عنوان ہی فیض کے فیضان کا پرتو ہے ۔ بہت نرم الفاظ میں بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے ۔ ویسے رقیب کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے ، محبت نہیں ـــــ شاید اس بنیادی نکتہ کو فیض سے پہلے غزل کے شاعر نے سمجھ لیا تھا ۔ اس کے ہوتے تو نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں ؎

لذتِ عشق گئی غیر کے مرجانے سے

یعنی "انصاف" کا لفظ بھی مٹی میں مل گیا ۔ یوں غیر یا رقیب کو مہمیز کہنا چاہیے ۔

پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ابہام سے شاعری میں معانی کے در کھلتے ہیں اور تنقید

میں بقس معنی کا دم گھٹتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ابہام کی مقدار معین و متعین نہیں فرمائی معنی زا اور معنی خیز ابہام (بلکہ استعاریت) تو تنقید میں بھی قاری کو نقاد کا ہم سفر بنا دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جارحانہ نثر تو لکھ سکتے ہیں، تخلیقی نثر نہیں لکھ سکتے اور یوں اسلوب معانی زا ومعانی خیز انھیں بیگانہ لگتا ہے۔ جدید ادب پر آپ کے کئی مضامین میں مجھے ایسے جملے اور بیانات ملتے ہیں جو ۲+۲ کی طرح نہیں لکھے گئے اور یوں میں آپ کے مضمون کا مطالعہ تھوڑی دیر کے لئے روک کر اُس بیان کو اپنے طور پر DEVELOP کرنے لگتا ہوں۔ یہ طریقہ کار ہربرٹ ریڈ کے "سو رنگوں کے کوٹ" کے مطالعہ کے بعد سے خود بخود میری زندگی میں شامل ہو گیا۔ میں اس کا کوئی بیان پڑھتے ہوئے مطالعہ روک دیتا تھا اور اس موضوع پر غور کرنے لگتا تھا۔

فاروقی صاحب کی یہ بات سو فی صد درست ہے کہ "ژولیدہ بیانی دراصل ژولیدہ فکری کا نتیجہ ہوتی ہے۔" لیکن ابہام ژولیدہ بیانی کا نام تو نہیں۔ ہو سکے تو کبھی ماہر لسانیات کی حیثیت سے فاروقی صاحب کو بتا دیجیے کہ ابہام تو زبان کا لازمی حصہ ہے، چاہے ہمیں یہ بات پسند ہو یا نہ ہو۔ اور اس ابہام میں لہجہ بھی شامل ہے۔

"پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر؟ — یہ دو الگ بیان ہیں۔ ژولیدہ بیانی تو اسے کہتے ہیں جو کبھی مستعار نظریہ کی بنا پر ممتاز حسین صاحب کی تحریروں میں ملتی تھی۔ اب جب انھیں ژولیدہ فکری سے نجات مل گئی ہے اور اسلوب بھی سنور گیا ہے۔

مجھے فاروقی صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ "معاصر ادب کے بارے میں کوئی رائے رکھنا تنقید کا سب سے بڑا امتحان ہے" — آپ ان نقادوں میں سے ہیں جو اس باب میں سرخ رو ہوئے ہیں۔ آپ میں یہ صلاحیت اور اتنی توانائی ہے کہ آپ ہمیں اپنے معاصر ادیب کی دنیا میں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی ذرا ان مناظر کو میری نظر سے بھی دیکھو" — مجھے افتخار عارف اور صلاح الدین پرویز کے بارے میں آپ کے تماشائے نظر سے اتفاق ہو یا نہ ہو، مگر آپ کی ہمسفری اچھی لگتی ہے — فاروقی صاحب نے یہ بھی ٹھیک لکھا ہے کہ خدا نے آپ کو "وجدان" اور "شے لطیف" سے نوازا ہے۔ فاروقی صاحب میں بڑی کاٹ ہے۔ اپنی ذات کی حد تک ان میں شے لطیف بھی ہے، مگر ادب کے بارے میں وہ شے لطیف اور وجدان دونوں کا احترام نہیں کرتے ورنہ وہ حسرت موہانی اور فراق پر اتنے برے مضمون نہ لکھتے۔ قصہ یہ ہے کہ وہ اردو ادب کا مطالعہ ادبی تاریخ کے تناظر میں نہیں کر سکے۔ شوقیہ قارئین ادب ادب کی دنیا میں نئی روشنی اور ہوا لے کر ضرور آتے ہیں مگر ایسا غچا کھاتے ہیں کہ معاذ اللہ۔

یہ صاحب جو آپ کے دیس کے مجتبیٰ حسین ہیں مجھے بہت پسند ہیں (ان کی تحریریں) دلّی میں ان سے ملنا چاہا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ جو نظیر نے کہا تھا ؏
عاشق ہے تو معشوق کو ہر رنگ میں پہچان
آدمی ان کا معشوق ہے — اور ان کے خاکوں سے اس کی توثیق ہوتی ہے — یہ آپ کی بساطِ رقص تک پہنچ گئے۔ مگر بھائی آپ اتنے ٹپ ٹاپ سے رہتے ہیں کہ آپ نے اپنے بہت سے جاننے والوں پر اپنے دلِ دردمند کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک شرارت ہے۔
اگر ہمیں الفاظ کے شمارۂ نارنگ کے بارے میں معلوم ہوتا تو ہم بھی کچھ عرض کرتے۔ ایک بات ذہن میں آئی ہے وہ یہ کہ آپ اب تک جتنا لکھ چکے ہیں اس کا ایک انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے انتخاب کا چلن (نثر کے سلسلہ میں) ہمارے یہاں نہیں۔ کیا خیال ہے۔

ابوالخیر کشفی، شکاگو

● الفاظ علی گڑھ کے حالیہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نمبر کے بیشتر مضامین پڑھ ڈالے۔ یقین مانیئے اب جا کے آپ کے لیے احترام اور محبت کے جذبات جاگے ہیں اور بے اختیار ہو کر آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس میں کسی لالچ، سفارش یا کسی اور جذبے کو دخل نہیں۔ یہاں بھی اور جامعہ میں بھی میرے دوستوں میرے کیا کہوں خود آپ کے بہت سے دوستوں نے آپ کی وہ امیج بنا ئی تھی کہ کیا کہوں۔ سچ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر تو میرے بھی ذہن و دل پر پڑا تھا۔ مگر اب آنکھ کھلی اور معلوم ہوا کہ اس پیارے ذہن اور پائے کے اسکالر کو لوگوں نے کس طرح ہوا بنا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے تاکہ ہم کچھ استفادہ کر سکیں۔ اور کیا عرض کروں۔

ڈاکٹر منظر اعظمی، جموں

● ڈاکٹر حنیف کیفی صاحب سے میں نے ان کا مضمون انھیں کی زبان سے سنا اور ان سے درخواست کر کے آپ کی کتاب "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" حاصل کی اور ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ بھی ڈالی۔ نہ صرف مبارک باد پیش کرتا ہوں بلکہ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کے گراں مایہ وجود پر اس کی رحمتیں سایہ فگن رہیں اور آپ نے علم و ہنر کی جو شمع روشن کر رکھی ہے اس کا اجالا تاریک راہوں کو منور کرتا رہے۔ اس مختصر سی کتاب کا ہر لفظ آپ کی خداداد ذہانت، ہوش مندی اور علمیت کا مظہر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ نے جب بھی قلم اٹھایا ہے تو ادب و شعر کی پیش پا افتادہ تشریحات و تعبیرات سے گریز کر کے ایک نئی تازگی، خوشبو اور رنگت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ کتاب کی مجموعی فضا ان نعمتوں کے سبب لازوال ہو گئی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس کتاب کے متعلق میں بھی اپنے حقیر خیالات ظاہر کر سکوں اور میرا تبصرہ بھی ان مضامین میں شامل ہو سکے جو اجراء کے موقع پر پڑھے گئے اور اب ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

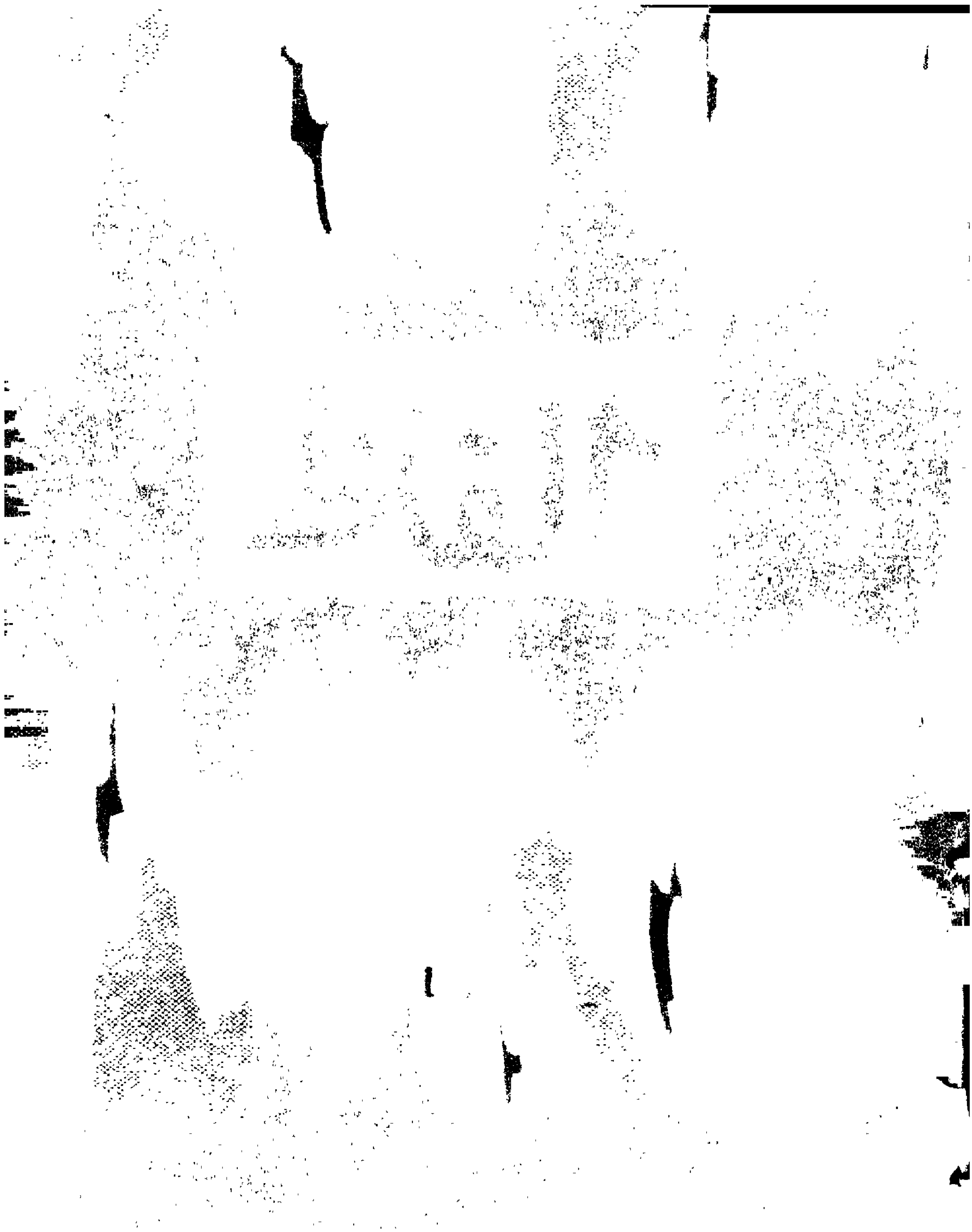
■

مجھے الفاظ کا نمبر دیکھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ بہت اچھے مضامین ہیں اور بہت اہم لوگوں نے لکھے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر زیادہ لوگوں کو خبر ہوتی تو آپ کی تحریروں کو پڑھنے اور پسند کرنے والے بہت سے لوگ لکھنے کے خواہش مند ہوتے اور نمبر خاصا ضخیم ہو جاتا۔ یقیناً وہ سبھی لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے آپ جیسی عظیم اور محترم شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، نئی دہلی

● دو ہفتے پیشتر الفاظ کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کا گوشہ دیکھ کر اور پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب، مغنی تبسم اور پروفیسر گیان چند جین صاحب کے مضامین پڑھ کر میری معلومات میں بے حد اضافہ ہوا۔ خصوصاً گیان چند جین صاحب کا مضمون معلوماتی اور تحقیقی انداز کا ہے جین صاحب نے کتابیں اور مضامین کے اقتباسات دے کر "موضوع" کی اہمیت سے واقف کرایا ہے۔ اس قسم کے لکھنے کے انداز سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے قاری مضمون یا کتاب مکمل پڑھنے کی طرف راغب ہوتا ہے۔

حشمت فاتحہ خوانی، گلبرگہ



افسانہ نمبر

الفاظ

دوماہی — علی گڑھ

جلد ۱۲ | مئی، جون، جولائی، اگست ۱۹۸۶ء | شمارہ ۳، ۴

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی — رام لعل

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

زرِ سالانہ ---- ۲۰ روپے
قیمت فی شمارہ -- ۴ روپے

پرنٹر پبلشر ---- اسدیار خاں
مطبوعہ -- جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
کتابت --- سلطانہ ریاض

مقامِ اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۲۷۶۸

آئینہ

اداریہ

ہماری نثری اصناف میں افسانے کو جو مقام حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس صنف کی طرف خصوصی توجہ کی جائے خاص طور پر اس لئے کہ آزادی کے بعد سے افسانے میں بڑی برق رفتار تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا جائزہ لینا، ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اور قاری کو ان سے روشناس کرانا افسانے کے ناقدین کی اہم ذمہ داری ہے۔

اردو افسانے کا ماضی بہت شاندار اور اس کا سرمایہ بہت گراں قدر ہے۔ آزادی کے بعد اس صنف نے شاعری کی طرح زمان و مکان سے آزاد ہوتے اور ساری زندگی کو نئی ہیئت میں لینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس نے اپنی روایت سے روگردانی کر کے شعری وسائل کو اختیار کیا جس سے اس کی شکل تو یکسر بدل گئی مگر اس کا طول و عرض بے کراں ہو گیا اور ساری کائنات اس کے دامن میں سمٹ آئی۔ اس لئے اب ہمارا افسانہ پہلے سے زیادہ معنی زیادہ توانا اور زیادہ امیر ہے۔ لیکن اس کوشش میں اردو افسانہ بعض گمراہیوں کا شکار بھی ہوا۔ بے شمار افسانے وجود میں آئے جو افسانہ کم اور چیستاں زیادہ تھے۔ پھر دھیرے دھیرے مطلع صاف ہوا۔ فن کاروں کے بھیس میں جو غیر فن کار افسانے کے میدان میں گھس آئے تھے انھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ فن کار نے قاری سے ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑا۔ اُدھر قاری نے سہل انگاری کو خیرباد کہا۔ افسانے کی تہہ داری و ایمائیت کا احترام کیا جانے لگا۔ افسانے کے علامتی، تجریدی اور تمثیلی پہلوؤں پر غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی۔ اب افسانے کو اخبار کی خبر سمجھ کے نہیں پڑھا جاتا۔ توجہ اور انہماک سے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے معنی کے معنی تک پہنچنے، مختلف پرتوں کو کھولنے، ایک ایک لفظ کی جملہ تعبیرات اور اس کے تمام انسلاکات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قاری کے رویے میں یہ تبدیلی افسانے کی صنف کے لئے نہایت خوش آیند ہے۔ اسے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ تنقیدی رسائل اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ الفاظ کا یہ شمارہ ایسی ہی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ امید ہے کہ اسے سراہا جائے گا۔

—— مدیر

احمد ندیم قاسمی
ڈائرکٹر مجلس ترقی ادب
کلب روڈ، لاہور۔۳

میرا تصورِ زبان

جس زبان میں نئے الفاظ، یا مروجہ الفاظ کے نئے مفاہیم کا داخلہ رک جائے، وہ نیم مردہ ہو جاتی ہے، اور اگر وہ اس طرزِ عمل پر بضد رہے تو مر جاتی ہے۔ مگر زبان میں نئے الفاظ کسی شعوری اہتمام سے داخل نہیں کئے جاتے۔ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور نئے سے نئے الفاظ اس مزاج کی مناسبت سے زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ داخلہ اتنا غیر شعوری اور بے آواز ہوتا ہے کہ لسانیات کے ماہرین کو بھی زبان کے بڑھتے ہوئے ذخیرۂ الفاظ کا احساس بروقت نہیں ہو پاتا۔ پھر یہ الفاظ گھڑے نہیں جاتے بلکہ علم و فن اور تہذیب و تمدن کی غیر مرئی چھلنیوں میں سے چھن چھن کر آتے رہتے ہیں۔ اس طرح مروجہ الفاظ، جب سلیقے کے ساتھ کسی نئے حوالے سے اور کسی مختلف CONTEXT میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کے مروجہ مفاہیم میں ایک نئے مفہوم کا اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صرف وہی زبانیں امیر نہیں ہوتیں جن میں الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑا ہو۔ وہ زبانیں بھی اس امارت کا دعویٰ کر سکتی ہیں جن کا ایک ایک لفظ متعدد مفاہیم ادا کر رہا ہو —— اور یہ مفاہیم اس لفظ کے مزاج اور فضا سے ہم آہنگ ہوں۔ اس ضمن میں کسی زبان کے ماہرین کو کسی قسم کی کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ جو زبان بالیدگی کی صفت سے محروم نہیں ہوتی، اس کے الفاظ اپنے بدلتے ہوئے مفاہیم کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں اور الفاظ کو خود فریبی نہیں آتی۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ علوم —— خاص طور سے سائنٹیفک علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ ہر نئی ایجاد، ہر نیا نظریہ خاص الفاظ کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا ہے جسے زبانیں اپنے اپنے مزاج کے مطابق اپناتی چلی جاتی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ زبانوں کو مالا مال کرنے میں جو کردار شعرا نے ادا کیا ہے، وہ شعلی بے نظیر ہے۔ دراصل جب کوئی زبان کسی شاعر کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے تو زندہ ہیں [illegible]

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تب اس کے الفاظ اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ شاعر کے فکر سے ذرا سے مس سے بھی ان میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب الفاظ کے خول پگھل جاتے ہیں اور نئے سے نئے مفاہیم قبول کرنے کے لئے ان کی آغوش وا ہو جاتی ہے۔ اگر میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ، یگانہؔ، فراقؔ، شادؔ، حفیظؔ، فیضؔ، راشدؔ اور میراجیؔ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر اہم شاعر زبان کو الفاظ اور ان کے مفاہیم کے سلسلے میں اتنا کچھ دے گیا ہے کہ اگر اس مقصد کے لئے ہر دور میں کوئی ادارہ قائم کیا جاتا تو وہ بھی اتنا اضافہ نہ کر سکتا جتنا اس دور کے کسی اہم شاعر نے کیا ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ شعرا شعر کہنے سے پہلے نئی فرہنگیں مرتب نہیں کرتے اور نہ اپنے چار طرف منتخب اور پسندیدہ الفاظ کا انبار لگا کر بیٹھتے ہیں کہ یہ شعر کہتے ہوئے مناسب الفاظ کی جستجو انھیں پریشان نہ کرے۔ اس حقیقت کو ایک شاعر ہی جانتا ہے کہ شعر کا موضوع اپنے الفاظ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پھر جب یہ الفاظ شاعر کے فکر اور جذبے اور احساس کے اظہار میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ یہ استعمال ان کے مروجہ مفاہیم کے مطابق ہی ہو، البتہ نئے مفاہیم کا مروجہ مفاہیم سے رشتہ ضرور قائم رہتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو زبانیں تاراج کا شکار ہو جائیں۔ کیونکہ زبانیں تو اس وقت تک زندہ رہتی ہیں، جب تک ان کے سمجھنے والے موجود ہوں۔ اگر کوئی زبان مفہوم کے ابلاغ اور معنی کی ترسیل سے قاصر ہے، یا یہ ذمہ داری کا حق ادا نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے اور اس نے قبر میں پاؤں لٹکا دیئے ہیں۔

علمی اصطلاحوں کی اہمیت مسلّم، مگر کوئی زبان، اس وقت تک زندہ اور توانا زبان نہیں بن سکتی جب تک وہ انسانوں کے نازک سے نازک جذبے کے اظہار پر بھی قادر نہ ہو۔ ترقی پذیر زبان وہی ہے جو فکر، جذبے اور احساس کے فنکارانہ اظہار میں رکاوٹ بننے کی بجائے ممد و معاون ہوتی ہے۔ ادھر ترقی پذیر زبان اظہار کی مشکل میں شاعر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ ادھر شاعر اس زبان کے الفاظ کے فنکارانہ استعمال سے اسے نئے مفاہیم سے مالا مال کرتا چلا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ متذکرہ زبان کسی مرحلے پر جامد نہیں ہو پاتی۔ اردو اس لئے ایک ترقی پذیر زبان ہے۔

صرف آج کی مثال لے لیجئے کہ شاعری کے موضوعات بدل رہے ہیں۔ انفرادی جذبوں نے اجتماعی نوعیت اختیار کر لی ہے۔ انسان کو نئی کامرانیوں اور نئی رسائیوں کے ساتھ ساتھ

نئے خطروں اور نئے المیوں کا بھی سامنا ہے۔ انسان جتنا ترقی یافتہ ہو رہا ہے، اتنا ہی غیر محفوظ بھی ہو رہا ہے۔ وہ خوش ہے کہ چاند کو چھو رہا ہے مگر ڈر رہا ہے کہ آئندہ جنگ میں چاند بھی ایک محاذ بن سکتا ہے جہاں سے موت کی شعاعیں کرۂ ارض پر ڈالی جا سکتی ہیں۔ وہ حیران ہے کہ سائنس اور صنعت کی اتنی اندھا دھند ترقی کے باوجود اس کرے کے کروڑوں انسان نانِ جویں کے محتاج ہیں اور اس دور میں ایسے انسان بھی موجود ہیں جو اپنے کروڑوں بھائیوں کی اس حالت کو برقرار رکھنے پر بضد ہیں۔ انسان اداس ہے کہ وہ سچائی اور نیکی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب عملی زندگی میں پہلا قدم دھرتا ہے تو اسے جھوٹ اور ریاکاری سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس تضاد نے انسان کے ذہن کو مجروح کر رکھا ہے۔ ماضی میں بھی برائی کا وجود یقیناً تھا، مگر تب برائی اس انتہا کو نہیں پہنچی تھی کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی ادارہ اس سے محفوظ نہ رہے۔ اردو زبان کے جدید شعرا کو ان جدید مسائل کا سامنا ہے، مگر میرے اس دعوے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اظہار، ابلاغ اور ترسیل کے معاملے میں اردو زبان نے اپنے نئے شاعروں کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ غزل ہو یا نظم، انھوں نے ایسے ایسے جذبوں کو فن کا جامہ پہنایا ہے جن سے میر، غالب بلکہ اقبال تک کا دور نا آشنا تھا۔ ساتھ ہی ان نئے شاعروں نے بھی اردو زبان کو گذشتہ چند ہی برس کے عرصے میں نئے الفاظ اور مروجہ الفاظ کے نئے مفاہیم کے سلسلے میں اتنا باثروت بنا دیا ہے کہ صرف بیس پچیس برس کی فرہنگیں بھی پرانی معلوم ہونے لگی ہیں۔ جو لوگ جدید شاعری کو محض اس لئے نہیں پڑھتے کہ وہ جدید یعنی کچے ہیں، وہ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ جو لوگ حکومتی سطح پر اردو زبان کے ساتھ بدسلوکیوں پر روتے ہیں حالانکہ اگر وہ جدید غزل نگاروں اور نظم نویسوں کا مطالعہ کریں تو نہ صرف ان کے آنسو تھم جائیں بلکہ انھیں اس زبان کے مستقبل کے سلسلے میں بھی خود اعتمادی حاصل ہو۔

اردو زبان (اور شاید ہر پھلتی پھولتی زبان) کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جب اس زبان میں کوئی نیا لفظ داخل ہو یا پرانا لفظ نئے مفہوم کے ساتھ استعمال ہو تو ایسے عناصر موجود ہیں جو شور کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ انھوں نے ہر لفظ کا ایک خول بنا رکھا ہے۔ یہ لفظ ذرا باہر جھانکے تو ان کا ناموس خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک لغت کی کتابوں میں ایسے لفظ ملتے ہیں دکھائی دے جاتے ہیں جن میں شاعری کے مجموعے کے مجموعے بھرے پڑے ہیں، لغتوں میں دو ایک قسم کے معنی بالالتزام استعمال کئے جاتے ہیں کہ — "تھوڑے حضرات نے حفظ کئے ہوں گے"

نہیں کرتے "ـــــ" ناسخ اس زمانے میں زندہ ہوتے تو سر پیٹ لیتے ـــــ "اس لفظ کے اس مفہوم کی اردو یا فارسی میں کوئی سند نہیں ہے" ـــــ "زبان کا بیڑا غرق کیا جا رہا ہے" ـــــ

دراصل یہ لوگ زبان کی نامیاتی خصوصیت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ تک سوچنے کے اہل نہیں ہیں کہ اگر اردو زبان ان اضافوں سے محروم رہ جاتی تو بہادر شاہ ظفر کے دور تک پہنچتے پہنچتے مر جاتی۔ غالب کی غزلوں کی زبان پہ لے دے کرنے والے اگر غالب کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اردو شاعری مرزا داغ کے رنگِ تغزل سے آگے نہ بڑھتی۔ اگر نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ہم وہی سلوک کرتے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا محمد حسین آزاد نے کیا تو اردو نظم قدیم مثنویوں کی دلکشی میں اسیر ہوتی۔ اگر اقبال سینکڑوں نامانوس الفاظ کو اپنے کمالِ فن سے اس حد تک مانوس نہ بنا دیتے کہ آج وہ ہمیں اردو زبان کا ناگزیر حصہ معلوم ہوتے ہیں تو آج کے شاعر کو اظہار میں بے حساب دشواریاں پیش آتیں۔ یہ لوگ ہمارے فنی ذخائر کے علاوہ ہماری زبان کے ذخائر میں کبھی اضافے کرتے رہے اور اضافوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان اضافوں کو زبان کے ساتھ بدسلوکی قرار دینے والے اپنی بے خبری اور سادہ لوحی کے باعث اردو زبان کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی زبان سے اتنی محبت کرتے ہیں تو انھیں ترقی پذیر زبانوں کے سلسلۂ عمل سے کبھی تو باخبر ہونا چاہئے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ زبان میں وسعت پیدا کرنے اور اسے نراج اور انتشار کی نذر کرنے کے درمیان بڑا فرق ہے۔ جو حضرات شعوری طور پر الفاظ گھڑتے ہیں، یا زبان کے مزاج کا لحاظ کئے بغیر دساورسے الفاظ درآمد کرتے ہیں، یا مروجہ الفاظ کو ایسے مفاہیم دیتے ہیں جن کا ان الفاظ کی روایت سے کوئی دور کا رشتہ بھی نہیں ہوتا، یا الفاظ کے نئے اور اچھے مفہوم کو بھونڈے پن سے ادا کرتے ہیں، ان کا عمل ہی اس امر کا گواہ ہے کہ وہ اردو کو ترقی پذیر زبان نہیں سمجھتے اور اس پر ترقی پذیری ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ ایسے عناصر سے چونکنا تو شاید قدرتی ہو مگر بدکنا غلط ہے کیونکہ زبانیں اس ذہنیت کے حضرات کے باوجود آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ مگر زبان کو انتشار سے بچانے کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اسے اضافوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے چار طرف قدامت اور تعصب کے بند باندھ دیں اور اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالیں۔ □

شہزاد منظر
اے - ۳۶ ، واجد اسکوائر، بلاک ۱۳،
گلشن اقبال، کراچی

کرشن چندر، عسکری کی نظر میں

۱۹۴۰ء کے عشرے میں جب اردو ادب میں نئے رجحانات عام ہوئے تو نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے درمیان امتیاز مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک یہ دونوں رجحانات واضح ہو کر سامنے نہیں آئے تھے اور دونوں رجحانات کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس وقت تک ادب میں نظریاتی صف بندی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت ترقی پسندوں کو نظریے پر زیادہ اصرار نہیں تھا اور نہ اس وقت ترقی پسند ادیب ہونے کے لئے اشتراکی یا مارکسی ہونا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت محمد حسن عسکری بھی ترقی پسند تھے اور راشد اور منٹو بھی ترقی پسند۔ ترقی پسند ادیب ان تمام ادیبوں کو بہ خوشی ترقی پسند تسلیم کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے جو شعر و ادب میں مجتہدانہ راہ اختیار کرتے یا خود کو ترقی پسند کہلانا پسند کرتے تھے خواہ وہ فرائیڈ کے قائل ہوں یا رومانی انفعالیت کے، چنانچہ اس دور میں جب قدامت پسند حلقوں کے سرخیل علی اختر تلہری اور ظہور الحسن ڈار وغیرہ میراجی، عسکری، منٹو اور راشد پر جنس نگاری اور فحاشی کے الزام عائد کرتے تھے تو کرشن چندر اور احتشام حسین وغیرہ ان کی کھل کر مدافعت کرتے تھے اور مندرجہ بالا ادیبوں کی حمایت میں مضامین لکھتے تھے۔

اس دور میں محمد حسن عسکری کو بڑے طمطراق کے ساتھ ترقی پسندوں کے مجلے "نیا ادب" لکھنؤ (مدیر: سبط حسن، سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز) میں شائع کیا جاتا تھا۔ ان کا رسوائے زمانہ افسانہ "پھسلن" اسی جریدہ میں شائع ہوا تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ محمد حسن عسکری اپنے ادبی کیریر کی ابتدا میں "ترقی پسند" تصور کئے جاتے تھے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو "سوشلسٹ" قرار دیتے تھے (ملاحظہ ہو مولانا صلاح الدین احمد کے نام خط مطبوعہ "ادبی دنیا" لاہور اگست ۱۹۴۴ء) ان کے اسی دور کا یادگار مقالہ "اردو ادب میں ایک نئی آواز" ہے، جو اگست ۱۹۴۱ء کے "ساقی" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا باقاعدہ مقالہ ہے

جو اس وقت کرشن چندر پر لکھا گیا تھا۔ اس وقت تک ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، البتہ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ "ہوائی قلعے" شائع ہو چکا تھا۔ ان کے معروف افسانے طلسم خیال، نظارے، جہلم پر ناؤ میں، ٹوٹے ہوئے تارے، حسن و حیوان، زندگی کے موڑ پر اور گرجن کی ایک شام مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ اس اعتبار سے اس مضمون کی ادبی اور تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ۴۳ سال گزر جانے کے بعد اس مقالے کا مطالعہ اس اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ اس میں عسکری صاحب نے کئی جگہ غربت و افلاس، ظلم، انسانیت اور انسان کے روشن مستقبل جیسے الفاظ فراوانی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں بہت کم ایسے ادیب تھے جو کسی نہ کسی طرح ترقی پسند تحریک سے متاثر نہیں تھے۔

عسکری صاحب نے آج سے ۴۳ سال قبل کرشن چندر پر یہ مضمون لکھا تھا، اس وقت کرشن چندر خالص رومانی افسانہ نگار تھے۔ کرشن چندر نے اس وقت تک اشتراکیت کو اپنے طرز احساس کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ اس لئے ان کے افسانوں میں وہ تبلیغی عنصر بھی پیدا نہیں ہوا تھا جو بعد میں پیدا ہوا۔ عسکری صاحب کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں "اس نے کسی مخصوص تحریک یا نقطۂ نظر کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا ہے۔ نہ پرولتاریت کو، نہ جنس کو، نہ رومانیت کو ___ محض ترقی پسندی کو بھی نہیں۔ وہ زندگی کو دیکھنے کے لئے کسی مخصوص رنگ کے شیشوں کی مدد نہیں لیتا۔"
عسکری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کرشن چندر کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً عسکری صاحب کرشن چندر کی رومانیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یوں تو "رومانیت" ہر زبان میں ایک مشتبہ لفظ ہے۔ مگر اردو میں اس کا استعمال سخت خطرناک ہے۔ . . . . ہمارے ہاں رومانیت کا صرف ایک مفہوم ہے اور وہ مفہوم ہے۔ کھوکھلا پن، سطحیت، زندگی سے بے تعلقی، کھوکھلی تخیل پرستی، بے جان لفاظی، مجہول خیال آرائی . . . . ایک حقیقی اور صحت مندانہ رومانیت بھی ہوتی ہے . . . . اس سچی رومانیت کے معنی ہیں، زندگی اور انسانیت سے گہری محبت، فطرت کا شدید احساس، انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو، دنیا کے ظلموں کے خلاف بغاوت، انسانوں کی روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت

ان کے مصائب پر غم کھانا، دنیا کے دکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش۔ ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش، حسن اور حقیقت کی جستجو .... وہ (کرشن چندر) اس رومانیت کی اردو میں عظیم ترین مثال ہے۔ انسانیت سے محبت میں اگر کوئی کرشن چندر کا مد مقابل ہو سکتا ہے تو وہ ہیں پریم چند، مگر پریم چند میں خواہ یہ جذبہ زیادہ وسیع ہو مگر اتنا شدید نہیں ہے، جتنا کرشن چندر میں اور نہ ان میں ایسی بغاوت اور سرکشی اور دنیا کے نظام کو یکسر بدل دینے کی ایسی آرزو ہے اور ان چیزوں کے بغیر رومانیت جسے میں نے پکی اور صحت مندانہ کہا ہے، تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے، تو یہ ہے کرشن چندر کی اصلی رومانیت، جس سے اس کا ایک بھی افسانہ خالی نہیں ہے۔ اگر کرشن چندر اس رومانیت کو چھوڑ دے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آرٹ کا گلا گھونٹ دے گا۔"

(اردو ادب میں ایک نئی آواز" شاعر بمبئی۔ کرشن چندر نمبر صفحہ ۴۰۸)

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کرشن چندر چوتھے عشرے کی ابتدا میں اگر رومانی افسانہ نگار کے بجائے اشتراکی افسانہ نگار ہوتے تو کیا عسکری صاحب اسی طرح ان کی تحسین میں مضمون لکھتے؟ میرا خیال ہے شاید ایسا نہ ہوتا۔ عسکری کے اس دور کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر پر اگست ۱۹۴۱ء میں مضمون لکھنے کے چند سال بعد خصوصاً ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال کے بعد وہ ترقی پسند ادیبوں پر اس لئے معترض ہوئے تھے کہ انھوں نے قحط بنگال کو اپنے شعر و ادب کا موضوع بنایا اور شعر و ادب کے ذریعہ تبلیغ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"جب تک شاعری کو شاعری سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اور اسے اخلاقیات کا بدل نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں، لیکن جہاں شاعر نے اپنی حیثیت سے غیر مطمئن ہو کر شاعر سے زیادہ عارف، فلسفی، سیاسی یا مذہبی پیشوا، مصلح، معلم اخلاق، قانون ساز یا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا تو پھر شاعری تو خیر خطرے میں پڑی سو پڑی ہیئت اجتماعی کو بھی ڈرنا چاہئے کہ بھرے بازار میں مست ہاتھی گھس آیا۔"

("جدید شاعری" "جھلکیاں" حصہ اول۔ ماہنامہ "ساقی" دہلی مئی ۱۹۴۴ء صفحہ ۶۲)

لیکن انھوں نے ۱۹۴۱ء میں جب کرشن چندر پر مضمون لکھا اس وقت وہ ترقی پسند

ادبی تحریک سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے کرشن چندر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"اس کے افسانوں میں زندگی سے گریز نہیں، بلکہ ایک زہرناک احتجاج متوسط طبقے کی شرافت اور خود پسندی کے خلاف، سماج کے رسم و رواج کے شکنجوں کے خلاف، دولت کے جبر کے خلاف، وہ ہر افسانے میں چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ سچی رومانیت اور سچی محبت موجودہ سماجی نظام میں بالکل ناممکن ہے، ایسے نظام میں جہاں روپے کی پوجا ہوتی ہے، جہاں ایک جھوٹی شرافت کو ہر جذبے پر مقدم سمجھا جاتا ہے، جہاں ہوس اور وقتی تسکین کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔"

(اردو ادب میں ایک نئی آواز" "شاعر بمبئی۔ کرشن چندر نمبر۔ صفحہ ۴۰۸)

اردو افسانے میں حقیقت نگاری کی ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔ پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو روایت قائم کی تھی ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسندوں کو منتقل ہوگئی تھی اور خالی خولی حقیقت نگاری کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس روایت کو جن افسانہ نگاروں نے آگے بڑھایا، ان میں بیدی، منٹو اور کرشن چندر شامل ہیں۔ کرشن چندر طبعاً رومانی ہونے کے باوجود ایک حقیقت نگار تھے۔ چنانچہ عسکری صاحب نے اپنے اس مضمون میں انھیں حقیقت نگار کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ عسکری صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اس لفظ کا مفہوم کچھ ایسا مبہم ہے کہ اس تعریف میں متضاد چیزوں کو بھی بڑی آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ مگر کرشن چندر کے نزدیک حقیقت نگاری کے صرف ایک معنی ہیں: زندگی کی حقیقت کو جیسا کچھ اس نے سمجھا ہے اسے بیان کردینا۔ یہاں بھی وہ اردو افسانوں کی عام روش سے بالکل الگ ہے ... گندگی اور غلاظت کے بیان، جنسی تفصیلات اور چیزوں کی لمبی لمبی بے معنی فہرستیں بھر دینے کو عموماً ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے۔ گویا ماحول اور جسموں کی گندگی یہی سب سے بڑی سماجی برائی ہے۔ یہ چیزیں آپ کو کرشن چندر کے ہاں نہیں مل سکیں گی۔"

("اردو ادب میں نئی آواز" صفحہ ۴۱۰)

ادب میں "سماجی احساس" اور سماجی اور طبقاتی شعور وغیرہ ترقی پسندوں کی مخصوص

اصطلاحیں ہیں جو وہ ادب پارے کو پرکھتے ہوئے عموماً استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاحیں عسکری صاحب کی تنقید میں کہیں نظر نہیں آئیں گی، اس لئے کہ ان کے ادبی مسلک اور شریعت میں یہ اصطلاحیں حرام ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے کرشن چندر کی افسانہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے یہ اصطلاحیں بے دھڑک استعمال کیں، مثلاً یہ کہ :

"اس میں (کرشن چندر میں) سماجی احساس کی جتنی شدت ہے۔ اتنی اردو کے کسی افسانہ نگار میں بھی نہیں۔ پھر وہ کیسے چشم پوشی کر سکتا تھا، مگر وہ ان کو اتنا نہیں پھیلاتا کہ ساری دنیا سڑے ہوئے بالوں اور چیکٹے ہوئے کپڑوں سے ڈھک جائے۔ وہ ان چیزوں کی طرف محض اشارے کرتا ہے، کیونکہ جسم کی جوئیں اسے اتنی ہولناک نہیں معلوم ہوتیں، جتنا کہ وہ گھن جو سماج کی روح کو کھائے جا رہا ہے۔"

("اردو ادب میں نئی آواز" صفحہ ۱۴۱)

یہ بڑا دلچسپ امر ہے کہ عسکری صاحب نے اس مضمون میں لفظ "بورژوا" بڑی بے ساختگی سے استعمال کیا ہے جو ترقی پسندوں کا تکیہ کلام رہا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں لفظ بورژوا ان کی لفظیات میں شامل تھا۔ جسے انھوں نے ترقی پسندوں کا مخالف ہونے کے بعد کبھی استعمال نہیں کیا۔

اردو افسانے کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کے مسلّمہ اصولوں اور فن کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، کسی اور نے نہیں۔ اس ضمن میں سارا الزام جدیدیت کے علم بردار علامت اور تجربہ نگاروں پر عائد کیا جاتا ہے۔ یہ جان کر بعض حلقوں کو حیرت ہوگی کہ آج سے چالیس پینتالیس سال قبل جس افسانہ نگار نے افسانے کے مسلّمہ اصولوں سے بے اعتنائی برتی اور اس کے ڈھانچے کو مسمار کیا وہ کوئی اور نہیں، یہ کرشن چندر تھے، جنھوں نے افسانہ لکھتے وقت کبھی افسانے کی کلاسیکی تعریف کو خاطر میں لانے کی کوشش نہیں کی اور محض اپنی ساحرانہ زبان دانی کی وجہ سے قارئین کو مغالطے میں رکھا۔ عسکری صاحب نے اپنے اس مضمون میں کرشن چندر کی اس خوبی یا خامی سے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ عسکری، کرشن چندر کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"کرشن چندر نے افسانے کے مسلّمہ اصولوں کو ایسی بے اعتنائی سے کچلا

ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور ہم اسے انھیں پرانے پیمانوں سے ناپنے لگتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک کردار نگاری کا ڈھکوسلہ ہے۔"

اردو میں جتنے طرز کے افسانے لکھے گئے ہیں ان میں ایک کردار کا افسانہ بھی ہے، یعنی افسانہ، جس میں بنیادی اہمیت کہانی یا پلاٹ کو نہیں، کردار کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی افسانہ، کہانی کے گرد نہیں، بلکہ کردار کے گرد گھومتا ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں آغا شمس اور ممتاز مفتی وغیرہ شامل ہیں۔ کرشن چندر وہ افسانہ نگار تھا جس کے افسانوں میں وہ کردار نگاری کبھی نہیں ملتی جو ممتاز مفتی اور ان کے قبیل کے دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ بعض ناقدوں نے کردار کے افسانے سے بحث کرتے ہوئے کرشن چندر کے افسانوں میں بھی کردار ڈھونڈ نکالے تھے جس پر عسکری صاحب نے کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا کہ کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیت کردار نگاری نہیں، وہ مجموعی سماجی تاثر ہے جو ان کے ہر افسانے میں ہوتا ہے اور جو ان کے افسانے کی جان اور جوہر ہے۔ کرشن چندر نے افسانے لکھتے وقت سوائے تاثر کے کسی دوسرے فنی لوازم کو ملحوظ نہیں رکھا اور جب کہ سب جانتے ہیں۔ ہر فن میں بنیادی اہمیت تاثر کی ہوتی ہے، جس فن میں تاثر نہ ہو، وہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ فن نہیں ہو سکتا۔ کرشن چندر کا کمال یہ تھا کہ پلاٹ اور کردار نگاری سے احتراز کرنے کے باوجود وہ محض اپنی جادو بیانی کے ذریعے تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہتے تھے۔ عسکری صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"افسانے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں زندگی کتنی ہے، بلکہ یہ کہ کردار کتنا ہے۔ ڈھونڈنے والوں کو کرشن چندر کے افسانوں میں بھی کردار مل گئے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ اس کا ہر افسانہ ایک سماجی تاثر ہوتا ہے، اس لئے کردار نگاری کی بنیادی خصوصیت ہو ہی نہیں سکتی۔ کرشن چندر کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ وہ اچھے کردار پیش کر سکتا ہے۔ . . . بلکہ اس میں کہ وہ سماجی تاثر کے ساتھ ساتھ آرٹ کو بھی قائم رکھ سکتا ہے۔ دراصل اس کے افسانوں کے اشخاص پر کردار کا اطلاق پوری طرح نہیں ہو سکتا، کیوں کہ کردار کے لئے لازمی ہے کہ اس میں انفرادیت ہو کہ وہ دوسروں سے الگ پہچانا جائے۔ لیکن کرشن چندر فرد اور انفرادیت کو اتنی اہمیت دیتا ہی نہیں، محض کردار نگاری اس کا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ ایسے اشخاص کی مدد سے سماج کے

بارے میں کوئی بات بتا سکا۔

اس صدی کے چوتھے عشرے میں جب کرشن چندر نے افسانے لکھنے شروع کئے تو اردو میں اس کے ساتھ نفسیاتی افسانے لکھنے کا رواج شروع ہوا اور ممتاز مفتی، آغا شمس، شیر محمد اختر اور محمد حسن عسکری نے فرائیڈ کی تحلیل نفسی کے زیر اثر نفسیاتی افسانے لکھنے شروع کئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کے اردو افسانے کے کینوس اور تاریخی مناظر میں یہ قطعی نئی اور انوکھی بات تھی۔ اس سے بلا شبہ اردو افسانے کا کینوس وسیع ہوا۔ لیکن جیسا کہ دستور ہے، نفسیاتی افسانے لکھنا بہت جلد فیشن بن گیا اور ہر بوالہوس نے حسن پرستی اختیار کر لی۔ لیکن کرشن چندر کا کمال یہ تھا کہ اس نے خود کو تقلیدی رویے سے دور رکھا جس پر عسکری صاحب نے کرشن چندر کی خوب داد دی اور نفسیاتی افسانے لکھنے کو انھوں نے "زندگی سے فرار" قرار دیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بعد میں عسکری نے خود زیادہ تر نفسیاتی افسانے لکھے اور ان کا شمار بھی نفسیاتی افسانہ لکھنے کو زندگی سے فرار گردانا۔ انھوں نے اس بارے میں لکھا:

> "کرشن چندر نفسیاتی تجزیے کے جادو سے خوب بچا ہے۔ یورپ میں تو تجزیے کی گویا پرستش ہوتی ہے، مگر ہمارے افسانہ نویس بھی اب بڑی تیزی سے اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیکن کرشن چندر نہ تو خود کسی کو مرعوب کرنا چاہتا ہے اور نہ وہ خود کسی سے مرعوب ہوتا ہے، خواہ وہ جیمس جوائس ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ نفسیاتی تجزیہ افسانہ نگاروں کو کن کن گڑھوں میں لے جاتا ہے۔ یہ چیز بڑی آسانی سے زندگی سے فرار سکھا دیتی ہے۔ زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کو بھول کر آدمی یہ دیکھنے لگ جاتا ہے کہ اب مکھی بیٹھنے سے دماغ میں کیا ردعمل ہوتا ہے۔"

("اردو ادب میں نئی آواز"۔ شاعر بمبئی "کرشن چندر نمبر"۔ صفحہ ۲۱۰)

واضح رہے کہ محمد حسن عسکری نے اس مضمون میں جیمس جوائس پر تنقید کرتے ہوئے اس کی تحریر "فینی گن ویک" کو اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ بعد کے عہد میں جیمس جوائس اس کا خدا بن گیا تھا۔ عسکری بنیادی طور پر افسانہ نگار اور فکشن کے نقاد تھے۔ وہ فکشن کی تنقید ڈوب کر اور مکمل تفہیم کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس کا اندازہ افسانے اور افسانہ نگاروں کے بارے میں ان کے مضامین کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے عسکری صاحب کے مضامین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا

ہے وہ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔ اس کا اندازہ کرشن چندر پر ان کے مضمون سے بھی ہوتا ہے اس میں عسکری صاحب نے کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس سے ان کی نہ صرف افسانہ فہمی بلکہ افسانے کے بارے میں ان کے گہرے شعور اور تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

(زیر تصنیف کتاب "محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ" کا ایک باب)

□

ڈاکٹر انور سدید

خواجہ احمد عبّاس اور ان کا فن

خواجہ احمد عبّاس کی وفات سے برصغیر ہندوستان کے علمی، ادبی اور فلمی افق سے ایک شخص رخصت نہیں ہوا ہے بلکہ کئی اشخاص رخصت ہو گئے ہیں۔ وجہ یہ کہ خواجہ احمد عباس کسی ایک منفرد شخصیت کا نام نہیں تھا بلکہ وہ جامع الصفات انسان تھے اور ان کی ایک شخصیت میں کئی فنی شخصیتوں کا اجتماع عمل میں آ گیا تھا۔ وہ صحافی بھی تھے اور ادیب بھی اور ایک ادیب کی حیثیت میں انھوں نے ابلاغ کے متعدد ذریعے اختیار کیے، افسانے لکھے، ڈرامے تخلیق کیے، فلمی کہانیاں لکھیں اور سب سے اہم کہ انھیں اسٹیج پر بھی پیش کیا اور انھیں سیلولائیڈ کے فیتے پر بھی اتارا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک پختہ فکر ادیب تھے، اشتراکی نظریے کو ایمانیات کے طور پر قبول کر رکھا تھا اور اس پر نہ صرف یقینِ کامل رکھتے تھے بلکہ اس نظریے کی تبلیغ اور فروغ کے لئے وہ ہمہ وقت مصروف بھی رہتے تھے، ان کی تخلیق کاری کی ساری جہتوں کا رخ اشتراکی نظریے کے فروغ کی طرف ہی تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک انھوں نے اپنے عقیدے کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ وہ پیدا ہوئے تو مسلمان تھے لیکن مرے تو پکے سوشلسٹ تھے اور اس ذہنی تبدیلی پر انھیں ملال نہیں تھا۔

خواجہ احمد عباس پانی پت کے اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے اردو ادب کو مولانا الطاف حسین حالی جیسا مجدّد، فکر و نظر دیا۔ وہ خواجہ سجّاد حسین کے نواسے تھے اور اس لحاظ سے مولانا حالی ان کے پڑنانا بنتے ہیں۔ اس خاندان سے جو نامور لوگ پیدا ہوئے ان میں خواجہ غلام السیدین۔ خواجہ غلام السبطین۔ اور صالحہ عابد حسین کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور انھیں لوگوں سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کے نانا خواجہ سجّاد حسین پانی پت کی سب سے بڑی نمایاں شخصیت تھی۔ وہ محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ان پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور سول سروس

پولیس یا عدلیہ میں جانے کے بجائے محکمہ تعلیم میں ڈپٹی ایجوکیشن انسپکٹر کا عہدہ قبول کیا۔ قوم کی فلاح کا خیال آیا تو نوکری چھوڑ دی، جو تھائی تنخواہ پر پنشن قبول کر لی اور جائداد بیچ کر پانی پت میں حالی مسلم ہائی اسکول قائم کیا۔ خواجہ سجاد حسین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کیسی دلچسپی لیتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر بچوں کو دو پیسے انعام میں ملا کرتے تھے اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر دو زنّاٹے دار تھپڑ پڑتے تھے۔

خواجہ احمد عباس کے والد خواجہ غلام السبطین انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کو نظامِ حیات کے طور پر قبول کرنے والے بزرگوں میں سے تھے۔ وہ اس اسلام کے پیروکار تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل، مساوات اور غریب پروری پر تھی۔ احمد عباس نے کہیں لکھا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ گھر کے ایک ملازم کو "الو کا پٹھا" کہا۔ والد سے انھیں یہ سزا ملی کہ انھیں بارہ گھنٹے کے لئے اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ نہ کھانا ملا اور نہ پانی اور جب تک ملازم چھوکرے سے ہاتھ جوڑ کر معافی نہیں مانگی اس قید سے رہائی نہیں ملی۔ خواجہ احمد عباس اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں دشنام سے بچپن میں ہی نفرت ہو گئی تھی، والد نے انھیں غلطی کو تسلیم کرنے کی عادت ڈالی، اصولوں پر عمل کرنے اور صداقت پر قائم رہنے کا سبق دیا اور یہ انھیں کی تربیت تھی جو انھیں اشتراکیت کی سرحد تک لے آئی۔ گھر میں آزادیِ رائے کا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ خواجہ غلام السبطین مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے اور ان کے بیٹے خواجہ احمد عبّاس کانگریس کو پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف قدم بڑھانے لگے اور اس طرف جو قدم آگے بڑھا وہ پھر پیچھے نہیں آیا۔ سیاسی مباحث میں ان کی اپنے والد سے گرما گرمی بھی ہو جاتی، دوست انقلابی تحریکوں سے الگ رہنے کا مشورہ دیتے لیکن جب وہ اپنے استدلال کا لوہا منوا لیتے تو ان کے والد گرامی خوش ہوتے کہ بیٹا اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہنے کی ہمت رکھتا ہے۔ حالانکہ خواجہ احمد عباس جن اصولوں پر عمل پیرا تھے خواجہ غلام السبطین ان کو درست تصور نہیں کرتے تھے۔ مجھے اشتراکیت کے بجائے اسلام سے گہری دلچسپی ہے کہ یہ میرا ایمان ہے لیکن میں خواجہ صاحب کا مدّاح بھی ہوں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ڈھلمل یقین اور موقع محل دیکھ کر اپنا ایمان تبدیل کرنے والے ترقی پسند نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی میں کئی جنگ دیکھے لیکن کسی جنگ میں بھی انھوں نے ققنس کی طرح رنگ تبدیل نہیں کیا اور اپنے نظریات پر آنچ نہیں آنے دی۔ وہ اپنے والدِ گرامی کے پروٹو ٹائپ نہیں تھے۔ خواجہ غلام السبطین

کے چہرے پر داڑھی تھی، احمد عباس کلین شیو تھے۔ باپ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، بیٹے کو قمیض اور پتلون پسند تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے سیاسی نظریات کے حامی تھے۔ یہ سوشلزم سے متاثر تھے۔ باپ عورتوں سے پردہ کراتے تھے بیٹے نے اس کی مخالفت کی۔ وہ فلم دیکھتے تک نہیں تھے۔ یہ فلم کو ایک موثر میڈیا سمجھتے تھے اور زندگی کا ایک طویل حصہ فلمیں بنانے میں گزارا۔ اس سب کے باوجود خواجہ احمد عباس نے تسلیم کیا ہے کہ ان کے خیالات ان کے اپنے عہد کی پیداوار ہیں۔ لیکن غیر تقلیدی رجحان، اپنی رائے سوچ سمجھ کر بنانا اور پھر اس پر قائم رہنے کا طریق۔ روپے پیسے کی طرف سے لاپرواہی کا رجحان اور اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی عزت و احترام کرنے کی تربیت ان کے بنیادی کردار کے اہم ترین عناصر ہیں اور ان کی ترتیب و تشکیل میں ان کے والد اور والدہ کے اثرات نمایاں اور اہم ہیں۔

خواجہ احمد عباس کو ادب کی طرف راغب کرنے میں خواجہ غلام السیدین نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میگزین کے لئے کوئی مضمون لکھتے اور خواجہ احمد عباس اسے دیکھتے تو ان کے دل میں بھی قلم لے کر بے تکان لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی، وہ بیرونی ممالک کی تصویروں کو اپنے البم میں سجاتے تو ان کے دل میں بھی سیر و سیاحت کی آرزو جاگ اٹھتی۔ وہ کالج کے بحث و مناظرے میں حصہ لیتے تو خواجہ احمد عباس بھی ایک پبلک لیڈر کی طرح اسٹیج سے اپنی آواز بلند کرنے کی آرزو کرتے۔ خواجہ غلام السیدین ان کے آئیڈیل تھے اور انھیں سے انھوں نے صحافی مقرر اور سیاستدان بننے کا خواب دیکھا۔ ان کی زندگی میں جلیانوالہ کا واقعہ ظہور میں آیا لیکن اس کے نقوش ان کے ذہن میں موجود نہیں تھے۔ جس واقعے نے ان کے ذہن پر کوڑے لگائے وہ اس وقت پیش آیا جب وہ پرائمری اسکول کے طالب علم تھے۔ اس وقت جلیانوالا باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور پنجاب کی ساری آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق سکھایا جا رہا تھا۔ حکم ہوا تھا کہ جرنیلی سڑک پر واقع شہر اور دیہات اور قصبات کے بچوں کو دو رویہ قطار میں کھڑا کر دیا جائے۔ کیونکہ وہاں سے انگریزی فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سے سہ پہر تک بچے گرمیوں کی دھوپ میں کھڑے رہے۔ پھر انگریزی افواج کا جلوس جو توپوں، مشین گنوں، بندوقوں اور رائفلوں سے لیس تھا ان کے سامنے سے گزارا گیا اور بچوں کے دلوں پر خوف کی دبیز تہہ بٹھا دی گئی۔ لیکن اس خوف میں نفرت کا رنگ زیادہ گہرا تھا اور خواجہ احمد عباس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کریں گے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۱۹

یں اسی قسم کا فیصلہ لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد نے بھی کیا تھا جن کی برسی گذشتہ ہفتے حلقہ ارباب ذوق نے منائی اور آج ہمیں اسی واقعے کے ایک اور کردار خواجہ احمد عباس کی وفات پر یہاں جمع ہیں اور انھیں یاد کر رہے ہیں۔

یہ چند واقعات میں نے ان کی زندگی سے اس لئے منتخب کئے ہیں تاکہ ان کے کردار کی جہت سمجھنے اور ان کی تشکیل زندگی کے آثار آپ کے سامنے آجائیں۔ میرا بنیادی موضوع خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری اور ان کی ادبی زندگی ہے۔ خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے لیکن انھوں نے صحافت کو صرف خبروں کی ترسیل کا وسیلہ نہیں بنایا۔ صحافت ان کے لئے انقلابی تصورات کے ابلاغ عام کا وسیلہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے خبروں کی رپورٹس مرتب کرنے کے بجائے خبروں کے پس منظر میں جھانکنے اور انسانی محرکات تلاش کرنے کی کوشش کی بمبئی کرانیکل میں ان کا کالم LAST PAGE اور آخری دور میں بلٹز میں ان کا کالم ان کی اسی قسم کی خامہ فرسائیوں کا مظہر تھا اور یہ محض خبر کی ترسیل کا وسیلہ نہیں تھا بلکہ ذہن میں انقلابی تبدیلیاں لانے میں بھی معاون تھا۔ میرا خیال ہے کہ خواجہ احمد عباس کو صحافت کے دوران جن سماجی واقعات کے مشاہدے کا موقعہ ملا اسی سے انھیں افسانے لکھنے کا خیال بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ ان کے افسانوں میں واقعات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اس تصور اور فکر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو افسانے کی بنت میں شامل ہے اور افسانے کے اختتام پر ایک بڑے سوال کی طرح آپ کے سامنے آجاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری اسی دور میں پروان چڑھی جب ترقی پسند تحریک نے پورے ملک میں ایک ہیجان سا بپا کر رکھا تھا اور اس تحریک سے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگار لاعلمی، جہالت، تعصب۔ توہم پرستی اور سماجی عدم مساوات کے خلاف مختلف نوعیت کے افسانے لکھ رہے تھے۔ خواجہ احمد عباس ان میں شاید سب سے زیادہ انقلابی تھے۔ چنانچہ انھوں نے فن کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر چند ایسے بھی افسانے بھی لکھے جن میں نظریاتی پیش قدمی بہت تیز تھی اور افسانہ کہانی کے بجائے نظریے کو چیختا اور چنگھاڑتا ہوا منظر پر آتا تھا۔ ان کا افسانہ "ایک لڑکی" کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء کے مسلم معاشرے کی کہانی ہے اور اس کی نمائندہ سلمیٰ تھی جس نے مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں داخلے کر مخلوط تعلیم کی ابتدا کی تھی اور اس پر ایک مقدمہ

کورٹ میں دائر کر دیا گیا جو سلسلہ در سلسلہ چلتا رہا اور ۲۰۳۵ء میں بھی یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو چندہ جمع کیا گیا تھا وہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے تھا یا اس میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم بھی شامل تھی اور کیا فقط مسلمان عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں استعمال ہو سکتا ہے ؟ یہ افسانہ تیکنیک کے اعتبار سے بھی منفرد ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی وہ کٹیلی طنز ہے جو افسانہ کے باطن میں موجود اور پڑھنے والوں کے دل کی طرف براہ راست تیر افگنی کرتی ہے۔

خواجہ احمد عباس بہت برق رفتار افسانہ نگار تھے ۔ واقعے کو محسوس کرنا اور پھر فوری طور پر اسے افسانے کا روپ دے دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ وہ نظریاتی افسانہ نگار تھے اور اشتراکی نظریے کی فوقیت کو ثابت کرنے کے لئے ہی افسانے لکھتے تھے۔ چنانچہ انھیں اکثر اوقات ایک ایسا ادبی رپورتاژ بھی کہا جاتا تھا جو واقعے کو فطری انجام تک پہنچانے سے قبل ہی ختم کر دیتا تھا۔ ان کے افسانے کی کتابوں میں ایک لڑکی۔ زعفران کے پھول ۔ میں کون ہوں ۔ دیا جلے ساری رات۔ چار دل چار راہیں۔ آدھا انسان ۔ ۵۷ء ان سوری۔ اندھیرا اجالا۔ تین پیسے اور چراغ تلے بہت مشہور ہیں اور انھیں سے ان کی انفرادیت قائم ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ادب کی دوسری جہت ان کی افسانہ نگاری تھی۔ ان کے ڈرامے ایسے تھے جنھیں باقاعدہ اسٹیج پر پیش بھی کیا جا سکتا تھا۔ انڈین پیپلز تھیٹر کے لئے ان کا لکھا "زبیدہ" شاید "ایک لڑکی" ہی کا ڈرامائی روپ ہے کیوں کہ اس میں بھی وہی لڑکی سامنے آتی ہے جو قدیم سے علم بغاوت اٹھاتی ہے اور رسوم و رواج کی پابندیوں کو توڑ دیتی ہے۔ ان کا ایک اور ڈرامہ "گاندھی جی اور غنڈا" ہے جو موضوع، تیکنیک اور پیشکش کے اعتبار سے آج بھی خواجہ احمد عباس کی منفرد کاوشوں میں شمار ہوتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ادب کی ایک اور جہت جو اب پس منظر میں چلی گئی ہے ان کی سفر نامہ نگاری ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۸ء میں جب خواجہ احمد عباس نے ورلڈ یوتھ کانفرنس نیویارک میں شرکت کی تھی تو واپسی پر اس سفر کی یادگار کے طور پر سفر نامہ "مسافر کی ڈائری" بھی شائع کیا تھا۔ اس سفر کے دوران ہماری ملاقات اس احمد عباس سے ہوتی ہے جو جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے ہیں دل میں جذبات و احساسات کا سمندر موجزن ہے لیکن یہ نوجوان امریکہ کے ہر منظر کو اپنی نظریاتی آنکھ سے دیکھ

کے بجائے اپنی اشتراکی حیثیت کے اثبات میں مصروف ہے۔ وہ دلکش منظر کو دیکھ کر مسرت اور بہجت میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جب معاشرتی تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں تو یہی منظر زہر خند کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کا مسافر اپنے آپ کو گم نہیں ہونے دیتا بلکہ اپنی غلامی کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے سیاسی عقیدے کا اظہار برملا کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ نہ مجھے یہ شہر پسند آیا اور نہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے کہ اپنے سیاسی عقیدوں کی وجہ سے میں اپنے تعصب میں مبتلا ہوں۔ ممکن ہے کہ لندن میں عمارتیں خوبصورت ہوں۔ مگر میں نے تو دھوئیں سے کالے ہو جانے والے بدصورت اور یکساں مکانوں کی قطاریں ہی دیکھی ہیں۔"

اس کے برعکس جب مشرق کے ملک چین کا ذکر آتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یوں سامنے آیا ہے۔

"ایک اور تاجر سے ملاقات ہوئی جو شنگھائی کا رہنے والا ہے اور ہانگ کانگ کاروبار کے سلسلے میں آیا تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ شنگھائی میں اس کا سگریٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی حملے کا شکار ہو گیا۔ کہنے لگا "لاکھوں سگریٹ تھے۔ جاپانی ہوائی جہاز نے ایک ... سب ایک ساتھ ہی چلنے لگے۔" اور یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔"
"یہ ہے وہ سپرٹ جس کے مقابلے میں جاپان کی فوجیں بے کار ہیں۔ قوم کی خاطر ذاتی نقصان کی پروا نہ کرنا اور مصیبت کی حالت میں بھی ہنس مکھ رہنا ہمیں ان چینیوں سے سیکھنا چاہیے۔"

میں عرض کر چکا ہوں کہ خواجہ احمد عباس پختہ نظریاتی وابستگی کے ادیب تھے۔ مجھے ان کے اس نظریئے سے شدید اختلافات ہیں، لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے انسان کی عظمت کا جو نظریہ پیش کیا اس پر تادم آخر عمل کیا۔ انسانی مساوات کا جو خواب دیکھا اس کی تعبیر عمل میں لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اصولوں کی قیمت پر جھکنا قبول نہیں کیا اور انھیں مخالف قوتیں خریدنے یا ان کے تصورات میں تبدیلی پیدا کرنے میں ناکام رہیں تو میری گردن اس عظیم انسان کے سامنے جھک جاتی ہیں اور میں ان کے ... وعمل کو سلام کرتا ہوں۔ کاش ہمارے ہاں بھی چند ایسے ترقی پسند ہوتے جو نظریئے کی تعبیر اپنے کردار سے کر سکتے اور امیروں، کبیروں اور وزیروں کی درباری سے گریز کر سکتے۔ □

پندرناتھ اشک

ہندی سے ترجمہ: تزئین فاطمہ روحی
ڈی-۲۲۶۶، اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

کہانی کار — بلونت سنگھ

جہاں تک دلچسپی کا سوال ہے میرے ہمعصر اردو افسانہ نگاروں میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہے جس کے افسانے اتنے دلچسپ ہوں جتنے بلونت سنگھ کے۔ کہ انھیں بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہ ہو۔ کرشن چندر! لیکن کرشن چندر فن کار ہیں افسانہ نگار نہیں۔ اپنے فطری فن کے بہاؤ میں وہ اپنی تصنیف پڑھوائے جاتا ہے۔ اگرچہ آخر میں کئی بار خاصی تشنگی ہوتی ہے۔ اس کے کچھ پہلے رومانی افسانوں کے علاوہ میں اس کی کوئی تصنیف دوبارہ، سہ بارہ نہیں پڑھ سکا۔ اس کے برعکس بلونت سنگھ کا افسانہ سامنے آجاتا ہے تو میں ہمیشہ اسے پڑھ جاتا ہوں۔ اور اس کے آٹھ دس افسانے تو ایسے بھی ہیں جنھیں [illegible] کتنی [illegible] پڑھا اور لطف اندوز ہوا ہوں۔

[illegible] کہا کرشن چندر فطری طور پر فن کار تھا۔ وہ ہمیشہ گٹ بنا کر چلتا تھا۔ ترقی پسندوں [illegible] شہرت ملی لیکن چونکہ نہایت تیز رفتار اسلوب کے علاوہ اس کے پاس نہ کہانی [illegible] اس لیے اپنی زندگی ہی میں وہ پیچھے رہ گیا۔ منٹو جب تک زندہ رہا اسے خوب [illegible] بنا۔ اس نے کچھ نہایت متنازع قصے اور دو تین بے مثال کہانیاں لکھیں۔ وہ بیدی [illegible] کر لیا۔ اور کچھ عرصہ تک اردو ادب میں اس کا اتنا چرچا رہا کہ باقی سبھی افسانہ نگار پیچھے [illegible] زمانہ آیا۔ خاص طور پر اس کے فلموں میں جانے، خوب پیسہ کمانے اور یار دوستوں [illegible] عصمت اور قرۃ العین حیدر کا بھی تذکرہ ہوتا رہا۔ لیکن افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ [illegible] کسی نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جبکہ میری نظر میں اپنے ہمعصروں میں کچھ پہلوؤں میں وہ [illegible] ثانی تھا۔

میں نے لاہور ۱۹۳۶ء میں چھوڑا تب تک بلونت سنگھ کا نام ادب میں نہیں تھا۔ دلی میں [illegible] آجکل کے دفتر میں بھی اسے دیکھا تھا۔ جہاں اس نے کچھ سال ملازمت کی تھی۔ کرشن چندر سے [illegible] کی تعریف سنی تھی لیکن کرشن تو اپنے زمرے کے سبھی لوگوں کی تعریف کیا کرتا تھا۔ بلونت سنگھ تو [illegible]

کے بجائے اپنی اشتراکی حیثیت کے اثبات میں مصروف ہے۔ وہ دلکش منظر کو دیکھ کر مسرت اور بہجت میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جب معاشرتی تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں تو یہی منظر زہر خند کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کا مسافر اپنے آپ کو گم نہیں ہونے دیتا بلکہ اپنی غلامی کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے سیاسی عقیدے کا اظہار برملا کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

> " مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ نہ مجھے یہ شہر پسند آیا اور نہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے کہ اپنے سیاسی عقیدوں کی وجہ سے میں اپنے تعصب میں مبتلا ہوں۔ ممکن ہے کہ لندن میں عمارتیں خوبصورت ہوں۔ مگر میں نے تو دھوئیں سے کالے ہو جانے والے بدصورت اور یکساں مکانوں کی قطاریں ہی دیکھی ہیں۔"

اس کے برعکس جب مشرق کے ملک چین کا ذکر آتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یوں سامنے آیا ہے۔

> " ایک اور تاجر سے ملاقات ہوئی جو شنگھائی کا رہنے والا ہے اور ہانگ کانگ کاروبار کے سلسلے میں آیا تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ شنگھائی میں اس کا سگریٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی حملے کا شکار ہو گیا۔ کہنے لگا "لاکھوں سگریٹ تھے۔ جاپانی ہوائی جہاز نے ایک بم چھوڑا۔ سب ایک ساتھ ہی چلنے لگے۔" اور یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔"
>
> " یہ ہے وہ سپرٹ جس کے مقابلے میں جاپان کی فوجیں بے کار ہیں۔ قوم کی خاطر ذاتی نقصان کی پروا نہ کرنا اور مصیبت کی حالت میں بھی ہنس مکھ رہنا ہمیں ان چینیوں سے سیکھنا چاہیے۔"

میں عرض کر چکا ہوں کہ خواجہ احمد عباس پختہ نظریاتی وابستگی کے ادیب تھے۔ مجھے ان کے اس نظریے سے شدید اختلافات ہیں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے انسان کی عظمت کا جو نظریہ پیش کیا اس پہ تادم آخر عمل کیا۔ انسانی مساوات کا جو خواب دیکھا اس کی تعبیر عمل میں لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اصولوں کی قیمت پہ جھکنا قبول نہیں کیا اور انھیں مخالف قوتیں خریدنے یا ان کے تصورات میں تبدیلی پیدا کرنے میں ناکام رہیں تو میری گردن اس عظیم انسان کے سامنے جھک جاتی ہیں اور میں ان کے ... عمل کو سلام کرتا ہوں۔ کاش ہمارے ہاں بھی چند ایسے ترقی پسند ہوتے جو نظریے کی تعبیر اپنے کردار سے کر سکتے اور امیروں، کبیروں اور وزیروں کی درباداری سے گریز کر سکتے۔ □

ہندی سے ترجمہ: تزئین فاطمہ روحی
ڈی۔۲۲۶۶، اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

اپیندر ناتھ اشک

کہانی کار ـــــ بلونت سنگھ

جہاں تک دلچسپی کا سوال ہے میرے ہمعصر اردو افسانہ نگاروں میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہے جس کے افسانے اتنے دلچسپ ہوں جتنے بلونت سنگھ کے، کہ انھیں بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہ ہو۔ کرشن چندر ا لیکن کرشن چندر فن کار ہیں افسانہ نگار نہیں۔ اپنے فطری فن کے بہاؤ میں وہ اپنی تصنیف پڑھوالے جاتا ہے۔ اگرچہ آخر میں کئی بار خاصی تشنگی ہوتی ہے۔ اس کے کچھ پہلے رومانی افسانوں کے علاوہ میں اس کی کوئی تصنیف دوبارہ، سہ بارہ نہیں پڑھ سکا۔ اس کے برعکس بلونت سنگھ کا افسانہ سامنے آجائے تو میں ہمیشہ اسے پڑھ جاتا ہوں۔ اور اس کے آٹھ دس افسانے تو ایسے بھی ہیں جنھیں نہ جانے کتنی بار پڑھا اور لطف اندوز ہوا ہوں۔

جیسا کہ میں نے کہا کرشن چندر فطری طور پر فن کار تھا۔ وہ ہمیشہ گٹ بنا کر چلتا تھا۔ ترقی پسندوں کا سرتاج تھا۔ اسے خوب شہرت ملی لیکن چونکہ نہایت تیز رفتار اسلوب کے علاوہ اس کے پاس نہ گہرائی تھی نہ وسیع النظری اس لئے اپنی زندگی ہی میں وہ پیچھے رہ گیا۔ منٹو جب تک زندہ رہا اسے خوب مخالفت ملی۔ پاکستان جا کر اس نے کچھ نہایت متنازع فیہ اور دو تین بے مثال کہانیاں لکھیں۔ وہ بھری جوانی میں انتقال کر گیا۔ اور کچھ عرصہ تک اردو ادب میں اس کا اتنا چرچا رہا کہ باقی سبھی افسانہ نگار پیچھے رہ گئے۔ پھر بیدی کا زمانہ آیا۔ خاص طور پر اس کے فلموں میں جانے، خوب پیسہ کمانے اور یار دوستوں پر اڑانے کے بعد عصمت اور قرۃ العین حیدر کا بھی تذکرہ ہوتا رہا لیکن افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ بھی استاد ہے۔ کسی نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا جبکہ میری نظر میں اپنے ہمعصروں میں کچھ پہلوؤں میں وہ لاثانی تھا۔

میں نے لاہور ۱۹۳۰ء میں چھوڑا تب تک بلونت سنگھ کا نام ادب میں نہیں تھا۔ دلی میں ’’آجکل‘‘ کے دفتر میں بھی اسے دیکھا تھا۔ جہاں اس نے کچھ سال ملازمت کی تھی۔ کرشن چندر نے حر کی تعریف سنی تھی۔ لیکن کرشن تو اپنے زمرہ کے سبھی لوگوں کی تعریف کیا کرتا تھا۔ بلونت سنگھ تو [illegible]

میں مجھے کہیں سے افسانہ نگار نہیں لگا۔ میں نے یہی سوچا کہ کرشن کا شاگرد ہے۔ اس لئے کرشن اس کی تعریف کر رہا ہے۔ میں نے بلونت سنگھ کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ کہ اس کی کوئی تصنیف ہی پڑھی۔ اس سلسلہ میں مجھے ۱۹۴۵ء کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

اردو ماہنامہ 'ساقی' کے مالک مدیر جناب شاہد احمد دہلوی سے خط و کتابت میں کچھ تلخی آگئی تھی۔ میں تنک مزاج ادیب اور وہ رئیس مزاج مدیر۔ کسی کام کے سلسلہ میں ان سے ۹۰۰ روپئے لئے تھے۔ کام ختم کر لیا تھا پر ان کی کسی بات سے ناراض ہو کر طے کیا کہ انھیں بھیجیں گے نہیں۔ اور روپیہ واپس کر دیں گے۔ رقم بڑی تھی۔ ہاتھ تنگ تھا۔ اس لئے اس کا انتظام کرنے کے لئے میں لاہور گیا۔ بیدی (راجندر سنگھ) نے ان دنوں 'سنگم پبلشرس' کے نام سے ایک اردو اشاعت گھر قائم کیا تھا۔ میں اپنے ساتھ کچھ مسودے بھی لے گیا تھا، مجھے یاد ہے بسنت روڈ پر سنگم پبلیشرس، کے دفتر کی ایک پچھلی کیبن میں میں نے بیدی کو اپنا ناٹک 'قید حیات' (ہندی میں قید) سنایا۔ بیدی نے جیسے ہی ناٹک سنا اور اس کی آنکھوں میں جو تاثر تھا اس سے لگا کہ ناٹک اسے پسند آیا۔ شاید اسے حسد بھی ہوا۔ لیکن اس نے کھل کر تعریف نہیں کی۔ وہاں سے اٹھا تو میں سبزی منڈی سے ہوتا ہوا سرکل روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں کس سے ملنے جا رہا تھا لیکن وہیں کہیں ایک شربت کی دوکان پر بلونت سنگھ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے شربت پینے کے لئے کہا ہوگا۔ میں نے گلاس لے لیا ہوگا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں بیدی کو ناٹک سنا آیا تھا۔ اور میں من کی بات نہیں چھپاتا۔ میں نے ناٹک کا ذکر کیا۔ بمبئی میں بنے بھائی کے گھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں اسے سنانے کا سب سے تعریف کرانے کا۔ لیکن بیدی کے چپ رہنے کا! ناٹک کا مسودہ میرے ہاتھ میں تھا۔ بلونت سنگھ نے کہا "کیا آپ یہ مسودہ مجھے دکھا سکتے ہیں"۔

میں نے انکار کر دیا۔ شاید یہ کہا کہ میرے پاس ایک ہی کاپی ہے۔ اور مجھے دو دن بعد بمبئی واپس جانا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ڈر بھی نہیں لگا۔ یہ پہلوان دکھائی دینے والا سکھ میرے اس ناٹک سے ناٹک کو سمجھ یا سراہ سکتا ہے۔ اگر مجھے یقین ہوتا تو جیسا کہ دوستوں کو اپنی تصنیف سنانے کی میری عادت ہے۔ میں اس کی جائے رہائش پر چلا جاتا یا اسے اپنی جائے رہائش پر لے آتا۔ یا ہم 'مکتبہ اردو' چلے جاتے اور میں وہ ناٹک اسے سناتا اور اس کی رائے لیتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے خوش روئی سے اسے ٹال دیا تھا۔

بلونت سنگھ نے ۱۹۶۰ء میں میری نصف صدی پر میرے بارے میں مختصر یاداشتیں لکھی

تھیں ۔ اس میں بلونت سنگھ نے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں اس کے پوچھنے پر ایک کے بعد ایک شربت کے تین گلاس پی گیا اور اس نے 'قید حیات' والے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تین گلاس پی جانے کی کوئی بات یاد نہیں ۔ نہ میں پی ہی سکتا ہوں لیکن اس واقعہ کی یاد آج بھی ہے ۔ مجھے یہ واقعہ اس لئے بھی یاد رہ گیا کہ بعد میں مجھے اپنی اس بیوقوفی کا اسی طرح ہمیشہ ملال رہا۔ جیسے منٹو کی کہانی 'خوشیا' کے بارے میں بے تکا ریمارک کسنے کا ۔

دو ہی سال بعد بلونت سنگھ کے بارے میں مجھے اپنی وہ رائے بدل دینی پڑی ۔

شاید ۴۷ء کے آخری ایام یا ۱۹۴۸ء کے شروع کی بات ہے میں تپ دق کی وجہ سے بھگلی میں علاج کروا رہا تھا کہ میری آنکھوں میں کچھ تکلیف ہوگئی ۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بمبئی کے ماہرین کو دکھانے کی رائے دی، میں بمبئی گیا تو آنکھوں کی جانچ پڑتال کرانے کے بعد اپنے ترقی پسند دوستوں سے ملنے کھیتواڑی میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر چلا گیا ۔ شمشیر سنگھ ان دنوں نہ صرف پارٹی کے ہول ٹائمر تھے بلکہ وہاں ہفتہ وار یا ماہ نامہ میں بھی کام کرتے تھے ۔ ملتے ہی انھوں نے کہا ۔

"یار تم نے بلونت سنگھ کی کہانیاں پڑھی ہیں ؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا ۔ شمشیر ناراض ہو گئے ۔"تم اتنے کیسے افسانہ نگار ہو کہ تم نے بلونت سنگھ کی کوئی کہانی نہیں پڑھی" ۔ اور شمشیر نے اس کے دو افسانوں کے مجموعوں 'جگا' اور 'تارو پود' کا ذکر کیا کہ انھوں نے دونوں کہانی کے مجموعے پڑھے ہیں اور وہ اسے بہت بڑا افسانہ نگار مانتے ہیں ۔ اور انھوں نے مجھے دونوں مجموعے پڑھنے کی صلاح دی ۔

گورنر ہاؤس کھیتواڑی سے (جہاں کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تھا) اتر کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بھنڈی بازار جاکر اردو بک سیلر کے یہاں سے دونوں کتابیں لے آیا ۔ بھگلی پہنچ کر میں نے دونوں کو پڑھا تو مبہوت رہ گیا ۔ کچھ کہانیاں مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں نے بلونت سنگھ کو ایک بہت لمبا خط لکھا ۔ اس کا پتہ میرے پاس نہیں تھا اتنا معلوم تھا کہ الٰہ آباد میں رہتا ہے اور محمود احمد ہنر کے ساتھ مل کر 'فسانہ' نام سے افسانوں کا ایک میگزین نکال رہا تھا ۔ میں نے وہ خط 'فسانہ' کی معرفت بلونت سنگھ کو بھیجا تھا ۔ بلونت سنگھ نے اس کی کوئی رسید نہیں دی ۔

جون ۱۹۴۸ء میں میں الٰہ آباد آ گیا ۔ "نیلابھ پرکاشن" قائم ہوگیا تو محمود احمد ہنر میرے یہاں دو گھنٹوں کے لئے کام کرنے لگے ۔ ان دنوں بلونت سنگھ میر گنج میں ایک ہوٹل چلاتا تھا ۔ ہوٹل تو اس کے والد کا تھا ۔ ان کے انتقال کے بعد اس نے سنبھال لیا تھا ۔ ہنر سے اس کی بہت گہری دوستی تھی اور

وہ بلونت سنگھ کی اردو تصنیف کو ہندی کی شکل دینے میں مدد کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بلونت سنگھ کی منتخب کہانیوں کا ایک مجموعہ 'پنجاب کی کہانیاں' کے عنوان سے اونکار شرد نے 'لہر پرکاشن' سے چھاپا تھا۔ اتنی ساری اچھی کہانیاں بعد میں بلونت سنگھ کے کسی مجموعہ میں نہیں آئیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب شروع شروع میں ہنر میرے یہاں آنے لگے تو "فسانہ" پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ اور وہ اسے پھر نکالنے کی اسکیم بنا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے میری کہانیوں پر ایک طویل مضمون بھی لکھوایا تھا۔ وہ کبھی شائع نہیں ہو پایا۔ کیوں کہ ہنر "فسانہ" نکال نہیں پائے۔ تبھی میں نے ان سے اپنے اس خط کا ذکر کیا تھا۔ جو میں نے بلونت سنگھ کو ہنگنی سے "فسانہ" کے پتہ پر لکھا تھا۔ ہنر نے بتایا کہ خط مل گیا تھا اور بلونت سنگھ کو دے دیا گیا تھا۔

اس بیچ میں نے بلونت سنگھ کو کئی بار دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت اور قابل دید آدمی تھا۔ پورے رکشا پر کسی تھانے دار کی طرح وہ اپنے تنومند جسم کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک بڑا سا السیشین کتا لیٹا رہتا تھا اور وہ اس شان سے رکشا پر بیٹھا کبھی سول لائینز میں اور کبھی کبھی پاور ہاؤس والی سڑک پر نظر آجاتا۔ میں نے اس کی کہانیاں نہ پڑھی ہوتیں تو میں کبھی اس کا نوٹس بھی نہ لیتا۔ لیکن یہی وہ بلونت سنگھ ہے جس نے پنجاب کے بارے میں آتنی شاندار کہانیاں لکھیں ہیں اور اسی کو میں نے اپنا ناٹک دکھانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات ہمیشہ مجھے اس سے ملنے کے لئے اکساتی۔ میں نے ہنر سے کہا تو اس نے مجھے ملانے کا وعدہ کیا اور ایک دن میں ہنر کے ساتھ بلونت سنگھ سے ملنے اس کے ہوٹل پہنچا۔

بلونت سنگھ کے ہوٹل کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے امپیریل ہوٹل تھا۔ میر گنج میں طوائفوں کے چوبارے کے سامنے وہیں جہاں گھی والوں کی دوکانیں ہیں۔ ہوٹل پہلی منزل پر تھا۔ ہم گئے تو ہوٹل کے ایک گھوڑ مونہے گندے سے بیرے نے ہمیں اسی پہلی منزل پر منیجر کی چھوٹی سی بیضوی میز کے پاس بٹھا دیا اور چٹ لے کر اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہم کم سے کم آدھ پون گھنٹہ اس کا انتظار کرتے رہے۔ تب وہ دستار سجائے سجا بجا، فٹ فاٹ کہیں اوپر سے نیچے اترا۔ اگر میرے دل میں اس کی کہانیوں کے لئے اتنا احترام نہ ہوتا تو میں پانچ یا دس منٹ کے بعد اٹھ کر چلا آتا۔ میں اعتراف کرلوں کہ اتنی دیر تک بٹھایا جانا مجھے بہت ناگوار گزرا تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ ہنر کے ساتھ باتیں کرنے میں وہ وقت کٹ گیا لیکن لگاتار میرے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ بلونت سنگھ مجھے بے عزت کر رہا ہے۔ شاید وہ شربت کی دوکان والے

قصہ کو نہیں بھولا اور اس کا بدلہ چکا رہا ہے۔

مجھے اس ملاقات کے سوا کچھ بھی یاد نہیں کہ بلونت سنگھ بڑی بے تکلفی سے ملا تھا۔ میں نے اس کی کہانیوں اور اپنے لمبے خط کا ذکر کیا۔ بلونت سنگھ نے کہا کہ وہ تو ایسے ہی موڈ آنے پر کہانیاں لکھ دیتا ہے۔ اس کی کہانیاں کبوتر ہیں جنھیں وہ اڑاتا رہتا ہے۔ اس کے پاس ان کے تراشے بھی نہیں رہتے وغیرہ . . . . وغیرہ اور آخر میں اس نے مجھے کوئی مجموعہ چھاپنے کے لئے کہا۔

مجھے اس کا برتاؤ اس کا غرور و تکبر اور نک چڑھا پن، ہمیں بہت دیر تک نیچے بٹھائے رکھنا، مصنف نہ سمجھ کر مجھے ناشر سمجھنا سب کا سب بہت برا لگا۔ لیکن میرے کردار کی یہ خامی ہے کہ اگر مجھے کسی کی تصنیف بہت پسند آتی ہے تو میں کئی بار اس کے برتاؤ کی پروا نہیں کرتا۔ میں اس سے ملنا چاہے چھوڑ دوں لیکن اس کی تصنیف کی برائی نہیں کر سکتا۔ بلونت سنگھ کی کہانیوں نے میرے دل کو کچھ ایسے جیت لیا تھا کہ میں نے الہ آباد کی اس پہلی ملاقات کی بد اخلاقی کی فکر نہیں کی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے دو تین بار پھر اکیلا اس کے ہوٹل گیا جب اس نے ہر بار وہی برتاؤ کیا تو شاید تیسری یا چوتھی بار میں نے اس سے کہا —— "دیکھو بلونت، میں تمھارے یہاں اس لئے آتا ہوں کہ مجھے تمھاری کہانیاں پسند ہیں۔ پر تم ہر بار مجھے پبلشر سمجھ کر میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہو۔ اب میں تمھارے یہاں نہیں آؤں گا۔"

بلونت سنگھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے پھر مجھے نیچے نہیں بٹھایا اور پھر میں اس سے ملنے گیا تو اس نے اوپر بلایا۔ بہنر نے مجھے بتایا کہ ہوٹل میں اس کا دل نہیں لگتا۔ چونکہ اس کے والد ہوٹل چلاتے تھے اس لئے ان کے انتقال کے بعد ماں کی خوشی کے لئے اس نے اسے سنبھال لیا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھتا ہے۔ صبح لکھتا ہے۔ بغیر پوری طرح تیار ہوئے وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا ہے۔ (بعد میں جب ڈاڑھی اور بالوں میں خضاب لگانے لگا تو اس کی دقت اور بڑھ گئی) ان کی حسب خواہش میں ذرا دیر میں جاتا۔ میری چٹ ملتے ہی وہ مجھے اوپر بلا لیتا۔ مجھے یاد ہے دو ایک بار میں تین منزلے پر اس کے کمرے کے باہر چھت پر بھی بیٹھا۔ ایک اتوار اس نے سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی بھی کھلائی۔ ایک بار اس نے میرے ساتھ گرمیوں کی شام میں گئوگھاٹ سے سنگم تک کشتی کی سیر بھی کی۔ میں نے جب بلایا وہ میرے یہاں آیا۔ سنکیت (اردو) میں، میں نے اس کی کہانی گرستھی شامل کی۔

بلونت بہت ہی کمپلیکس (پیچیدہ) شخصیت کا مالک تھا۔ حالانکہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ

میں اسے پوری طرح جان گیا ہوں کیونکہ اس کے ساتھ برسوں رہ کر بھی اسے پوری طرح جان پانا آسان نہیں تھا۔ لیکن میں اس کی بہت سی سنکوں سے واقف ہو گیا۔

ویسے حد اسناب آدمی تھا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے کرشن، بیدی، منٹو یا اپنی کسی کہانی کی تعریف نہیں سنی۔

وہ خاصا "ان سوشل" آدمی تھا لیکن جب وہ ہوٹل چلاتا تھا تو شام کو اپنے کتے کے ساتھ اپنے ہوٹل کی ضرورتوں کے تحت سول لائنز کی اینگلو انڈین بستی میں ضرور گھومنے جاتا تھا۔ ہوٹل بیچ کر نیتا جی نگر چلا گیا تو دوپہر کو سول لائینز آتا تھا۔ لوک بھارتی میں بیٹھتا تھا۔ میں "نیلابھ پریس" میں ہوتا تو وہاں آجاتا۔ اسے کافی ہاؤس میں بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ وہ ایل چیکو کی باوقار تنہائی میں بیٹھنا اور وہاں کافی پینا پسند کرتا تھا۔ عام طور سے بارہ یا تین بجے کے شو میں پیلیس میں چلا جاتا اور اکیلے پکچر دیکھتا۔ چونکہ میں اس کا مداح تھا اس لئے میں تیسرے چوتھے مہینے اس سے ملنے چلا جاتا۔ وہ جس حالت میں بھی ہوتا، بلا لیتا۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھتا۔ عام طور سے کھانا وہیں کھاتا۔ چائے بھی وہیں پیتا۔ لیکن ان تیس چالیس برسوں کے عرصہ میں وہ ایک بار بھی صرف ملنے یا گپ لگانے میرے یہاں نہیں آیا۔ وہ جب بھی آیا، کام سے آیا۔ یا میرے یہاں ہونے والی کسی محفل یا دعوت میں شامل ہوا۔ وہ وقت کا بہت پابند تھا۔ جب بھی میرے یہاں محفل ہوئی وہ ہمیشہ عین وقت پر پہنچ گیا اور اپنے بعد آنے والوں کو اپنی خاموش موجودگی سے شرمندہ کرتا رہا۔ لیکن اپنی اس مہذب اسنابری کے باوجود وہ اول درجے کا لطیفہ گو اور حاضر جواب آدمی تھا۔ پھوہڑ اور فحش لطیفہ سنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

چونکہ اس نے صرف لکھنے پر زندہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے عام طور پر پرچوں اور رسالوں کے لئے ڈھیروں دوسرے تیسرے درجہ کی کہانیاں لکھ دیتا تھا۔ ناول یا کہانیاں رسم الخط بدل کر لکھ دیتا تھا۔ دو ایک کے حیدم قلمی نام سے بھی اس نے کچھ کہانیاں لکھیں ہیں۔ مجھے یاد ہے ان میں ایک کہانی 'یکہ' میں نے بھی پڑھی تھی اور مجھے اچھی لگی تھی۔ قلم پر زندہ رہنے کی وجہ سے شاید وہ کہیں زیادہ کنجوس اور حسابی کتابی بھی ہو گیا تھا۔ لیکن بائیں ہاتھ سے کہانیاں دھڑ گھسیٹنے کے باوجود اسے اچھی بری کہانیوں کی تمیز تھی۔ جب 'پنجاب کی کہانیاں' کے سوا اس کا کوئی مجموعہ نہ چھپا تھا اور میں اس کی کہانیوں کی بہت تعریف کرتا تھا تو پہلے وہ مجھ پر زور دیتا تھا کہ میں اس کی کہانیوں کا ضخیم مجموعہ چھاپوں اور خود ہی پیش لفظ لکھوں۔ پھر اس نے کہا کہ میں اسے ناشر ڈھونڈ

دیں۔ میں نے تین بار مختلف پبلیشروں پر زور دے کر اس کی کہانیوں کے مجموعہ کی بات کرا دی پھر تینوں نے ایک کو بھی اپنی بہترین کہانیاں نہیں دیں۔ حالانکہ پبلیشروں سے بات بہترین کہانیوں کی ہی ہوئی تھی۔ وہ دو بہترین کہانیوں کے ساتھ باقی عام کہانیاں جوڑ دیتا تھا۔ ہندی میں ابھی تک اس کی کہانیوں کا سب سے اچھا مجموعہ وہی ہے۔ جو "اونکار شرد" نے چھاپا تھا۔ اتنی ساری بہترین کہانیاں اس کے کسی مجموعہ میں نہیں ہیں۔ ایک ہی نقص ہے۔ اس کی ہندی ترجمہ کی ہندی ہے۔ لیکن یہ نقص تو اردو سے ہندی میں آنے والے ہر مصنف کی ابتدائی کہانیوں میں مل جائے گا۔ میرے یہاں بھی ہے اور پریم چند کے یہاں بھی۔ الہ آباد میں آئے مجھے کچھ ہی سال ہوئے تھے جب اس نے پہلی شادی کی۔ وہ ایک شام اپنی بیوی کو لے کر ہمارے یہاں آیا بھی تھا۔ اس کی پہلی بیوی کچھ ایسی خوبصورت نہیں تھی، بدصورت بھی نہیں تھی بس اوسط تھی۔ بلونت سنگھ اس کے مقابلہ میں بہت خوبصورت تھا۔ کچھ ہی دن بعد ہنر نے بتایا، اس نے بیوی چھوڑ دی۔ یا اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ سانحہ جیسے بھی ہوا بلونت سنگھ کو کچھ عجیب سی نفسیاتی الجھن میں چھوڑ گیا۔ بلونت سنگھ نے اس کے کئی برس تک شادی نہیں کی۔ اس دوران اس کے کردار میں کئی طرح کی گتھیاں پیدا ہوگئیں۔ برائیاں بھی۔ پھر جب اس کی عمر پچاس کو پار کر گئی اس نے اچانک دوسری شادی کر لی۔ اپنے سے بیس پچیس سال چھوٹی لڑکی کے ساتھ۔ اس کے دو بچے ہوئے، ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ بچے بہت ہی پیارے اور سلجھے ہوئے ہیں۔ بلونت سنگھ انھیں بہت پیار کرتا تھا اور اسے ان کی بہت فکر تھی۔

بلونت سنگھ کے دوستوں میں ہنر کے علاوہ حکیم حمید عثمانی بھی تھے۔ حمید صاحب ادب نواز آدمی ہیں۔ میں کوشلیا کے علاج کے سلسلہ میں بڑے عثمانی صاحب سے ملنے جاتا تھا تو حمید کے پاس بھی بیٹھتا تھا۔ دو ایک بار وہیں بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ ایک بار ہم وہاں سے اٹھے تو اکٹھے گھومتے رہے۔ تب باتوں باتوں میں، میں نے اسے کچھ چیزوں سے خبردار کیا تھا۔ لگتا ہے اس نے میرے مشورہ پر دھیان نہیں دیا۔ کچھ ہی برس بعد وہ بیمار رہنے لگا، بہت ہی پرہیزی کھانا کھانے لگا۔ اس کی آنتوں یا معدے میں تکلیف ہوگئی۔ پھر اسے گولو کوما ہوا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی لگ بھگ چلی گئی۔ دن رات لکھنے پڑھنے والے کو اس سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ بستر سے لگ گیا۔ اپنے جسم اور لباس کے بارے میں اس کی ساری سنکیں جاتی رہیں۔ اسے ایسی بیمی حالت میں دوستوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔ لیکن ایسا بھی وقت آیا کہ وہ بہت اکیلا محسوس کرتا اور دوستوں سے ملنے کے لئے تڑپتا تھا۔ میں جب اس کے یہاں جاتا اسے دیکھتا تو میرے سامنے

الٰہ آباد کے شروع کے دنوں میں اپنے ایلسیشین کے ساتھ رکشا پر بیٹھے ہوئے اس کی تصویر گھوم جاتی اور مجھے بہت تکلیف ہوتی۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں میرے دو افسانہ نگار دوست (بیدی اور بلونت) زندگی کے بارے میں ایک چھوٹی سی بات پر دھیان نہ دینے کی وجہ سے لگ بھگ ایک جیسی مہلک بیماری سے برسوں بستر پر پڑے رہ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ دونوں بہت پڑھے لکھے عالم فاضل اور اپنے فن کے استاد افسانہ نگار تھے اور دونوں کو میں نے بروقت خبردار بھی کر دیا تھا تو میرا دماغ بے حد پریشان ہو جاتا ہے۔

آخری بار دو مہینے پہلے پنجاب سے لوٹ کر میں اس سے ملا تھا۔ اس نے سر کے بال کٹوا دیئے تھے۔ داڑھی کے بال بھی بہت چھوٹے کروا دیئے تھے۔ حالانکہ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا لیکن اس کا چہرہ تب بھی خوبصورت لگتا تھا۔ کسی فلسفی کا سا۔ میں پہلے کی طرح لگ بھگ سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ اب وہ بہت دن نہیں رہے گا۔ میں نے شریمتی شیلا سندھو کو خط لکھا تھا۔ وہ خود بیماری کا علاج کرا کے شملہ سے لوٹی تھیں۔ انھوں نے جولائی میں آنے کے لئے لکھا تھا لیکن بلونت سنگھ نے جولائی کا انتظار نہیں کیا۔ وہ ۲۷ مئی کی شام کو چلا گیا۔

مجھے ۲۸ کو صبح ساڑھے نو بجے فون پر اس کے انتقال خبر ملی۔ یہ بھی کہ جنازہ نیتا نگر سے دس بجے اٹھے گا۔ میں رات ایک دو بجے تک کام کرتا ہوں۔ صبح تیار ہونے میں دیر ہو جاتی ہے۔ یوگا بھی کر رہا تھا اسے بیچ میں چھوڑ کر قمیص پتلون پہنی۔ پوتے کے ساتھ اسکوٹر پر چل دیا۔ بدقسمتی سے اسکوٹر اسٹیشن سے ذرا پہلے خراب ہو گیا۔ خیال تھا ٹھیک ہو جائے گا۔ جب پانچ سات منٹ میں ٹھیک نہیں ہوا، تو پوتے کو گھر واپس جانے کے لئے کہہ کر میں رکشا لے کر چل پڑا۔ میں صرف تین منٹ دیر سے پہنچا۔ چند عورتیں لاش گاڑی کو روانہ کر کے بلونت سنگھ کی بیوی کو سہارا دیئے لوٹ رہی تھیں۔ ان میں شریمتی شکنتلا سروٹھیا بھی تھیں۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے اتنے نزدیک سامنے والی گلی میں رہتی ہیں۔ میں اتنی بار بلونت سے ملنے گیا، میں نے کبھی انھیں وہاں نہیں دیکھا۔ وہ بلونت سنگھ کے بارے میں اپنی یادیں بتاتی رہیں۔ انھوں نے وہ چھوٹا سا مضمون دکھایا جو انھوں نے بلونت سنگھ کو جھیل کی تشبیہہ دیتے ہوئے اس پر لکھا تھا۔ وہ فوٹو دکھایا جس میں انھوں نے بلونت سنگھ کی عزت افزائی کی تھی۔ وہ انھیں دیدی کہنے لگا تھا۔ وہ اس سے بڑی تھیں۔ وہ اسے تسلی دیتیں تو وہ اپنی دیدی کے گلے میں باہیں ڈال دیتا۔

.... بیچارہ بلونت سنگھ! وہ کتنا اکیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے جنازے کے ساتھ ینگ کرسچن کالج کے شعبۂ اردو کے صدر جناب ساحل احمد کے علاوہ کوئی مصنف شامل نہیں ہوا۔ کسی ہندی کے روزنامہ نے ڈھنگ سے خبر نہیں چھاپی اور یہ الہ آباد ہے جو بیس سال پہلے صوبے کا تہذیبی دارالحکومت کہلاتا تھا۔ ہندی، اردو کا اتنا بڑا افسانہ نگار اس تہذیبی دارالحکومت سے یوں بے یار و مددگار چلا گیا۔

میں کبھی بلونت سنگھ سے اس کے افسانوں اور اس کے فن کے بارے میں پوچھتا تو ہمیشہ یہی کہتا کہ اسے افسانوں کے فن وان کی کوئی سمجھ نہیں۔ اور وہی جملہ کہ اس کے افسانے تو کبوتر ہیں جنھیں وہ اڑا دیتا ہے۔ ہندی میں جینیندر بھی کچھ ایسی ہی بات کیا کرتے ہیں۔ جینیوں کی یہ بھی ایک ادا ہے۔ میں نے جب جب اس کی کہانیاں پڑھی مجھے ہمیشہ لگا کہ وہ اپنے فن کا استاد ہے۔ مجھے اس کی بہترین کہانیوں میں کہیں کوئی نقص نہیں دکھائی دیا۔ اس کا فن ایک دم کسا ہوا چست اور درست ہے۔ کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں جو کاٹا یا جوڑا جا سکے۔ شروع سے لے کر آخر تک ان میں تسلسل بنا رہتا ہے۔ میں نے کئی بار اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ ٹال گیا۔ ایک ڈیڑھ برس پہلے جب لگا کہ بلونت سنگھ بہت دن نہیں چلے گا۔ ایک بار جب اس کا موڈ کچھ ٹھیک تھا میں اس سے طے کر کے ٹیپ ریکارڈر لے کر تلک راج گوسوامی کے ساتھ اس کے یہاں گیا اور میں نے اس کا ایک لمبا انٹرویو لیا۔ پچھلے کچھ سالوں میں پاکستان، انگلستان اور ہندوستان کے اپنے دوروں میں خاص کر پنجاب میں، میں نے بلونت سنگھ کا بہت ذکر کیا۔ اس کے بارے میں کافی لکھا۔ وہ مجھ سے کافی کھل گیا تھا۔ اس انٹرویو میں فن کے بارے میں اس نے جو کہا اس سے میرا یقین پکا ہو گیا کہ وہ ایسا جینئس نہیں تھا کہ جو ایسے ہی لکھ دے اور تصنیف دلچسپ بن جائے۔ بلکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے۔

جب میں نے اس سے اپنے فن کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ کہنے کا اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ اس سلسلہ میں اس کے استاد نے اسے دو لفظ بتائے تھے۔ قاطع اور جامع۔ اور بلونت سنگھ نے اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ نما نظریہ دیا۔ قاطع کا مطلب ہے وہ لفظ یا جملہ جو کٹ سکے اور جامع کا مطلب وہ تحریر جو جمی ہوئی جامع ہو۔ قاطع کے سلسلہ میں بلونت سنگھ نے وہ قصہ سنایا۔

ایک بار یونان کے ایک شہر کو دشمن نے گھیر لیا اور آخری ہلا بولنے سے پہلے دشمن نے پیغامبر کے ہاتھ ایک چٹھی شہر کی حفاظت کرنے والے فوجی کمانڈر کو بھیجی۔ اس نے لکھا —— "اگر ہم فتح حاصل کر لیں گے تو ہم شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اگر ہم فتح حاصل کریں گے تو سارے مردوں

کو تلوار کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اگر ہم فتح حاصل کریں گے تو بچوں کو تلوار کی نوکوں پر اچھال دیں گے اگر ہم فتح حاصل کریں گے تو سب عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے وغیرہ.... وغیرہ۔ کمانڈر نے ان دھمکیوں بھرے خط کے جواب میں صرف ایک لفظ لکھا ۔۔۔۔"اگر"!

اور یہ کہہ کر بلونت قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ حالانکہ یہ قصہ اس نے لطیفے کے طور پر سنایا لیکن افسانہ نگاری کے عنوان میں اس نے بہت گہری بات کہہ دی اور اس کے بہترین افسانے اس اصول پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں کوئی لفظ یا جملہ یا واقعہ فالتو نہیں ہے اور وہ پوری طرح چست اور پختہ ہیں۔

بلونت سنگھ کو کہانی سنانے میں بھی کمال حاصل تھا۔ ایک بار میں اور تلک راج گوسوامی اس کے یہاں گئے تو چونکہ میں اس سے کہا کرتا تھا کہ اگر اس کی آنکھیں خراب ہو رہی ہیں تو وہ اپنی کہانیاں ڈیکٹیٹ کیوں نہیں کراتا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ایک کہانی ڈیکٹیٹ کرائی ہے اور اس نے وہی کہانی سنائی۔"زن گزراں" یعنی راستہ چلتی عورت۔ اور وہ کہانی مجھے پوری کی پوری آج بھی یاد ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ کہانی اس کی بہت اچھی کہانیوں میں ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ لکھی ہوئی کہانی سنی ہوئی کہانی سے کسی طرح کمتر نہیں تھی۔ ذرا بہتر بھلے ہی تھی۔ لگتا ہے کہ پوری کی پوری کہانی اس کے دماغ میں آتی تھی اور وہ اسے کاغذ پر اتار دیتا تھا۔

ایک بار بلونت سنگھ کی تصانیف پر رویندر کالیا سے بحث ہو رہی تھی تو اس نے بلونت سنگھ کی تصانیف کو پیشہ ور کی تشبیہہ دی۔ اس انٹرویو میں، میں نے اسے جو بھی جواب دیا ہو۔ لیکن اس کے بعد میں کالیا کی بات پر سوچتا رہا ہوں۔ میں "اگیہ" کی کہانی" بیلی یون کی بطخیں" اور منٹو کی "بو" کا مداح ہوں۔ فن کے نظریہ سے میں انھیں دلچسپ تصنیف بھی مانتا ہوں۔ لیکن میں انھیں دو ایک بار سے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ جب کہ بلونت سنگھ کی کہانی "گرنتھی" یا "اپلے"، "تین باتیں" یا کالی تیتری" کو میں نہ جانے کتنی بار پڑھ گیا ہوں۔ جب بھی بلونت سنگھ کی کتابیں سامنے آتی ہیں. میں یہ کہانیاں پڑھ جاتا ہوں۔

پیشہ ورانہ تو جاسوسی ناول ہوتے ہیں لیکن میں کبھی جاسوسی ناول نہیں پڑھتا۔ محض قارئین کے لطف اندوز ہونے کے لئے ادب لکھنا مجھے طوائفانہ انداز میں جینا لگتا ہے۔ میں خود فن برائے فن کا قائل نہیں۔ فن میں خوبصورتی بھلے ہی نہ ہو پر سچائی اور حقیقت تو ہونا ہی چاہئے۔ میں ایسا مانتا ہوں۔ پھر بلونت سنگھ میں کیا ہے جو میں اسے بار بار پڑھتا ہوں؟ میں نے بلونت سنگھ سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا تھا کہ وہ کیوں لکھتا ہے؟ یعنی کس مقصد کے تحت لکھتا ہے؟ اس نے کہا "اشک"

دنیا میں بہت دکھ ہیں۔ اگر میں اپنی کسی کہانی سے قارئین کو تھوڑی راحت دے سکوں، تو کیا برا ہے؟"

بلونت سنگھ سے انٹرویو تو میں نے بعد میں لیا تھا، کالیا نے مجھ سے انٹرویو پہلے لیا تھا اور میں نے جو یہ کہا تھا کہ بلونت سنگھ کی تخلیقات سکون دیتی ہیں تو غلط نہیں کہا تھا۔ اس نظریہ سے بلونت سنگھ موپاساں، او۔ہنری اور ماحم کے درجہ کا افسانہ نگار ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ان سے بہتر فن کار ہے۔ یہ بات میں بلونت سنگھ کی چند کہانیوں کو کئی بار پڑھنے کے بعد جان سکا کہ ان میں کیا خوبیاں ہیں، جو وہ راحت دیتی ہیں اور ان عظیم افسانہ نگاروں کے پرلطف افسانوں کے بہ مقابلہ بار بار پڑھی جاتی ہیں۔

پہلی خوبی تو ہے کہ بلونت سنگھ کی سیدھی، عام فہم، رواں دواں زبان۔ فن کارانہ انداز اور کہانی کا ابتدا سے انتہا تک چست اور درست ہونا!

پھر اس کی نثر میں شعریت کا عنصر ہے۔ "گرنتھی"، "البیلے"، "گمراہ"، وغیرہ افسانوں میں ایسی شاعرانہ عکاسی ہے کہ یک بیک دل تعریف کر اٹھتا ہے۔

ان دو خوبیوں کے علاوہ بلونت سنگھ جس کردار کو ابھارتا ہے اس کے لئے پڑھنے والوں کے دل میں ہمدردی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر چاہے وہ گرنتھی ہو، جگا ڈاکو، ہو یا جتا سنگھ۔ عجیب بات ہے کہ اس کی کچھ کہانیوں کے منفی کردار ہیرو جیسی اہمیت پا لیتے ہیں۔

وہ کہانی میں اتنا زیادہ تناؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جب وہ آخر میں ریلیف دیتا ہے، کتھارسس پیدا کرتا ہے تو بے انتہا راحت پیدا کر دیتا ہے۔ ارسطو کی طرح بلونت سنگھ بھی تسلیم کرتا ہے کہ راحت ہی فن کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ "گرنتھی" کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ نتیجے پر پہنچ کر آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ جاتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی بہترین کہانیوں "گرنتھی"، "تین باتیں"، "دنڈ"، "گمراہ"، "جگا"، "خودداری"، "دو لمحے"، "پہلا پتھر"، میں بلونت سنگھ کی ہمدردی ہمیشہ "انڈر ڈاگ" کے لئے رہتی ہے، اس کے لئے جو دکھ پاتا ہے۔ جب ایسے آدمی کو کہانی میں راحت ملتی ہے تو پڑھنے والا بھی راحت محسوس کرتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں بھلے ہی اس کے اجنبی، ناپسندیدہ ترقی پسند کہانیوں کے جوہر آ گئے ہیں "تین باتیں" کا منظر اتنا تیکھا اور وار اتنا کاری ہے کہ اس کے فن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ منٹو نے "بو" میں ایک تجریدی احساس کو متشکل کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کہانی فن

کا ایک بے مثال نمونہ بن گئی ہے۔ بلونت سنگھ کی دو کہانیوں 'گرنتھی' اور 'تین باتیں' میں بھی یہی خوبی ہے۔ "ٹرانس" یعنی دماغ کا گنبد ہونا ایک بے شکل خامی ہے۔ بلونت سنگھ نے گرنتھی اور تین باتیں میں اس بے پیکریت کو بے مثال مہارت سے مکمل پیکریت دے دی ہے۔ کوئی بڑا فن کار ہی یہ کرشمہ کر سکتا ہے۔ بلونت سنگھ نے گرنتھی اور کلیپ سنگھ کی تصویر کشی ایسے ہاتھوں سے کی ہے کہ ان دونوں کی سادہ لوحی ہماری داد جیت لیتی ہے۔

کسی بھی فن کار کا جائزہ ہمیشہ اس کی بہترین کہانیوں سے لینا چاہئے۔ اور بہترین کہانیوں میں بلونت سنگھ عظیم افسانہ نگار ہے۔ آج سے لگاتار بیس سال پہلے بلونت سنگھ کے بارے میں لکھا تھا۔

" بلونت سنگھ کے یہاں نہ کرشن چندر جیسی برہمی ہے —— نہ منٹو جیسی پشیمانی اور نہ ہی بیدی جیسی ہمدردی۔ انسان کی فطرت کے نقطۂ نظر سے اس کے ہونٹوں پر محض ایک مسکراہٹ آتی ہے اور وہی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے ہوئے وہ انسان کو اپنی کہانیوں میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی اور کہیں کہیں وہ مجھے اپنے ہمعصروں کے بمقابلہ کہیں بڑا افسانہ نگار لگتا ہے پنجاب کے دیہات کے —— یوں کہیں کہ سکھ جاٹوں کی تصویر کشی میں کوئی ثانی نہیں ہے۔

اس بیان میں، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، میں اتنا اور جوڑنا چاہوں گا کہ بلونت سنگھ کے دل میں "انڈر ڈاگ" کے لئے ستائے جاتے یا دکھ پانے والے کے لئے بے حد ہمدردی ہے۔ پھر وہ 'ڈنڈا' کی اجیت کور ہو، 'گرنتھی' کا گرنتھی ہو، جگا کا دلیپ سنگھ یا گمراہ کا گھر سے بھاگا ہوا بچہ ہو۔ بلونت سنگھ کیتھارسس (ریلیف) کا ماسٹر ہے اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایسی راحت دیتا ہے جو بڑے بڑے افسانہ نگار نہیں دے پاتے۔ اس کی کہانیوں میں جگا، ڈنڈا، البیلے، دیمک، گرنتھی، تین باتیں، خودداری، یہ لمحے، پہلا پتھر، سورما سنگھ۔ اور سمجھوتہ اس کے افسانوی فن کا ایک اعلیٰ ترین رخ پیش کرتی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا بلونت سنگھ کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور اس کی پسندیدہ کہانیوں کے ساتھ کالی تیتری اور گمراہ جیسی 'ڈیلیکیٹ' کہانیوں کو بھی لوگ سراہیں گے اور 'کوکے پریمی' اور 'راستہ چلتی عورت' (کوچہ گرد) جیسی کئی خوبصورت کہانیاں بھی قارئین کے سامنے آئیں گی۔ □

2, YOGIRAJ ASHRAM
NEW LINK ROAD
KALINA, BOMBAY-400098

سریندر پرکاش

بچپن میں سُنی ہوئی ایک کہانی

(کرشن چندر کے نام)

اندر بگ کی سرائے میں اکیلا بیٹھا، میں راستے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

باہر بوندا بوند بارش کا پانی زمین پر پھیلے ہوئے کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ آتش دان میں میں نے ایک ایک لکڑی جلانا شروع کر دیا ہے۔ اور سرائے کے چوکیدار کی راہ دیکھ رہا ہوں، جو میرے لئے کھانے پینے کا سامان لینے دیور گیا ہوا ہے۔

دیور یہاں سے سڑک سے تین کلومیٹر ہے اور اگر شارٹ کٹ سے جایا جائے تو ایک کلومیٹر کے قریب پڑتا ہے ـــــ چوکیدار امیر اللہ شارٹ کٹ سے ہی گیا تھا ـــــ لیکن آج تین دن ہو گئے ہیں لوٹ کر نہیں آیا۔

کل رات خواب میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں مکئی کے بھٹے لے کر آ رہا ہے۔ مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کا پورا کیچڑ میں دھنستا چلا گیا۔ میں کمبل اوڑھے آتش دان کے پاس بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا۔ صرف اس کے دونوں ہاتھ ہی جن میں اس نے بھٹے پکڑ رکھے تھے۔ سطح زمین کے اوپر نظر آتے تھے۔ ایسے لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ دراصل مکئی کے پودے کے ڈنٹھل ہیں اور یہ منظر بالکل بے حرکت ہو گیا تھا۔

میں اسی طرح آتش دان کے قریب کمبل اوڑھے بیٹھا ہوں۔ جیسے کہ خواب میں بیٹھا تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہیں، دروازے کے فریم میں سے جو دنیا نظر آ رہی ہے اس سے زیادہ کا تصور کرنا اس وقت ممکن نہیں ـــــ کہ مایوسی کے عالم میں ہر چیز اپنے اصلی حجم سے سکڑ جاتی ہے۔

وہ خواب تھا ـــــ مگر یہ حقیقت ہے کہ میری بھوک شدید صورت اختیار کر چکی ہے۔ امیر اللہ کو اتنی دیر نہیں لگانا چاہئے تھی ـــــ اس کے قدم یہاں کی زمین پر چلنے کی مہارت رکھتے تھے۔ یہاں

کی بارش سے وہ آشنا تھا اور یہاں کے موسم میں وہ جنما پلا تھا۔
اس نے جانے سے پہلے ایک بات ضرور کہی تھی۔کہ اگر یہ بے موسم کی بارش جلد نہ رکی تو برف باری شروع ہو جائے گی۔مگر تین دن ہو گئے ہیں، نہ بارش رکی ہے اور نہ برف باری ہوئی ہے اور نہ ہی وہ لوٹ کر آیا ہے۔

میرے پاس جتنے بھی پیسے بچ رہے تھے۔ وہ میں نے اسے دے دیئے تھے۔ بولا تھا، کھانے کے لئے جو بھی جتنا بھی ملے لے آنا ـــــ اور کچھ سگریٹ ضرور لانا۔
اندر بگ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جس میں کل ملا کر دس بارہ گھر ہیں۔ ہر گھر زمین سے تین چار فٹ اونچا بنایا گیا ہے ـــــ لکڑی کے یہ مکان دور سے کھلونوں جیسے دکھائی دیتے ہیں، ہر گھر میں ایک آدھ خاندان رہائش رکھتا ہے۔خاندان کا بڑا محنت مزدوری کرتا ہے، اپنے چھوٹے سے کھیت میں کھیتی کرتا ہے۔پھولوں کے باغ کی نگہداشت کرتا ہے اور رات کو اندھیرے گھر میں اپنی عورت کے ساتھ لگ کر سو جاتا ہے
عورت جو اس کے لئے کھانا بناتی ہے کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے اور اس کے بچے جنتی ہے۔بچے دور دراز اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔جب جوان ہو جاتے ہیں تو بیکار ادھر ادھر گھوما کرتے ہیں۔ان سب کی میٹنگ پلیس یہی چھوٹی سی سرائے ہے۔جس کے ماتھے پر سرکار کی ملکیت کا بورڈ لگا ہے۔ اسی سرائے کا چوکیدار امیر اللہ ہے۔جس کا میں انتظار کر رہا ہوں۔
امیر اللہ کا باپ وزیر اللہ اسی سرائے کا چوکیدار تھا جو بیاسی سال کی عمر میں ریٹائر ہوا ہے اور اب اپنی کھیتی باڑی کرتا ہے۔امیر اللہ کل نو بھائی بہن ہیں ـــــ جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا
سرکاری طور پر امیر اللہ کا اس سرائے میں چوکیدار کی حیثیت سے کام کرنے کا کوئی حق نہیں یہ قانون کہتا ہے۔لیکن امیر اللہ کہتا ہے۔
" صاحب جی۔میرے باپ نے چھیالیس برس اس سرائے میں نوکری کی ہے۔میری پیدائش بھی اس سرائے کے ایک کمرے میں ہوئی تھی۔میں بچپن سے یہاں اپنے باپ کے ساتھ مل کر مسافروں کی خدمت کر رہا ہوں ـــــ ریٹائر تو میرا باپ ہوا ہے ـــــ میں کہاں جاؤں گا جی، یہ سرائے میری وراثت ہے۔سرکار یہ بات کیوں نہیں سمجھتی۔پھر بھی بار بار نیا چوکیدار بھیجتی ہے۔میں اس کو چارج کیسے دوں گا جی"۔

میرے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ عجیب سی غنودگی محسوس ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی جھپکی آ جاتی ہے، دن ہو یا رات میں اس جھپکی میں عجیب عجیب خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ ایسے مقام دکھائی دیتے ہیں۔ جن کو صرف خواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یا پھر صرف خوابوں میں دکھائی دے سکتے ہیں۔ کئی دیکھتے ہوئے شہروں کا ایک محلہ کسی گاؤں کے حدود اربع میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک گاؤں کی ساری آبادی دوسرے کسی شہر میں بسی ہوئی ملتی ہے ـــــ جن چوپایوں کا جس جنگل میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا وہ وہاں آرام سے رہ رہے ہوتے ہیں۔ جو پرندے جن آسمانوں پر کبھی پرواز نہیں کرتے۔ وہاں اپنے پنکھ پھیلائے فضا میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ـــــ خوابوں میں چیزوں کے رنگ اپنے اصلی رنگوں سے مختلف محسوس ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی لگتا ہے ہزاروں میل کی مسافت طے کر لینے کے باوجود وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ ایسے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ جن کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں ہے۔

ایک خواب میں، میں اس شہر میں پہنچ گیا۔ جہاں سے میرا خاندان ہجرت کر کے آیا تھا۔ میرے پرانے دوست بہت حیران ہوئے کہ میں پاسپورٹ، ویزا کے بغیر کیسے آ گیا۔ معراج، مقبول، شفیع سب اکٹھے ہو گئے۔ وہ اس صورت حال پر غور کرنے لگے اور انھوں نے مجھے پناہ دینے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ مجھے ہمارے گھر لے گئے ـــــ وہاں دروازے پر کئی تالے لگے ہوئے تھے۔

"یہ تالے ـــــ ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم لوگ ہی لگا کر گئے تھے۔ انھوں نے جواب دیا

"اندر کا سامان ـــــ ؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ اب کہاں ہوگا ـــــ سامان سامان کو کھا گیا۔ اگر کچھ ہو بھی تو اس سامان کو بیماری لگی [illegible]

انھوں نے آہستہ سے کہا۔

پھر ہم سب اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے۔ جب وہ تمام جگہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جن سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ مگر وہ جگہیں وہاں موجود نہ تھیں۔ [illegible] جگہیں تھیں جنھیں میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

"وہ جگہیں کہاں گئیں ـــــ ؟" میں نے ان سے دریافت کیا۔

"یہ نئی جگہیں ان پرانی جگہوں کو کھا گئیں۔" انھوں نے [illegible]

میں بہت اداس ہو گیا۔ ان کے ساتھ [illegible]

دیا۔ وہ ان کی نظر بچا کر مجھے اشارے سے بلا رہا تھا ـــــ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ آپس میں میرے بارے میں بات چیت میں مصروف تھے۔ میں آہستہ سے اس آدمی کے پاس گیا ـــــ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ پرانا شناسا ہے۔

"تم ان کے ساتھ کہاں گھوم رہے ہو۔؟" اس شناسا آدمی نے پوچھا۔

"وہ .... وہ سب میرے پرانے دوست ہیں۔ معراج، مقبول، شفیع، میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر... مگر وہ تو سب مرچکے ہیں۔ تم بہت پرانی بات کر رہے ہو۔ جب وہ زندہ تھے۔" اس نے مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ میں قدرے خوفزدہ ہوگیا۔

"کیا وہ سب مرچکے ہیں ؟ ـــــ مگر پھر بھی میرے لئے فکر مند ہیں۔ انھوں نے مجھے پناہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اس کو بتایا

وہ آدمی قہقہہ لگا کر ہنسا ـــــ "پناہ ـــــ! وہ کیا پناہ دیں گے ـــــ؟ وہ تو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔"

میں ایکا ایکی سرحد کی طرف بھاگا۔

میں خواب کی حالت میں سے نکل آیا ہوں۔ میری نظریں سامنے دروازے پر جمی ہیں اور دروازے کے فریم میں سے ساری دنیا نظر آرہی ہے جو بس اتنی سی ہی ہے۔

کئی دن پہلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر اس سرائے میں پڑا تھا ـــــ ہم سب ایک نوٹنکی میں کام کرتے تھے۔ جگہ جگہ گھومتے تھے اور اپنے ناٹک دکھاتے تھے۔ ناٹکوں لوگوں ہی کی زندگی کے حادثوں اور واقعات سے لیا جاتا ہے۔ بس ہر بات کو ایک لے، لہر اور جھناک دے دیا جاتا ہے۔ لفظوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ وہ گیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر اس گیت کو مکالموں کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ گا کر اور دو تین ہلکے پھلکے سازوں کے تال پر۔ لوگ اس سرتال پر خوش ہوتے ہیں ـــــ انعام اکرام سے نوازتے ہیں ـــــ اور ہمارا کھانا پینا اس طرح چلتا رہتا ہے اور ہم ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ سفر کرتے رہتے ہیں۔

کئی برس بیت گئے تھے۔ اسی طرح اور ہم سے پہلے بھی لوگ سینکڑوں برسوں تک ایسے ہی زندگی گذارتے رہے تھے ـــــ مگر یہ اچانک بے موسم کی برسات آگئی اور ہم کو اندر بک کی سرائے میں مجبوراً رکنا پڑا۔

میرے ساتھی کئی دن تک بارش تھمنے کا انتظار کرتے رہے۔ ہماری گاڑیوں کے بیل راستے ہی میں کیچڑ میں پھنس کر مر گئے تھے۔ بیل گاڑیاں اور ان پر لدا ہوا ٹوٹکی کا سامان خود ہی کھینچ کر یہاں لانا پڑا تھا ___ اس جدوجہد میں ہمارا ایک ساتھی جو ڈھولک بجاتا تھا بیمار ہو کر مر گیا۔ اسے بری طرح سردی لگ گئی تھی۔ وہ بڑا عبرتناک منظر تھا۔ جب ہم اس کی لاش بغیر آخری رسومات ادا کئے پانی بھرے کھیتوں میں یونہی چھوڑ کر آگے چل دیئے تھے۔ اس بات کا فیصلہ کسی نے نہ کیا تھا۔ ہم سب خاموش تھے ___ اور آپ ہی آپ خاموشی سے یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ اور ہم سب اداسی سے جھکے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے تھے۔ اور ہمارے پاؤں کیچڑ میں دھنس دھنس جاتے تھے۔

تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نہ جانے کس نے سوال کیا۔

"اب ڈھولک کون بجایا کرے گا۔؟" سب کے چہروں پر تشویش چھا گیا۔

"بیر تگ بجایا کرے گا۔ وہ اتنے دن تک اس کے ساتھ رہا ہے۔ اتنا تو سیکھ ہی گیا ہے۔" نہ جانے کس نے جواب دیا اور سب کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی ___ قدم تھوڑے تیز ہوئے پھر بھی اندھیرا ہوتے ہوتے ہم یہاں پہنچے۔

اور دوسرے دن مجھے بخار آگیا۔ میں نڈھال سا خاموش آتش دان کے قریب لیٹا رہتا۔ وہ سب باری باری آتے اور میرے جسم کو چھو کر دیکھتے۔ میں نے ان کے چہروں کے تاثرات سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے کچھ افاقہ نہیں ہو پا رہا ہے اور میری حالت ہر دم خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔

میں اونگھتا رہتا اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں خواب دیکھتا رہتا۔ خواب میں عام طور پر یہی نظر آتا کہ جس ساتھی کی لاش ہم پانی بھرے کھیتوں میں چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ مجھے ڈھولک بجانے کا فن سکھا رہا ہے۔ ہاتھ کو کس طرح اکڑا اکڑا کر رکھنا چاہئے۔ پہلی انگلی کو کس طرح حرکت دینی چاہئے ___ اور ڈھولک سے نکلنے والی دھمک کو لفظوں میں کس طرح بدلنا چاہئے۔ یہ سب وہ مجھے سکھاتا تھا ___ اور پھر میں بہت ہی آہستہ سے اسے کہتا۔

"مگر تم تو مر چکے ہو ___؟"

"ہاں ___ میں مر چکا ہوں۔ مگر اس بات کا ڈھولک بجانے کی کلا سے کیا لینا دینا۔" وہ بڑی بردباری میں جواب دیتا اور ڈھولک اپنی طرف کھینچ لیتا ___ میں ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیتا۔

آتش دان میں پڑی لکڑیاں سلگنے لگی تھیں۔ کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ اور وہ دھواں میرے

آنکھوں کو لگنے لگا تھا اور میرے پھیپھڑوں میں بھر گیا تھا —— میں زور زور سے کھانسنے لگتا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح کا پانی بہنے لگتا —— میرے ساتھی بڑی تشویش سے مجھے دیکھتے اور پھر باہر چلے جاتے۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ بارش تھمنے کے کوئی آثار ہیں یا نہیں۔

"وہ تو سب صبح سویرے، منہ اندھیرے ہی چلے گئے تھے صاحب جی۔" امیر اللہ نے مجھے بتایا —— میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر آتش دان کی طرف دیکھا اور پھر ان دلیا روں کو جو اب سفید سے بھوری ہو چکی تھیں۔

"انھوں نے میرے لئے کچھ بولا امیر اللہ؟" میں نے بڑی ہی اداسی اور دھیمی آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں صاحب جی۔ وہ سب باورچی خانے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ہیں انھوں نے چائے پی اور بہت دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔"

"کیا باتیں کر رہے تھے وہ لوگ۔؟"

"یہی کہ ایک بیمار آدمی کا بوجھ بہت ہوتا ہے، اپنا سامان۔ نوٹنکی کا سب اسباب کھینچنا ہی مشکل ہو جائے گا —— اسے کہاں اٹھائے پھریں گے، پھر ایک نے کہا تھا۔ یہ نہیں ہوگا تو ناٹک کون لکھے گا۔ گیت کون بنائے گا —— پھر دوسرے نے جواب دیا تھا۔ بہت کچھ نہیں یاد ہے —— جتنا اس کی پوتھی میں لکھا ہے۔ کئی برس تک یہ سب بیتتا ہے۔ اور انھوں نے آپ کے سر کے نیچے سے لال رنگ کی ایک پوتھی نکال لی تھی۔"

میں نے دیکھا میرے تکیے کے نیچے وہ پوتھی نہیں تھی —— جس میں میں ناٹک لکھا کرتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو امیر اللہ —— وہ سب کچھ لے گئے ہیں۔ صرف مجھے چھوڑ گئے ہیں۔ ایک بیمار آدمی کو۔ پھر میں خاموش ہو گیا، اور مجھے جھپکی آگئی —— خواب میں ہمارا ڈھولک بجانے والا ساتھی۔ بڑی پھرتی اور فن کاری سے ڈھولک کے دونوں طبلوں پر اپنی انگلیاں نچاتا نظر آیا —— مگر ڈھولک کی آواز نہیں آ رہی تھی —— [illegible]۔

کئی دن کے بعد میرا بخار اترا ہے۔ مگر بارش بند نہیں ہو رہی ہے۔ راستے سب بند ہیں۔ ادھر ادھر پھیلے ہوئے لکڑی کے گھر بے روح اور اندھیرے ہیں۔ ان کے پاس جلانے کا تیل تک ختم ہو چکا ہے مگر پھر بھی کہیں کوئی حرکت دکھائی نہ دیتی —— وہ اپنے گھروں سے باہر نکلتے دکھائی نہیں دیتے۔ شاید

اس لئے کہ وہ اندھیرے کے عادی ہو چکے تھے۔

دھیرے دھیرے میرے اردگرد کی ہر چیز بے حرکت ہو چکی ہے، لکڑی کے گھر، اونچے اونچے پیڑ، ہوا اور فضا، مجھے لگ رہا ہے ـــــ یہ سردی اور جماؤ آہستہ آہستہ میرے پیروں کی طرف سے میرے جسم میں سرایت کرنے لگے گا اور میرا جسم بے حرکت ہونا شروع ہو جائے گا اور آخر میں میں برف کی ایک سل بن کر رہ جاؤں گا۔

میرا من کئی دن تک اچاٹ ـــــ پھر خواب میں کہی ہوئی اس پرانے شناسا آدمی کی بات یاد آئی "یہ سب مر چکے ہیں" ـــــ اور پھر ڈھولک بجانے والے کی لاش جو پانی بھرے کھیتوں میں پڑی تھی کہہ رہی تھی۔ "ہاتھ کو یوں اکڑا کر رکھنا چاہئے۔ پہلی انگلی کو اس طرح حرکت دینی چاہئے اور ڈھولک سے نکلنے والی آواز کو اس طرح لفظوں میں بدلنا چاہئے۔"

"چار پلا دو، تھوڑی سی امیر اللہ۔"

"میں پلاؤں گا صاحب جی۔" اور وہ سیدھا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ میں کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا کمر پر ہاتھ باندھ کر، ایک کونے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا نظر آیا ـــــ میں نے اسے اٹھا لیا ـــــ وہ کسی پرانے اخبار کا ٹکڑا تھا۔ یہاں تو کبھی اخبار آیا ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک عرصہ سے لفظ کے دیدار نہیں کئے۔ میں نے کاغذ پر چھپے ہوئے لفظوں کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ وہ لفظ ایک عرصہ پہلے ہوئے واقعات کی خبر دے رہے تھے۔ میں بہت خوش ہوا۔ کم سے کم زندگی سے میرا ناطہ تو نہیں ٹوٹا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے پھر میں نے دیکھا۔ کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ لفظ، سیاہ پیوپلیوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے پھن اٹھائے ہیں [illegible] کاغذ پر سے کود کر سیدھے دروازے سے باہر نکل گئے ہیں اور پھر بارش میں بھیگتے [illegible] ہیں۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پنا بالکل کورا رہ گیا تھا۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں صاحب جی۔ لو چا پیو ـــــ بارش رک جاتے پھر ہماں آپ کہو گے ـــــ آپ کو میں ٹینٹ آدمی کہ جی۔" امیر اللہ نے میری طرف چائے کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا میں نے چائے لے لی۔

میں امیر اللہ کے بارے میں بہت فکرمند ہو رہا تھا۔ قاعدے کے مطابق اسے ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجانا چاہئے تھا۔ مگر ۔ ۔ ۔ مگر آدمی اگر رکنا چاہے تو کتنی دیر تک اپنے ٹھکانے سے دور رہ سکتا ہے اور اگر کوئی افتاد ہی آپڑی ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔

میرے پاس آخری سگریٹ تھا جسے میں نے سلگانا چاہا مگر رک گیا۔ وہ آجائے تو معلوم ہو کہ کتنے سگریٹ لایا ہے۔ اور کتنے وقت تک ان سے گذر ہو سکتی ہے۔ سگریٹ کو میں نے انگلیوں میں لے کر پھیر ایا —— پھر ناک کے قریب لے جا کر اس کے تمبا کو کی بو سونگھی، طلب ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک میرے اندر زندہ رہنے کی آرزو ختم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے وہ لوگ بڑے اہم لگنے لگے جو مر چکے ہیں —— اور جو اب خوابوں میں کھلے عام آجاتے ہیں۔

میں نے اپنے آپ سے بغاوت کرنے کی ٹھانی اور آتش دان میں لکڑی کا ایک سلگتا ہوا ٹکڑا اٹھایا اور سگریٹ سلگایا —— اور سوچنے لگا، اس سگریٹ کے خلاف اخباروں میں اور خود اس کی ڈبیہ پر کتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کہ یہ آدمی کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر میں جو اس کے لئے ترستا رہا ہوں وہ کیا موت سے کم تھا —— دھوئیں کے مرغولے اپنے مونہہ سے چھوڑتا ہوا میں وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا —— باہر دھندلکا تھا —— سورج اور چاند رخصت پر تھے۔ وقت ایک ہی جگہ تھم کر رہ گیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا کا سفر رات کی جانب ہے۔ مگر امیر اللہ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ دروازے کے فریم میں سے نظر آنے والے کھیت میں اس کا تصور صلیب پر چڑھے آدمی کی طرح محسوس ہوتا تھا —— جس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں مکئی کے بھٹے پکڑے ہوں اور ہر لمحہ زمین میں دھنستا جا رہا ہو۔

یہ خواب ہے یا بیداری کا عالم؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اپنے وجود پر میری گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ میں اپنے سوالوں کا جواب دینے کے اہل نہیں رہا ہوں۔ ساتھ والے کمرے سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز برابر آرہی ہے —— شاید امیر اللہ آگیا ہے —— لیکن نہیں یہ اس کی آواز نہ تھی۔ اس آواز میں تو بلا کا کرب ہے۔ کوئی بڑے سر میں گنگنا رہا ہے۔ "ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے . . . ؟"

میں نے آنکھیں کھول دیں تو یقین آگیا کہ یہ خواب نہیں تھا۔ وہ آواز بار بار یہی مصرعہ گنگنا رہی تھی۔ اور ہر لحظہ اس میں درد بڑھتا جاتا تھا —— بڑی کوشش کر کے میں اٹھا —— تھوڑی دیر کمرے کے وسط میں کھڑا بجھتے ہوئے آتش دان کو دیکھتا رہا۔ پھر میرے قدم چلنے لگے میں دروازے سے باہر نکلا۔ سب طرف گہرا اندھیرا تھا۔ میں برآمدے کا چکر لگا کر دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو —— دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا —— اور آتش دان میں آخری لکڑی جل رہی تھی۔

آگ کی روشنی میں مجھے فرش پر کوئی لیٹا ہوا دکھائی دیا —— بہت سے کپڑوں میں لپٹا ہوا —— بالکل بے حرکت اور یہ آواز یقیناً اسی کی تھی "ہم کہاں کے دانا تھے . . ."

میں کمرے میں داخل ہوا اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باقاعدہ گنگنائے جا رہا تھا۔ میری موجودگی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس کے معمول میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ آنکھیں جب کمرے کے ماحول سے مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ اس کے قریب ہی فرش پر ایک چھوٹی سی سارنگی پڑی ہے۔ اور سارنگی کے تاروں پر چلنے والا گز۔

"تم کون ہو بھائی" میں نے اچانک سوال کیا۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اس کے منہ سے پھس پھساہٹ سی سنائی دی —— "کس ہنر میں یکتا تھے"

میں اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا —— جیسی بھی روشنی تھی، اس میں اسے غور سے دیکھنے لگا —— وہ مجھے ایک ایسا سپاہی لگا جو میدان جنگ سے زخم کھا کر بھاگ آیا ہو اور نڈھال ہو کر یہاں آگرا ہو۔

"تم کون ہو بھائی —— ؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے بہ مشکل تمام میری طرف ذرا سا پلٹ کر دیکھا۔ اور پھسپھسانا بند کر دیا۔ اس کی نظروں میں میرے لئے سوال محسوس ہوا —— جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو۔

"تم کون ہو —— ؟"

مگر اچانک اس کے ہونٹ ہلے۔ اور اس نے کہا۔ "نہیں . . . . نہیں معلوم . . . . میں خود یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"۔

میں حیران سا ہوا —— ایسا بھی کیا کہ ایک آدمی اتنا بھی نہ جانتا ہو کہ وہ کون ہے"۔

"عجیب بات ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کون ہو۔ ؟"

"سچ پوچھو تو اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر میں جان بھی گیا کہ میں کون ہوں تو اس سے آخر فرق ہی کیا پڑ جائے گا۔"

میں خاموش رہ گیا اور پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا —— مجھے تو معلوم ہی ہے نا کہ میں کون ہوں —— پھر میں نے ہی اپنی بے بسی پر قابو پانے کے لئے کیا کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ آخری سگریٹ تک پی چکا ہوں اور مزید سگریٹ ملنے کی امید نظر نہیں آ رہی۔

اس خاموش لمحہ میں اس کی کراہ سنائی دی —— لگا وہ زخموں سے چور ہے۔ میدانِ جنگ ——

سے بھاگا ہوا سپاہی۔

"کیا میں تمھارے لئے کچھ کر سکتا ہوں۔؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جیسے سوچنا شروع کیا ——— پھر اچانک بولا ———"کیا مجھے بتاؤ گے، کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔؟"

میں نے اسے اندر یگ کی اس سرائے کا جغرافیہ، اپنے وہاں موجود ہونے کی وجہ، امیر اللہ کا میرے لئے کچھ کھانے کا سامان لینے دور جانا اور ابھی تک واپس نہ آنا ——— اپنی تشویش اور سرائے میں لکڑی کا ذخیرہ ختم ہو جانے کے بارے میں سب بتا دیا ——— وہ سب غور سے سنتا رہا ——— پھر اس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور بولا۔

"مجھے تمھاری تکلیف پر افسوس ہے۔ مگر یہ ساری مصیبت اس لئے ہے کہ تمھیں اپنے بارے میں سب یاد ہے۔ میں بہت سکھی ہوں ——— سب بھول چکا ہوں اپنے ماضی سے اب میرا کوئی رشتہ نہیں رہا ——— میں ایک نیا آدمی ہوں۔ میرے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ———"

"مگر لگتا ہے تم سخت زخمی ہو ———"

"وہ زخم میرے جسم پر ہیں۔ اور میں اپنے جسم کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں بھنا گیا ——— مجھے لگا اس نے مجھے گالی دی ہے۔ میرے زندگی کے بارے میں رویے کے منھ پر تھوک دیا ہے۔ میں بڑبڑا کر بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ماضی کے بغیر ہم کس کام کے۔ آئینہ میں روز اپنا چہرہ دیکھتے رہنے سے اپنے عیبوں کا پتہ چلتا ہے مزید خوبصورت نظر آنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"

"میری سب خواہشیں مر چکی ہیں۔ میں خوش ہوں۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"تم آخر کرتے کیا ہو۔؟"

"اب تو کچھ نہیں کرتا ——— کبھی کرتا تھا ———"

"کیا۔؟"

"گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو پرانی داستانیں سناتا تھا۔ ان کو اکساتا تھا کہ وہ پرانی داستانوں میں اپنی نئی زندگی کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کریں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات تھی۔"

"آہ ——— بہت درد ہو رہا ہے۔ میرا سارا جسم دکھ رہا ہے۔ کہاں کیسا زخم ہے معلوم نہیں پڑتا۔"

"تمھیں یہ زخم کیسے لگے ۔ ؟"

"انھوں نے مجھے بہت مارا۔"

"کیوں ۔ ؟ تم نے ایسا کیا کیا ____ ؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ____ جہاں تک مجھے یاد ہے ، میں نے ایسا کچھ کبھی نہ کیا تھا ۔ میں تو اپنے قاعدے کے مطابق اس گاؤں میں پہنچا تھا ____ گاؤں کے چوراہے پر چوپال تھی ____ میں وہیں رک گیا ____ اپنی سارنگی کے تار سر میں لانے لگا ____ بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر میرے گرد اکٹھا ہونے لگے ____ اس گاؤں کے مردوں ، عورتوں اور بچوں ، سب نے ایک ہی طرح کا عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا ____ جیسا کہ پرانے زمانے کے راہب پہنا کرتے تھے ____ ان کے گھر بھی ایسے بنے تھے جیسے کوئی عبادت کدہ ہو ۔ میں نے ان سب باتوں کی طرف بالکل کبھی دھیان نہ دیا ۔ جب سارنگی سر ہو گئی تو میں نے داستان گانا شروع کیا ____ وہ سب خاموشی سے کھڑے وہ داستان سنتے رہے ۔ جب داستان ختم ہوئی تو میں اپنی جھولی پھیلا کر ان کی طرف بخشیش پانے کے لئے بڑھا ____ میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب کسی نے ایک سکہ بھی میری جھولی میں نہ ڈالا ۔ بلکہ عجیب نظروں سے میرے چہرے کو گھورتے رہے ____ میں حسب دستور ایک سے دوسرے کی طرف جھولی پھیلائے بڑھتا رہا ____ آخر میں اس آدمی کے سامنے پہنچا جو عمر میں ان سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا اس کی ڈاڑھی کے لمبے لمبے بال بالکل سفید تھے ____ وہ تھوڑی دیر مجھے گھورتا رہا ۔ اس کے چہرے پر ہر لحظ نفرت کے تاثرات شدید ہوتے جا رہے تھے ۔ پھر اس نے اپنے بڑے بڑے مضبوط ہاتھ میرے دونوں کندھوں پر رکھ دیئے ____ اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی ۔ میں گھبرا سا گیا ۔ اس نے ڈانٹ رکھا ____ "تمھیں . . . . تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی ____ ؟" میں حیران ہو گیا اور فوراً بولا ۔

"کس بات کی جرأت جناب ۔ ؟"

"ہمارے عقیدے اور ہمارے مذہب اور ہمارے خداؤں کا مذاق اڑانے کی"۔

"نہیں نہیں میں نے ایسا کچھ کبھی نہیں کیا ۔ میں آپ کے عقیدے کے بارے میں آپ کے مذہب کے بارے میں اور آپ کے خداؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا "

"تم . . . . تم تو اور بھی زیادہ خطرناک ہو ____ لاعلمی سے بڑا گناہ دنیا میں اور کوئی نہیں ہے"۔

میں ششدر سا کھڑا ان سب کے چہروں پر دیکھتا رہا ____ اچانک سارے چہرے اس بڈھے آدمی کے چہرے جیسے ہو گئے ۔

بوڑھا بلند آواز میں بولا۔ "میرے ہم مذہبو۔ یہ ایک ایسا شخص ہے۔ جو ہمارے عقیدے، ہمارے مذہب اور ہمارے خداؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ــــ پھر بھی ہمیں وہ داستان سناتا ہے۔ جس میں ہمارے خداؤں کی بے حرمتی کا رمز چھپا ہوا ہے ــــ داستان دنیا کی ہے، رمز اس کا ہے اور اس کا رمز ہی اس کا گناہ ہے۔ اس کے بارے میں آپ سب کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ سزا کا مستحق نہیں ہے؟"

"ہے ــــ ہے ــــ یہ سزا کا مستحق ہے۔ سب چلائے۔

"تو پھر اسے کیا سزا دی جائے اس کا فیصلہ کون کرے گا"

"ہمارے خدا کریں گے ــــ آج تک ہمارے سب فیصلے ہمارے خداؤں نے ہی کئے ہیں"

تین چار آدمی بلند آواز میں بولے ــــ

بوڑھے نے مجھے ایک زوردار دھکا دیا۔ میں زمین پر گر گیا پھر ان سب نے مل کر اپنے مذہب عقیدے اور خداؤں کی عظمت کا نعرہ لگایا۔ اور مجھے گھسیٹ کر لے چلے ــــ

ان سب کے گھر، جو عبادت کدہ تھے ــــ بالکل ایک جیسے تھے۔ ان کے حجرے بھی ایک جیسے تھے۔ مگر ان کے حجروں میں رکھے ہوئے خدا ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ان کی شکلیں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی تھیں، وہ مجھے سب گھروں میں لے کر گئے ــــ اپنے سب خداؤں کے سامنے جاکر مجھے کھڑا کیا اور میرے لئے سزا کا حکم مانگا۔

مگر کسی خدا کے ہونٹوں میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ کسی نے اپنے بے ڈول ہاتھ پاؤں سے ہلکا سا بھی اشارہ نہ کیا۔

وہ ہر گھر میں گھستے اور باہر نکلتے ہوئے آپس میں گفتگو کرتے ــــ وہ اتنی تیزی سے بولتے کہ ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آتی۔ میں ایک بے بس بھیڑ کی طرح ان کے نرغے میں تھا ــــ وہ مجھے کشاں کشاں لئے جاتے تھے۔ ان کی گرفت میری گردن، میرے کندھوں اور میرے بازوؤں پر سخت سے سخت ہوتی جاتی تھی۔

وہ مجھے ہر خدا کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑا کر چکے تھے۔ اور میں جب بمشکل تمام اپنا سر اٹھا کر اپنی ڈری ڈری نظروں سے اس خدا کے چہرے پر دیکھتا تو وہاں مجھے سوائے نفرت کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

یہ کام بھی ختم ہوا ــــ تو وہ مجھے دوبارہ چوپال پر لے آئے۔ بوڑھے نے مجمع پر ایک کریدنے

دوبارہ نظر ڈالی ـــــ پھر کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ اور بولا۔

"میرے ہم مذہبو ـــــ خداؤں کی خاموشی کا مطلب سمجھتے ہو ـــــ ؟" سارا مجمع خاموش رہا۔

"خداؤں کی خاموشی کا مطلب ہے"۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "اس شخص کا جرم اتنا سنگین ہے۔ خداؤں کے ہونٹ بھی اسے سزا دینے کے لئے نہیں ہل رہے ـــــ وہ سب انتہائی غصے میں ہیں۔ پھر تم ہی کہو کہ اسے کیا سزا دی جائے ـــــ اس کا جرم ہے۔ پرانی داستان میں اپنی رمز شامل کرنا اور اس کی رمز کا مطلب ہے کہ ہمارے خدا مہر و برکت نہیں۔ دنیا پر قہر نازل کرتے ہیں ـــــ اور قہر نازل کرنے والا خدا نہیں شیطان ہوتا ہے ـــــ اس کی داستان میں بیان کیا گیا جنگل ـــــ خداؤں کے قہر سے جل جاتا ہے ـــــ اور اس کے چرند پرند اور چوپائے اس آگ میں جل جاتے ہیں ـــــ تم سب جانتے ہو ـــــ کہ جنگل کی آگ کو اس نے شیطان کی کارستانی نہیں کہا ـــــ ہمارے خداؤں کا قہر کہا ہے۔ یا اگر خداؤں کا نام نہیں بھی لیا اور مہر و قہر تو خداؤں ہی کے ہاتھ ہے۔ اس سے ان کی بے حرمتی ہوئی کہ نہیں ـــــ ؟"

"ہوئی ـــــ ہوئی" ـــــ سب نے گلا پھاڑ کر جواب دیا ـــــ

"تو پھر میں اس کی سزا تجویز کرتا ہوں"۔ بوڑھا کہہ کر متوقع نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا ـــــ وہ سب متوقع نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر گویا ہوا ـــــ

"اسے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا جائے اور ہر باعقیدہ شخص اسے سات سات ٹھوکریں مارے"۔

ٹھوکریں کھا کھا کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور جب ساری گلیوں میں سے گھسیٹا جانے کے بعد انھوں نے مجھے گاؤں کے باہر ایک کھیت کے کنارے پھینک دیا تو میں بے تحاشہ بھاگا ـــــ بارش بہت زوروں سے ہونے لگی تھی۔ میرے آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی موت ـــــ ایک لمحے کے لئے میں نے اس جسم کو بھلا دیا۔ جس پر سینکڑوں آدمیوں عورتوں اور بچوں نے اپنی ٹھوکروں سے حملہ کیا تھا۔

بارش کیچڑ اور راستے میں بکھرے ہوئے پتھروں نے مزید ظلم ڈھایا اور میرے پاؤں سے جگہ جگہ خون بہنے لگا ـــ میں نہیں جانتا کیسے کب اور کس طرح میں یہاں پہنچ پایا ـــــ ہوش آیا تو یہاں کھڑا تھا۔

بوڑھا بلند آواز میں بولا۔ میرے ہم مذہبو۔ یہ ایک ایسا شخص ہے۔ جو ہمارے عقیدے، ہمارے مذہب اور ہمارے خداؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ـــــ پھر بھی ہمیں وہ داستان سناتا ہے۔ جس میں ہمارے خداؤں کی بے حرمتی کا رمز چھپا ہوا ہے ـــــ داستان دنیا کی ہے، رمز اس کا ہے اور اس کا رمز ہی اس کا گناہ ہے۔ اس کے بارے میں آپ سب کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ سزا کا مستحق نہیں ہے؟"

"ہے ـــ ہے ـــ یہ سزا کا مستحق ہے۔ سب چلائے۔

"تو پھر اسے کیا سزا دی جائے اس کا فیصلہ کون کرے گا؟"

" ہمارے خدا کریں گے ـــ آج تک ہمارے سب فیصلے ہمارے خداؤں نے ہی کئے ہیں"۔

تین چار آدمی بلند آواز میں بولے ـــ

بوڑھے نے مجھے ایک زوردار دھکا دیا۔ میں زمین پر گر گیا پھر ان سب نے مل کر اپنے مذہب عقیدے اور خداؤں کی عظمت کا نعرہ لگایا۔ اور مجھے گھسیٹ کر لے چلے ـــ

ان سب کے گھر، جو عبادت کدہ تھے ـــ بالکل ایک جیسے تھے۔ ان کے حجرے بھی ایک جیسے تھے۔ مگر ان کے حجروں میں رکھے ہوئے خدا ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ان کی شکلیں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی تھیں، وہ مجھے سب گھروں میں لے کر گئے ـــ اپنے سب خداؤں کے سامنے جا کر مجھے کھڑا کیا اور میرے لئے سزا کا حکم مانگا۔

مگر کسی خدا کے ہونٹوں میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ کسی نے اپنے بے ڈول ہاتھ پاؤں سے ہلکا سا بھی اشارہ نہ کیا۔

وہ ہر گھر میں گھستے اور باہر نکلتے ہوئے آپس میں گفتگو کرتے ـــ وہ اتنی تیزی سے بولتے کہ ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آتی۔ میں ایک بے بس بھیڑ کی طرح ان کے نرغے میں تھا ـــ وہ مجھے کشاں کشاں لئے جاتے تھے۔ ان کی گرفت میری گردن، میرے کندھوں اور میرے بازوؤں پر سخت سے سخت ہوتی جاتی تھی۔

وہ مجھے ہر خدا کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑا کر چکے تھے۔ اور میں جب بمشکل تمام اپنا سر اٹھا کر اپنی ڈری ڈری نظروں سے اس خدا کے چہرے پر دیکھتا تو وہاں مجھے سوائے نفرت کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

یہ کام بھی ختم ہوا ـــ تو وہ مجھے دوبارہ چوپال پر لے آئے۔ بوڑھے نے مجمع پر ایک کریدنے

وہی نظر ڈالی ـــــ پھر کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا ۔ اور بولا ۔
" میرے ہم مذہبو ـــــ خداؤں کی خاموشی کا مطلب سمجھتے ہو ـــــ ؟" سارا مجمع خاموش رہا۔

" خداؤں کی خاموشی کا مطلب ہے"۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا" اس شخص کا جرم اتنا سنگین ہے ۔ خداؤں کے ہونٹ بھی اسے سزا دینے کے لئے نہیں ہل رہے ـــــ وہ سب انتہائی غصے میں ہیں ۔ پھر تم ہی سوچو کہ اسے کیا سزا دی جائے ـــــ اس کا جرم ہے ۔ پرانی داستان میں اپنی رمز شامل کرنا اور اس کی رمز کا مطلب ہے کہ ہمارے خدا مہر و برکت نہیں ۔ دنیا پر قہر نازل کرتے ہیں ـــــ اور قہر نازل کرنے والا خدا نہیں شیطان ہوتا ہے ـــــ اس کی داستان میں بیان کیا گیا جنگل ـــــ خداؤں کے قہر سے جل رہا ہے ـــــ اور اس کے چرند پرند اور چوپائے اس آگ میں جل رہے ہیں ـــــ تم سب جانتے ہو ـــــ کہ جنگل کی آگ کو اس نے شیطان کی کارستانی نہیں کہا ـــــ ہمارے خداؤں کا قہر کہا ہے ۔ یا اگر خداؤں کا نام نہیں بھی لیا اور مہر و قہر تو خداؤں ہی کے ہاتھ ہے ۔ اس سے ان کی بے حرمتی ہوئی کہ نہیں ـــــ ؟"

" ہوئی ـــــ ہوئی" ـــــ سب نے گلا پھاڑ کر جواب دیا ـــــ

" تو پھر میں اس کی سزا تجویز کرتا ہوں"۔ بوڑھا کہہ کر متوقع نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا ـــــ وہ سب متوقع نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ وہ پھر گویا ہوا ـــــ

" اسے خداؤں کی گلیوں میں گھسیٹا جائے اور ہر باعقیدہ شخص اسے سات سات ٹھوکریں مارے۔"

ٹھوکریں کھا کھا کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور جب ساری گلیوں میں سے گھسیٹا جانے کے بعد انھوں نے مجھے گاؤں کے باہر ایک کھیت کے کنارے پھینک دیا تو میں بے تحاشہ بھاگا ـــــ رات بہت وزنی سے ہونے لگی تھی ۔ میرے آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی موت ـــــ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے جسم کو بھلا دیا ۔ جس پر سینکڑوں آدمیوں عورتوں اور بچوں نے اپنی ٹھوکروں سے حملہ کیا تھا ۔

بارش کیچڑ اور راستے میں بکھرے ہوئے پتھروں نے مزید ظلم ڈھایا اور میرے پاؤں سے جگہ جگہ خون بہنے لگا ـــ میں نہیں جانتا ۔ کیسے کب اور کس طرح میں یہاں پہنچ پایا ـــــ ہوش آیا تو یہاں کھڑے تھے۔

اجنبی نے اپنا قصہ بیان کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں بڑی ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا آتش دان میں آگ تم نے جلائی تھی۔؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"شاید ــــ لیکن اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔" اس نے پھس پھسا کر جواب دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ زخموں اور کچوکوں سے اٹا پڑا تھا۔

میں بھی کتنا بے بس تھا۔ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو خود میرا ہنڈ کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر وہ آجائے تو اس اجنبی کے لئے گرم گرم چائے بن سکتی تھی۔ اس کے زخموں پر ملہم کا لیپ لگایا جا سکتا تھا۔ بہت سے زخم تو بالکل نظر آ رہے تھے۔ اور ایسے کئی زخم ایسے تھے جو اس کے بوسیدہ لباس کے نیچے چھپے ہوئے تھے ــــ یہی کیا کم تھا ــــ کہ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ کیا وہ صرف اپنی جسمانی طاقت کی وجہ سے زندہ ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ــــ نہیں کوئی اور طاقت ہے۔ اس کی داستان میں اور اس کی رمز میں جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ قدرت کا بھی کیسا قاعدہ ہے۔ آدمی جسمانی طور پر مرنے کے باوجود اس وقت تک نہیں مرتا ــــ جب تک اس کا ذہن زندہ رہتا ہے۔

"کیا تمہارا ذہن زندہ ہے؟" میں نے اچانک اس سے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا ــــ" اس کا جواب تھا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں۔ تم نے ان کو کون سی داستان سنائی تھی اور اس میں تمہاری رمز کیا تھی؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں نہیں جانتا ــــ میں سب بھول چکا ہوں۔ اتنی ٹھوکریں کھا کر بھلا کیا یاد رہ جاتا" اس نے اسی طرح پھسپھسا کر کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی سارنگی اٹھائی اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا۔ پھر لرزا اٹھایا بے اختیار سارنگی کے تاروں پر پھیرا ــــ بڑی ہی بھیانک سی آواز سارنگی کے پیٹ میں سے نکلی جیسے کوئی قبرستان میں بیٹھا غم میں ڈوب کر رو رہا ہو۔

وہ چونکا ــــ یکا یک اٹھ کر بیٹھ گیا اور سارنگی میرے ہاتھوں سے جھپٹ لی۔ "رہنے دو ــــ رہنے دو اسے۔ مجھ پر کرم کرو ــــ اُف۔ کتنی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اپنی سارنگی سے

ایسی آواز سننا پڑی ہے۔ وہ گویا رو دیا۔ پھر گویا ہوا۔

"بڑی کوشش کی یقین جانو بڑی کوشش کی۔ اسے میں نے اپنے پیٹ کے ساتھ لگا کر چھپالیا تھا ــــ مگر وہ ٹھوکریں اندھی تھیں۔ انھوں نے میرے ساتھ ساتھ اسے بھی ۔ ۔ ۔"

وہ سچ مچ رونے لگا ــــ

" اس کا بھی کیا جینا، جس کا ساز ہی بے سرا ہو جائے ــــ میں تو رو بھی سکتا ہوں۔ کہہ بھی سکتا ہوں ــــ اپنے زخم بھی دکھا سکتا ہوں۔ ان پر لیپ لگا سکتا ہوں ــــ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایکا ایکی زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک معدوم پڑنے لگی اور یوں لگا جیسے اس نے اپنی پتلیاں میرے چہرے پر جما دی ہوں پھر آہستہ آہستہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔

" ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب، دشمن آسماں اپنا "

" تمھیں واردات کی یادداشت ہے۔ اپنی بھی اور اس کی بھی، جو لال قلعہ سے نکل کر چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماران میں داخل ہو رہا تھا ــــ اور یہ بات اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ مگر تمھیں وہ داستان یاد نہیں جس کی وجہ سے تم پر اتنا بڑا حادثہ گذر گیا۔" میں نے کہا۔

" میرا ذہن کہیں اٹک گیا ہے ــــ ذرا بھی حرکت نہیں کر رہا ــــ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ تم جاؤ ــــ تم چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ چیخا۔

میں نے وہاں کھڑے کھڑے ایک بار اسے دیکھا اور پھر آتش دان میں جھجکتی ہوئی آگ کو اور فضا میں گھلی ہوئی سردی کو اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو اور اسی ایک پل میں نے وہاں سے اپنے کمرے میں چلے آنے کا فیصلہ کر لیا۔

کمرے میں اندھیرا بہت تھا ــــ میں اپنے بستر میں دبکا ہوا اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑا پڑا دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے ایسا تک محسوس ہوا کہ روشنی کی طرح اندھیرا بھی اپنی ایک دنیا آباد کر لیتا ہے ــــ اس میں بھی ہیولے پیدا ہوتے ہیں۔ جو فضا میں لہراتے پھرتے ہیں۔ میں ان ہیولوں کا رقص دیکھ رہا تھا ــــ اور پل پل وقت گذر رہا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں سے

ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ جو یقیناً اس اجنبی کی تھی۔ میں چونکا ___ چیخ دوبارہ سنائی دی ___ مجھے لگا جیسے ساتھ والے کمرے میں زخموں سے چور، پڑا اجنبی پکار رہا ہے۔

"کوئی ہے ___ ؟ کوئی ہے ___ ؟"

میں ہڑبڑا کر اٹھا ___ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھا ___ وہ کمرے میں آتشدان کے پاس بیٹھا تھا ___ سب طرف اندھیرا تھا ___ اس اندھیرے اور آتش دان میں سلگتی لکڑیوں کی روشنی میں وہ کسی تپسوی کی طرح بیٹھا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے ___ کیا ہوا تمھیں ___ ؟" میں نے گھبراہٹ کی حالت میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں ___ بس تم میرے پاس یہاں آکر بیٹھو ___" اس نے ایسی آواز میں کہا جیسے سمندر میں غوطہ لگانے والے کسی شخص کو موتیوں کا ذخیرہ مل گیا ہو۔

میں اسے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے دیکھتا رہا ___ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے میرے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر اپنی گود میں رکھی سارنگی کے تاروں پر گز پھرایا۔ کسی بچے کی کلکاری جیسی آواز سنائی دی۔

"یہ ٹھیک ہو گئی ہے ___ اس کے بولوں میں مٹھاس آگئی ہے۔ دیکھا تم نے ___ تم نے اس کی آواز سنی ___" اس نے کہا اور پھر گز پھرایا ___ آواز پھر ابھری اب کی بار چار سُر ایک ساتھ نکلے تھے ___ ان سروں کی تہ میں موسیقی مصری کی طرح گھلی جا رہی تھی ___ میں آگے بڑھا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک سارنگی بجاتا رہا۔ پھر اچانک اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔

"بوڑھے نے ٹھیک کہا تھا ___ داستان دنیا کی تھی، مگر اس میں رمز میری تھی میری رمز نے داستان کے معنی بدل دیئے تھے۔ بیانیہ کا رنگ آب دار کر دیا تھا ___ تلوار کی دھار بہت تیز تھی ___" وہ آپ ہی آپ کہتا رہا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا ___

"اب تیرا جی تو اچھا ہے نا۔؟"

"بالکل .... میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ میرے جسم پہ لگے زخم اپنا درد بھول گئے ہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیا اب تم وہ داستان سنا سکتے ہو۔؟ تم نے راہبوں کے اس گاؤں میں۔ سنائی تھی

میں نے پوچھا۔

"نہیں ـــ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھارا عقیدہ، تمھارا مذہب اور تمھارا خدا کون ہے۔؟"

"کوئی نہیں ـــ میرا کوئی مذہب نہیں ـــ اکیلے، بے بس اور بیمار آدمی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ـــ" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا ـــ کمرے میں اندھیرے اور خاموشی کو سردی نے منجمد کر دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب بے حرکت مجسموں کی طرح بیٹھے رہے۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔" اس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا ـــ "میں تمھیں وہ داستان سنا دوں گا ـــ وہ بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی ہے۔"

"تو کیا وہ داستان تم نے خود تخلیق نہیں کی۔؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں ـــ" اس نے جواب دیا۔

"کس سے سنی تھی تم نے وہ داستان ؟"

"میں نہیں جانتا ـــ داستانیں یاد رہتی ہیں۔ ان کے خالق مر جاتے ہیں۔ لفظ کبھی نہیں مرتا ـــ لفظ ذہن ہے۔" اس نے مجھے سمجھایا۔ میں خاموش رہا ـــ وہ سارنگی پر گز پھراتا رہا۔ پھر اچانک اس نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے ـــ ہماری دنیا کے کسی کونے میں ایک گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل میں، چرند پرند اور کئی طرح کے جاندار بستے تھے ـــ سورج اس کے اونچے درختوں کی چھتریوں میں سے جھانکتا ہوا اس جنگل پر سے گذر جاتا تھا۔ سورج کی حرارت سے جنگل کے پیڑ پودے۔ پھل پھول اور گھاس زندگی پاتے تھے، بڑھتے پھولتے تھے ـــ ہری ہری لمبی گھاس پیدا ہوتی تھی ـــ اور پھر سورج ہی کی حرارت سے وہ گھاس سوکھ کر ایندھن بنتی تھی۔

ایک بار سورج کو خواہش ہوئی کہ وہ جنگل میں پھیلائے ہوئے اپنے رنگ روپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس نے گردن جھکائی اور دوسرے ہی لمحے ایندھن بنی گھاس سلگ اٹھی اور ہوا کے ایک جھونکے نے اسے آگ میں بدل دیا ـــ یہ آگ جنگل کی آگ کی طرح سارے جنگل میں دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئی۔

اس آگ کی وجہ سے سب جل بھن کر ختم ہونے لگا۔ پیڑ پودے، پھل پھول اور رنگ روپ اور اس کے ساتھ ہی جنگل کے چرند پرند اور جاندار بھی جلنے بھننے لگے ـــ اور آناً فاناً میں سب

ختم ہوگیا۔

ایک چھوٹی سی رنگدار پروں والی جوان چڑیا اور ایک بوڑھا باز بچ گئے کہ وہ دونوں پرواز میں تھے ـــــ انھوں نے آسمان کی بلندیوں سے جنگل کو جلتے دیکھا تھا۔ دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھے تھے ـــــ اور جنگل کو اس دھوئیں میں منہ چھپا کر روتے سنا تھا ـــــ وہ اس وقت تک آسمان میں اڑتے رہے جب تک کہ دھواں ختم نہ ہوگیا۔ اور آگ سارے جنگل کو کھا نہ گئی ـــــ یہ خوفناک منظر باز، چڑیا اور سورج تینوں نے دیکھے تھے۔ باقی کوئی چشم دید گواہ نہ بچا تھا ـــــ

سورج تو افسوس سے ہاتھ ملتا ہوا مغرب کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر باز اور چڑیا اپنی اپنی جگہ اس ساری واردات پر آنسو بہانے لگے۔

جب وہ نیچے اترے تو منظر بدل چکا تھا ـــــ ہر طرف کوئلہ ہی کوئلہ پھیلا ہوا تھا۔ ہر چیز کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔

باز اور چڑیا اپنی اپنی جگہ ادھر ادھر گھومتے ہوئے اپنے لئے خوراک تلاش کرنے لگے ـــــ مگر وہاں کھانے کو کیا تھا ـــــ کہ اچانک دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا ـــــ باز کی آنکھوں میں چڑیا کو دیکھ کر چمک آگئی ـــــ اس کی انتڑیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

چڑیا نے جب باز کو دیکھا تو فوراً اس نے اڑ کر اپنی جان بچانے کا ارادہ کر لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ جتنی پھرتی سے اڑ سکتی تھی اڑنے لگی ـــــ مگر باز کے پرواز کے سامنے اس کی پرواز کیا معنی رکھتی تھی ـــــ باز تو باز اور چڑیا بیچاری چڑیا تھی ـــــ تھوڑی ہی دیر کی لکن میٹی کے بعد باز نے چڑیا پر جھپٹا مارا ـــــ اور اگلے ہی پل اسے دبوچ لیا ـــــ چڑیا کو موت آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور وہ تو مر یا گئی ـــــ بے بسی سے پر پھڑپھڑانے لگی۔ جوں جوں چڑیا پر پھڑپھڑاتی تھی باز کی [illegible] تھا اور بڑھتی جاتی تھی ـــــ

" فضول ہے ـــــ فضول ہے چڑیا ـــــ میرے پنجے میں سے تم نہیں نکل سکتی۔ اب تم میرا نوالہ ہوگی ـــــ میری بھوک مٹ جائے گی ـــــ "

چڑیا کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

" شاید آخری نوالہ ـــــ مجھے کھا جانے کے بعد پھر کیا کھاؤ گے یہ کبھی سوچا تم نے باز ـــــ"

باز ہنسا ـــــ " کل کی کل دیکھی جائے گی ـــــ آج تو پیٹ بھر جائے گا۔" باز نے اپنی حرص پر بڑی عقلمندی سے جواب دیا۔

"تم نے یہ کبھی سوچا ہے ــــ آج تم مجھے کھا جاؤ گے ــــ کل خوراک کی تلاش میں نکلو گے۔ کہیں کچھ نہ پاؤ گے تو بھوک سے ایک نہ ایک دن مر جاؤ گے مگر یہ جنگل یونہی اسی طرح تباہی کا منظر بنا کھڑا رہے گا ــــ اس میں کوئی بھی جاندار نظر نہ آئے گا ــــ اگر تم اور میں زندہ رہتے ہیں تو اس جلے جنگل میں زندگی کا نشان باقی رہتا ہے۔ ہم دونوں ہر روز خوراک کی تلاش میں نکلیں گے اور جو مل جایا کرے گا مل بانٹ کر کھا لیا کریں گے ــــ اور اس جنگل کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھ سکیں گے۔ باز، ہر موسم ایک سا نہیں رہتا ــــ ایک نہ ایک دن آسمان سے رحمت برسے گی ــــ اور جنگل پھر ہرا بھرا ہوگا۔ مگر اس پہلی کونپل کو، جو اس راکھ کے ڈھیر میں سے پھوٹے گی اسے دیکھنے والا کون ہوگا ــــ"

چڑیا نے اپنی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ــــ

باز بوڑھا تھا۔ جہاں دیدہ تھا۔ تجربہ کار تھا ــــ اس نے چڑیا کے جسم پر اپنی گرفت ڈھیلی کردی ــــ اور سوچنے لگا ــــ دانا باز نے سوچا چڑیا کہتی تو ٹھیک ہے ــــ آج اسے کھا جاؤں گا تو کل کیا کروں گا۔ اس کے اور میرے دم سے اس جلے جنگل میں زندگی پھر سے شروع ہو سکتی ہے۔

باز نے چڑیا کو چھوڑ دیا اور اپنی چونچ اس کی چونچ کے قریب لے جا کر کہا۔

"شکریہ۔ پیاری ننھی رنگ دار چڑیا" اور پھر دونوں نے اپنے پنکھ پھیلائے اور آسمان کی طرف پرواز کی ــــ

اجنبی نے اپنی سارنگی پر گز پھرانا بند کیا اور اپنے لفظوں کو روک لیا۔ اپنے چہرے کو اپنے چلو سے صاف کیا ــــ گلے کو تھوک سے تر کیا اور ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ میں نے سوچا وہ ابھی آگے داستان سنانا شروع کرے گا۔ مگر وہ ایکا ایکی کراہنے لگا ــــ اسے شاید درد ہو رہا تھا ــــ اس کے چہرے کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"نہیں ــــ بس اور نہیں ــــ" وہ بڑبڑایا "میں آگے نہیں سناؤں گا۔"

میں ایکا ایکی جلے جنگل سے واپس آگیا ــــ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ادھوری داستان ــــ ادھوری داستان سناؤ گے"۔

"میں مجبور ہوں ــــ مجھ میں مزید طاقت نہیں۔ میری ہمت جواب دے گئی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے کندھے کو سہلانا شروع کیا۔ پھر کہا۔ "تم تو دانا ہو ــــ

اپنے ہنر میں یکتا ہو۔ ادھوری داستان سنا کر میری سوچ کا سفر کھوٹا نہ کرو ــــ میری بات مان جاؤ ــــ مجھ پر رحم کرو۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ تھوڑی دیر سوچا اور پھر اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی ــــ سارنگی سے سر نکلے اس کے ہونٹ ہلے۔ اور لفظ ابلنے لگے ــــ

"اسی طرح وقت گذرتا گیا ــــ باز اور چڑیا برسات کے انتظار میں جلے جنگل میں بسیرا کیے رہے ــــ وہ دونوں صبح سویرے مخالف سمتوں کو نکل جاتے۔ جہاں جلا ہوا جنگل ختم ہوتا وہاں نیا جنگل شروع ہوتا ــــ لیکن ان کے جنگل کی سرحد پر سے ابھی تک دھواں اٹھتا دکھائی دیتا۔ وہ بصد یاس و افسوس اس دھوئیں کو دیکھتے ــــ اور اگلے جنگل میں سے کھانے پینے کو کچھ ڈھونڈ کر واپس لوٹتے اور شام کو مل بانٹ کر کھاتے اور سو جاتے۔

ایک دن چڑیا کو لگا ــــ اس کا وزن کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اسے پرواز کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس بات کا ذکر اس نے باز سے کیا ــــ باز نے اپنا سر اس کے پیٹ کے قریب لے جا کر کچھ سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کی اور پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بولا۔

"آج سے تم خوراک کی تلاش میں نہیں جاؤ گی۔ سمجھیں۔ میں لاؤں گا جو کچھ بھی ہوگا اور اسی سے گذر بسر کریں گے۔"

اس دن کے بعد چڑیا کہیں نہ جاتی سات دن کے بعد اس نے ایک انڈہ دیا۔ چھوٹا سا گول گول سفید انڈہ۔ پھر کئی دن تک اس انڈے کو سینے کی حرارت دی اور ایک دن اس میں سے ایک ننھا سا پوٹ نمودار ہوا۔ جس کے جسم پر کوئی بال و پر نہ تھا ــــ آہستہ آہستہ پوٹ بڑا ہونے لگا ــــ اس کے جسم پر چڑیا جیسے رنگ دار پر اگ آئے مگر اس کا چہرہ اور چونچ بالکل باز جیسی تھی ــــ باز اور چڑیا اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ جو کچھ بھی باز لاتا وہ تینوں مل بانٹ کر کھا لیتے۔ چڑیا یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کا بچہ گوشت خور نکل رہا ہے ــــ وہ اس بات کو اپنے اندر ہی اندر دبا گئی ــــ باز پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا ــــ وقت یونہی گذرتا رہا ــــ اور ایک دن ایسا آیا کہ اس شام باز واپس نہ آیا دونوں بہت دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے ــــ اور پھر سب طرف اندھیرا پھیل گیا۔

کئی دن کے انتظار کے بعد چڑیا سمجھ گئی ۔۔ کسی سمت نکل گیا ہے ۔۔ جنگل کی آگ ابھی بجھی نہ ہوگی۔ یا پھر اس جنگل کی آگ کسی دوسرے جنگل تک پہنچ گئی ہوگی —— باز کے پنکھ جل گئے ہوں گے اور وہ جلتے ہوئے جنگل میں گر گیا ہوگا۔ بوڑھا بھی تو ہو گیا تھا ——

چڑیا غم زدہ ہو گئی —— اس نے اداس نظروں سے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ اب یہی اس کی امید تھا —— اور یہی اس کا مستقبل۔

گھونسلے میں جو کچھ تھا۔ وہ کچھ دن تک چل گیا —— اور پھر ایک ایسا لمحہ آیا کہ کھانے کو ان کے پاس ایک دانہ بھی نہ رہ گیا —— بچہ اتنا بڑا نہ تھا کہ چڑیا کے ساتھ اڑ کر خوراک کی تلاش میں جاتا —— اور نہ ہی اسے گھونسلے میں اکیلا چھوڑا جا سکتا تھا ——

چڑیا بڑے تذبذب میں پڑ گئی —— دو چار دن تو بھوکے رہ کر گذر گئے۔ آخر بچہ بھوک سے بے حال ہو کر تڑپنے لگا —— چڑیا نے اس کا اس طرح تڑپنا دیکھا نہ گیا —— وہ خود بھی بھوک سے بے حال تھی —— لیکن وہ تو برداشت کر سکتی تھی۔ مگر وہ ننھا سا پوٹ .....

چڑیا —— بچے کی بھوک کی وجہ سے گھبرا گئی —— بار بار اس کے پنکھ اوپر اٹھتے اور پھر بیٹھ جاتے —— چڑیا کے پنجے بے چینی سے ایک ہی جگہ پر حرکت کرتے —— بچہ چلا چلا کر اپنی بھوک کا اظہار کرتا رہا۔

مغرب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سورج نے یہ سب دیکھا۔ اور ندامت سے سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

سب طرف ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا —— بچہ بری طرح تڑپنے لگا —— اور گردن اٹھا کر چڑیا کی طرف دیکھنے لگا —— چڑیا اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی —— وہ سمجھ گئی کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ پائے گا۔

چڑیا نے بے بسی کے عالم میں اپنی چونچ اپنی چھاتی میں چبھو دی —— اتنے زور سے کہ چھاتی میں سے خون نکل آیا۔ چڑیا نے بچے کو اپنے پنکھوں میں سمیٹ لیا۔ بچہ چھاتی سے بہنے والے خون پر اپنی چونچ رکھ کر پینے لگا اور خاموش ہو گیا۔

چڑیا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ جان گئی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا بچہ بھوک سے نہیں مر سکتا —— اس سرمستی میں اس نے اپنی چھاتی اپنی چونچ سے لگاتار حملے کرنا شروع کیا —— بچہ بڑے اشتیاق سے اپنی ماں کا خون چاٹنے لگا —— اس کے جسم میں ہر لحظہ توانائی آتی جا رہی

تھی ـــــ اور چڑیا . . . . ناتواں چڑیا . . . . اور وہ . . . ."

اجنبی اچانک ایک ساکت ہو گیا ـــــ سارنگی پر گز پھرایا ہوا اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور لفظ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو گیا۔

میں تھوڑی دیر تو یہ سب حیرانی سے دیکھتا رہا پھر اس نے آواز دی۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا ـــــ؟"

مگر اندھیرے کمرے میں میری ہی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر لفظ لفظ فرش پر گری میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے کو جھنجھوڑا ـــــ اور دوسرے ہی لمحہ وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سارے جسم میں اینٹھن پیدا ہو گئی ـــــ وہ مر گیا تھا۔

"مگر . . . . مگر یہ تو بتا دیتے کہ اس داستان میں تیری رمز کیا تھی۔ جس سے ان کے خداؤں کی بے حرمتی ہوتی تھی ـــــ"

مگر وہ اب کیا جواب دیتا ـــــ اس کا جسم تو انھوں نے مار دیا تھا۔ ذہن داستان سناتے سناتے مر گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کیا کروں۔ میں اتنا ضرور جانتا تھا۔ کہ مرنے والے کے تجہیز و تکفین کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے ـــــ فی الفور میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ وہ مرنے والے کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

صبح ہوئی تو دفن سے پہلے میں نے اس کو غسل دینے کا ارادہ کیا ـــــ ایک ایک کر کے اس کے کپڑے اتارنے شروع کئے ـــــ ہر کپڑا خون اور کیچڑ سے بھرا ہوا تھا ـــــ جب سب کپڑے اس کے جسم سے الگ ہو گئے تو اچانک میری نظر اس کی چھاتی پر پڑی ـــــ چھاتی بالکل لہولہان ہو رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا ـــــ تو ایسے لگا جیسے کسی چڑیا نے چونچیں مار مار کر اس میں سے خون نکالا ہے ـــــ چھاتی پر چونچ سے لگائے گئے ان گنت زخم تھے۔ میں خوف زدہ ہو گیا اس کے بعد مجھ میں ہمت نہ ہوئی کہ اس کے جسم کو ہاتھ لگا سکتا۔

شام ہوتے ہوتے بارش تھم گئی اور غروب ہوتے ہوتے سورج کی شعاعیں پہاڑوں پر پھسلنے لگیں ـــــ اور پھر دھند لکا چھا گیا۔ اندھیرا ہوا ہی تھا کہ ایک گاڑی سرائے کے پھاٹک کے قریب آ کر رکی ـــــ اس میں سے ایک سایہ نمودار ہوا ـــــ پھر فضا میں "خدا حافظ، خدا حافظ" کی آواز گونجیں ـــــ ان آوازوں میں سے ایک آواز بڑی جانی پہچانی تھی۔ وہ آواز امیر اللہ کی تھی۔

میں اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا امیر اللہ کو سرائے کے اندر آتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ سائے کی طرح اندھیرے میں چلتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے کندھوں پر سامان کے تھیلے لٹک رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر بولا۔

"آپ حیران ہوئے ہوں گے صاحب جی۔ یہ امیر اللہ کہاں رہ گیا۔؟"

"ہاں امیر اللہ ___ میں بہت پریشان ہو گیا تھا ___ کہاں رہ گئے تھے تم۔" میں نے جس آواز میں اسے کہا ___ میں اسے خود پہچان نہیں پایا تھا ___

امیر اللہ نے بتایا کہ راستے کیچڑ سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ ایک لمبا چکر لگا کر دیور جانے کی کوشش کرنے میں مصروف تھا ___ کہ اس نے دیکھا راستے میں ایک گاڑی دل دل میں پھنسی ہوئی تھی ___ اس گاڑی میں پورا ایک خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لوگ بہت پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ انھوں نے امیر اللہ سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد کرے۔ امیر اللہ ایک قریبی گاؤں میں گیا اور وہاں سے مدد لے کر آیا اور ان کی گاڑی دل دل سے نکالی۔ تب اسے پتہ چلا کہ وہ اپنے راستے سے بھٹک کر وہاں جا پہنچے تھے۔ امیر اللہ انھیں ان کی منزل تک پہنچانے کے لئے ایک لمبا چکر لگا کر کپواڑے تک چلا گیا تھا ___ کپواڑے سے وہ میرے لئے کھانے کا سامان سگریٹ اور اپنی بہت سی ضروریات کی چیزیں لے کر انھیں کے ساتھ اندر باگ تک آیا تھا۔ راستے کے کئی پل بارش کی کثرت سے ٹوٹ چکے تھے۔ اور اب واپس جاتے ہوئے وہ اسے سرائے تک چھوڑ گئے تھے۔

میں نے سارا احوال خاموشی سے سنا۔ اور پھر اسے بتایا ___ کہ ایک اجنبی کی لاش ساتھ والے کمرے میں پڑی ہے۔ اور آخری سفر کا انتظار کر رہی ہے۔

"کوئی بات نہیں جی۔ کسی کی تجہیز و تکفین میں مدد کرنا تو ثواب ہے۔ میں یہ سب کر دوں گا صاحب جی۔" اس نے جھولے میں سے موم بتی نکال کر جلائی اور اسے میرے بستر کے قریب لگا دیا۔

رات امیر اللہ نے بڑا مزے دار کھانا بنایا۔ ہم دونوں نے آتش دان کے قریب بیٹھ کر پیٹ بھر کر کھایا ___ وہ پچھواڑے کے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آیا تھا۔

صبح ہونے پر ہم دونوں نے مل کر اجنبی کی آخری رسومات ادا کر دیں۔ اس کی قبر میں مٹی ڈال کر لوٹے تو میں بے انتہا اداس تھا ___ میں نے امیر اللہ کا کپواڑے سے لایا ہوا سگریٹ سلگایا اور برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دور دور تک دیکھنے لگا۔ مجھے وہ راستے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ جن پر سے گذر کر میں نے جانا تھا۔ میں یہاں رہتے رہتے اوب گیا تھا۔ چاہتا تھا ___ جلد سے جلد

یہاں سے نکل جاؤں اور اپنے ساتھیوں سے جا ملوں۔ جو مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ یا پھر دیکھوں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔

امیر اللہ چائے بنا کر لایا۔ اس کی بغل میں ایک اخبار تھا۔ اس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ "سورج چمکنے لگا ہے صاحب جی۔ راستے سب کھل گئے ہیں ـــــ اب آپ جہاں جانا چاہتے ہیں جا سکتے ہیں۔"

اس نے اخبار بغل میں سے نکال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کے لئے تازہ اخبار لایا ہوں صاحب جی۔ کپواڑے سے مل گیا تھا۔"

میں نے اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑائی ـــــ وہ چار دن پرانا تھا۔ پھر میں نے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑائی ـــــ اچانک میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند لگا سا چھا گیا۔ اخبار کے پہلے صفحہ پر موٹے موٹے الفاظ ابھرے "کراچی، امرت سر، احمد آباد، دارجیلنگ، تلنگانہ، ڈھاکہ، فلسطین، جافنا، عراق، ایران"۔ پھر وہ الفاظ بم کی طرح ایک ایک پھٹنے لگے دھائیں.... دھائیں.... سب طرف دھواں اٹھنے لگا ـــــ اور یہ دھواں اور دھوئیں کی تہہ میں ابھرنے والے شعلے جنگل کی آگ کی طرح سب طرف پھیلنے لگے ـــــ پھر دھواں دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا۔ اور وہی الفاظ دوبارہ نظر آنے لگے ـــــ اس بار وہ الفاظ چھوٹے چھوٹے سنپولئے بن کر سر اٹھانے لگے ـــــ اور ایک ہی جست میں مجھ پر حملہ آور ہونے لگے ـــــ میں نے ایک خوفناک چیخ کے ساتھ اخبار کو زمین پر پھینک دیا۔

"کیا ہوا صاحب جی۔؟" امیر اللہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"امیر اللہ.... امیر اللہ جنگل میں آگ لگی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا راستے ابھی کہاں کھلے ہیں؟ کئی پل ٹوٹ گئے ہیں ـــــ میں انتظار کروں گا۔ اور اگر میں مر گیا ـــــ تو تم میری تجہیز و تکفین کر دینا ـــــ کسی مسافر کی قبر میں مٹی ڈالنا ثواب ہے۔"

امیر اللہ میری رمز کو شاید نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ جس میں کل اجنبی داستان گو کی لاش کو غسل دینے کے لئے میں نے اس کے کپڑے اتارے تھے۔ □

نئی ۔ اگست ۸۹ء

B-3/153 جنک پوری
نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸

دیوبندر اسّر

بستر سے پرے بستر کی باتیں

کچھ ہوا۔
نہیں ۔
دیکھو تم نے بہت دنیا دیکھی ہے لیکن ان عورتوں کے بارے میں گر باکشتن روز اول والی بات ہے ورنہ سمجھو کہ بلّی ہاتھ سے نکل گئی ۔
اور کہا کہ ٹھیک ہے عشق کافی کے پیالوں سے شروع ہوتا ہے لیکن کافی کے پیالوں پر ختم نہیں ہوتا ۔ اور جب کچھ نہیں ہوتا تو رہ جاتے ہیں کافی کے خالی پیالے ۔ اور کہا کہ آج کل عورتیں اتنا زیادہ انتظار نہیں کرتیں ۔
میں اس کے جسم ، اس کے دل و دماغ ، روح کو ایکسپلور کرنا چاہتا ہوں ۔ آہستہ آہستہ ـــــ اس کی تمنائیں ، خواب ، یاس ، شکست ، امیدیں ، بھرم ، واہمے ، خوف ، تمنائیں ۔۔۔
" بس بس ۔ تم ہوپ لیس رومانٹک ہو ۔ سینٹی مینٹل ۔ جب تک تم یہ سب کچھ ایکسپلور کرو گے وہ کسی دوسرے کے بستر پر پہنچ چکی ہوگی ۔
شاید تم ٹھیک کہتے ہو ۔ کسی کو وہاں پہنچنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے ۔
تم وہاں جلدی نہیں پہنچو گے تو وہاں کبھی بھی نہیں پہنچ سکو گے ۔
میں نے کہا کہ میں عورت سے ری لیٹ کرنا چاہتا ہوں ۔
تو کیا اس کے لئے ہم بستر ہونا ممنوع ہے ؟
نہیں ۔ شاید ضروری بھی ہے ۔ لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ آغاز ہو ۔ لیکن یہ انجام بالکل نہیں ۔
اگر سوال محض بستر کا ہی ہوتا تو ۔۔۔۔
بستر کے ساتھ آرگزم کا بھی ۔
شاید ۔

کنسے، رینخ، فرائیڈ، ہولاب ایلس، جانسن اینڈ ماسٹرز، شیری ہائٹ۔ برکاش لو تھاری، نینسی فرائیڈے اور وی جوائے آف سیکس، اینی ووسن کین، ٹوٹل آرگزم اور سینٹرس سیکس مینولز نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا کیوں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہم بستری کا ہے اور ماہرینِ جنسیات اسے محض تیکنیکی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور لوگ ایک بستر سے دوسرے بستر تک بھٹکتے رہتے ہیں اور آخر کا خود بھی بستر بن جاتے ہیں اور جب کوئی بستر بن جاتا ہے تو وہ اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ عورت کے پاس کئی رنگ ہیں۔ سیکس کے ہر وار سے بیدار ہونے کے لئے اسے جذب کرنے کے لئے مرد کے پاس صرف ایک ہی رنگ ہے اور وہ بھی کون سا یقین آمیز ہے۔ عورت شکتی ہے، اور مرد کے لئے جنسی تسکین کے لئے خود لذتی اور مباشرت میں کوئی گہرا فرق نہیں۔ مرد کو ہمیشہ اپنی مردانگی کی فکر رہتی ہے۔ مرد کی حدیں ہیں۔ گنتی محدود ہے۔ جب بھی وہ نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے سمٹ جاتا ہے۔ عورت آل ایمبر سنگ ملٹی آرگزم کے قابل ہے اور مرد تو محض ون ڈائی مشین ہے۔ ۔ ۔ ۔

آخر بولنے لگے نامردوں کی زبان ـــ

دیکھو مادام ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیو ـــ اور گہرا سانس لے کر سوچو کہ آخر تمھارا یہ ووممن بریستن کا شور شرابا ہے کیا۔ اگر مقصد محض آزادی، خود کفیلی، برابری، خودداری اور آئی ڈنٹٹی کا ہی ہوتا تو انگیا جو کا نہ جلائی جاتی۔ تم مرد بننا چاہتی ہو۔ جو کچھ بھی تم کر رہی ہو وہ ایک طرح سے سیکولین پروٹسٹ ہے۔

اُتر آئے نہ فرائیڈ پر۔ آخر وہ بھی تو مرد ہی تھا۔ کامپلکسز کا شکار ہو ـ ـ ـ ـ

اب میں جارحانہ موڈ میں تھا۔

تمھیں اپنے پستان بھاری کیوں لگتے ہیں۔ یونی ایک اندھیری گپھا کیوں نظر آتی ہے۔ گربھ آشہ سے تم آزاد ہونا کیوں چاہتی ہے؟

اس لئے کہ یہ سب کچھ تمھارے لئے محض جنسی لذت کے لوازمات ہیں اور ہمارے لیے جنم دینے کی اذیت، پیدائش اور پرورش کی مجبوری کے سمبلز۔

تو ہو جاؤ ان سے آزاد۔ لیکن تم مرد پھر بھی نہیں بن سکتی۔

تم ہماری بائیولوجی کا مذاق اڑاتے ہو ـــ میل شوونسٹ پگ۔

نہیں میں تو محض یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے جسم کی حفاظت کی خاطر لڑتے لڑتے اپنے جسم

کے خلاف ہی لڑنے لگی ہو ـــــ جب مرد تمہیں عورت سمجھتا ہے تو پروٹسٹ کرتی ہو ـــــ اور جب نہیں سمجھتا تو آفنس محسوس کرتی ہو۔ ہمیں نامرد سمجھتی ہو۔ انگریزی کا ایک لفظ ہے ANDRO GYNY - ANDRO یعنی مرد اور GYNY یعنی عورت۔ ICHING کے مطابق اندرونی دائرے کے سیاہ حصے میں ایک سفید نقطہ اور سفید حصے میں ایک سیاہ نقطہ۔ یعنی ہر مرد اور عورت میں ایک دوسرے کا جزو موجود ہوتا ہے HERMAPHRODITE اور اردھ ناریشور انسانی فطرت بھی ہے اور مقصد بھی۔ کون کس سے لبریٹ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک نئی متھ (MYTH) ہو گی جو ایک نہ ایک دن ضرور ٹوٹ جائے گی۔ چلو چھوڑو جسم کے قصے کو۔ اختر الایمان کی ایک چھوٹی سی نظم سنو۔

"جسم کی جستجو ~~لگی~~ یہ سو
جسم کی آرزو لے گئی کو بہ کو
اور جب خوانِ نعمت سجایا گیا
ایک گل پیرہن ڈھونڈ لایا گیا
دفعتاً تب یہ احساس پیدا ہوا
گوشت اور پوست کی چرخی ہوس میں
ایک پیسہ ہوس میں گشت کرتا ہوا
اشتہا مٹ گئی پیٹ کی جسم کی
روح پیاسی تھی ویسی ہی پیاسی رہی
میرے عزیز سفر نے مجھے کیا دیا
شرق سے غرب کا صلہ فاصلہ"

ہمارا مسئلہ ہے فاصلہ۔ ہماری تہذیب نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب نہ ہونے کی تعلیم دی ہے۔ جسموں کے بیچ فاصلہ، قوموں کے بیچ فاصلہ، مذہبوں کے بیچ فاصلہ۔ رشتوں میں فاصلہ، حاکم و محکوم میں فاصلہ۔ پیار نہیں ہوتا کیوں کہ فاصلہ ہے۔ پیار پرورش نہیں پاتا کیوں کہ فاصلہ ہے۔ ٹوٹ جاتا ہے کیوں کہ فاصلہ ہے۔ وہ کیا ہے جس کے کھو جانے کا ہمیں ڈر ہے۔ سوال وجود کے مٹنے کا نہیں حصاروں کے گرانے کا ہے۔ اور ہم حصاروں کو گرانے کو تہذیب، سماج، سنسکار اور ذات کے ٹوٹنے کا عمل سمجھتے ہیں۔ جذبے سے عاری معاشرت اور معاشرت سے پرے خود لذتی اسی فاصلے کا انجام ہے۔ میں نے کبھی لکھا تھا:

" چاند بہت قریب چھت پر آگیا تھا۔ روشنی اور سایے کے شہر میں چاند اکیلا تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ میں جھپٹ کر چاند سے لپٹ جاؤں میرے بستر پر اب بھی چاندنی بلی سی دبکی بیٹھی تھی اور مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے بہت قریب ہو کر بھی بہت دور ہے۔ یہ فاصلہ کچھ قدموں کا نہیں میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہ سب عیش آرام کس لئے۔ پیٹ بھر لیا۔ شراب پی لی۔ برج کھیل لیا اور ایک دوسرے کو دینے کے لئے ہمارے پاس ننگے جسم کے سوا اور رہ بھی کیا لیا ہے۔"

سی دوسرے کے دل میں داخل ہو جانا ۔ بستر کے پھیلاؤ کو سمیٹنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

مادام یہ معاملہ پیراسیکوئل تجربے کا ہے۔ یکمل شخصیت کے مدغم ہونے کے تجربے کا

دل دریا سمندروں ڈونگے۔ کونڑ دلاں دیاں جانڑے۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

یا تو تم سنبھوگ سے سمادھی کی طرف جا رہے ہو یا تم سنبھوگ کے قابل ہی نہیں رہے۔

سیکچوئل پیرالسس۔

زندگی این کاؤنٹر کا نام ہے۔ این کاؤنٹر پاپشن کے بغیر ممکن نہیں۔

کیا پیشن سیکس کے بغیر ممکن ہے؟

ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہاں اگر سنبھوگ این کاؤنٹر کی شکل میں ہوتا ہے تو وہ ایک مسلسل تجربہ ہے۔ ہر این کاؤنٹر ایک حادثہ ہے ' اہم، تخلیقی عمل ہے۔ یکمل، بھرپور اور آخری۔ اس کے بغیر وہ محض خود لذتی ہے۔ نارسزم کا شکار ہے۔

اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو؟

تو سنبھوگ کرو۔ جیسے بھی ہو جس سے بھی ہو۔

مجھے وومن پرستن کی ایک تیز طرار مفسر جرمین گریر کی بات یاد آگئی ۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اب تنہا کسی پہاڑی مقام پر رہتی ہے۔ جب بھی اسے ضرورت پڑتی ہے تو وہ اپنے کسی جاننے والے کو فون کرتی ہے WOULD YOU COME AND SERVICE ME۔

لیکن اب تو وہ بھی بدل گئی ہے ــــ سیلی بیٹ ــــ

وہ سنجیدہ ہوگئی۔

دنیا کی عورتوں ایک ہو جاؤ۔ تمھارے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں سوائے تمھارے شوہروں کے اور حاصل کرنے کے لئے دنیا بھر کے تمام مرد ہیں۔ میں نے کہا۔

یوں کیوں نہیں کہتے۔ دنیا کے مردوں آواز دو ہم ایک ہیں۔ ہمارے پاس بیویاں بھی ہیں اور بازار میں بکتی ہوئی دلیشیائیں بھی۔ اور ہم صدیوں سے حرم بھی سجاتے آئے ہیں اور کنیزیں بھی رکھتے —— ہماری حیثیت کیا ہے؟ "ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح / اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح"—— ہم مرد نہیں بن جانا چاہتیں۔ لیکن ہم اپنے جسم کو بازار بھی نہیں بننے دینا چاہتیں۔ جب عورت آزاد ہوگی تو دھماکہ تو ہوگا ہی۔ ہم واپس لوٹیں گے لیکن ان دیواروں کے گھیرے میں نہیں جو قید خانے کی دیواریں ہیں۔ اس چھت کے نیچے نہیں جو ہمارے جسم، دل اور دماغ پر آکر ٹوٹتی ہیں—— دکھو دیو....

میں چونک گیا۔ برسوں بعد کسی نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا تھا۔

ایک تجربے کی تلخی سے تم درٹی گو کا شکار ہو گئے ہو۔ تمھیں ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جسم ہو یا روح تم جس کی خواہش کرتے ہو اور جب جسم تمھارے پاس سے گزرتا ہے تو تم انتر گھٹ تک پیاس کی بات کرنے لگتے ہو اور جب تمھارے پاس روح آتی ہے تو تم جسم کی جانب لپکتے ہو۔ بی ایٹ بیس ود یور سیلف۔ فلسفے کا شبد جال پھینک دو۔ اپنے تجربے کو کاٹ کر پرے پھینک دو —— ماہرین نفسیات کو اپنے حال پر چھوڑ دو —— یہ سرجری سے بھی زیادہ مشکل کام ہے لیکن یہ تمھیں کرنا ہوگا اور تم دیکھو گے کہ چیزوں کا گھومنا بند ہو گیا ہے۔ یہ کام مشکل ہے لیکن تمھارے ورٹی گو کا یہی علاج ہے۔ کیپ یور چن اپ۔

اور میں نے اپنے تجربے کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔

میری ایک دوست تھی۔ وہ اسپتال میں بریسٹ کینسر سے نجات پانے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی (مرض کا اس کی لائف اسٹائل سے کوئی تعلق نہیں) اس کے دوست آتے تسلی دیتے۔ اس کے سرہانے پھل پھول رکھتے اور چلے جاتے جس کے اتنے پرستار ہوں اسے کتنا خوش ہونا چاہئے۔

تمھیں پھولوں سے کتنا پیار تھا۔ کتنے رنگوں کے کتنے خوشنما، کتنی خوشبوؤں والے پھولوں سے تم گھر گئی ہو۔ میں نے کہا۔

میں نے ان دنوں ایک پودا اگایا تھا۔ نت دن اس کو پانی دیتا تھا۔ جب میں اس سے

ملنے جانے لگا تو اس میں ایک ہی پھول تھا۔ اور ابھی پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا۔ سوچا اسے پیش کروں۔ لیکن پھول توڑنا مجھے پسند نہیں۔ پھر ایک اکیلا ادھ کھلا پھول۔ ہاتھ بڑھاتا اور لوٹ آتا۔ اسی کشمکش میں کئی لمحے بیت گئے۔ میرے سامنے اس کا مرجھایا چہرہ تھا۔ پیلا زرد پڑتا ہوا۔ میں نے پھول توڑلیا۔ اسپتال پہنچا۔ پھولوں کے بڑے بڑے جھرمٹوں میں وہ گھری ہوئی تھی۔ میں نے اسے پھول پیش کیا۔ اس نے اس کی نرم نرم پتیوں کو چھوا۔ دھیرے دھیرے کھولا۔ گالوں سے لگایا۔ خوشبو کا۔

— جب پھول دھیرے دھیرے کھلتا ہے تو کتنا بھلا لگتا ہے۔ اس نے کہا۔

اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ میں نے انگلیوں سے اس کے ماتھے کی پسینے کی بوندیں صاف کیں۔ اور پھر ہم باتیں کرتے رہے۔ بہت پرانی دقیانوسی باتیں۔ پیار، گھر، خاندان، شادی، بچے، دل، جسم، روح، انشور، قسمت۔

میں نے زندگی کے تیس برس پورے کرلئے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان برسوں میں صرف ریت ہی اڑتی رہی ہے۔ ریگستان۔ دم لینے کے لئے کسی پیڑ کی چھایا تک نہیں۔ مجھے اب کسی چیز سے سکھ نہیں ملتا۔ نہ کلا میں، نہ دیش ودیش گھومنے میں، نہ پیار میں نہ پرش، نہ ہی زندگی میں۔ خودکشی بھی کس لئے۔ میرا جسم میرا دل پتھروں کا نگر بنتا جارہا ہے۔ یہ جسم ایک قلعہ بن چکا ہے۔ خواہشوں کا مرگھٹ۔ جیسے سب سنسان بیابان ویرانے ہیں۔ جسم کی جنّت کیا ہوتی ہے؟

دل کی دنیا کیا ہے؟ روح کی راحت کیا چیز ہے۔ کچھ معلوم نہیں۔

وہ کہے جارہی تھی۔ جسم لفظ کیسے بن جاتا ہے یہ میں نے پہلی بار محسوس کیا اور اس سے کہہ دیا۔ وہ مسکرادی۔

تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تمہارے لئے شبد جسم کے تجربے کو معنی دیتے ہیں۔ اور میرے لئے جسم شبدوں کو ارتھ دیتا ہے۔ اس نے کہا۔

شاید یہ فرق بائیو سیکچولیٹی اور سائیکو سیکچولٹی کا ہے۔ میں نے کہا۔

میں نے سوچا تھا کہ جذبات بھرم ہیں۔ رومانٹک ہونے کا مطلب ہے کہ میں نے گرو (GROW) نہیں کیا۔ پیار محض نوعمری کا واہمہ ہے۔ ڈسکو کا شور سنگیت ہے۔ خواہشوں کی جلتی جھاڑی خوشبو ہے۔ پیار اور جدائی کے پرانے گیت کوری جذبات پرستی ہے۔ محض شاعری ہے۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

میں نے سوچا تھا کہ یہ کہانی ایک عام مایوس عورت کی داستان ہے جو دوسروں کے ذریعے استعمال کئے جانے پر خوش تھی اس بھرم سے کہ وہ ان کا استعمال کر رہی ہے۔ یا یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ محض میرا تخیل ہے۔ حالات کو اس طرح دیکھتا جیسا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سیلیکٹو پرسیپشن (SELECTIVE PERCEPTION) یا میری اپنی فرسٹریشن یا محرومی یا محض فکشن۔

مجھے اس طرح کسی نے نہیں چاہا۔ وہ اچانک بولی۔

میں تو تمھارا دوست ہوں۔ اور وہ بھی کبھی کبھی مل بیٹھ چائے پینے کے لئے۔

لیکن تمھارے ساتھ چائے پیتے ہوئے مجھے یہ احساس کبھی ہوتا تھا کہ میرا پورا جسم ہے۔ پورا دل ہے۔ دماغ ہے۔ میرا جسم ساری دنیا ہے۔ سارا آکاش ہے کہ میں ایک عورت ہوں۔

میں خاموش رہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مجھے کسی نے عورت کے روپ میں نہیں چاہا۔ عورت کے جسم کے روپ میں چاہا ہے۔ وہ بھی پورے جسم کے روپ میں نہیں۔ اور جب میں محض جسم سے عورت بننے لگی تو اس بستر پر آگری۔

آخر تم اتنا کام کرتی ہو —— اتنی دوڑ دھوپ —— اسی بہانے کچھ آرام ہی سہی۔

وہ ہنس دی۔

اب میرا جسم ایسا چٹیل میدان بنتا جا رہا ہے جہاں کوئی چشمہ نہیں پھوٹتا۔ کوئی پھول نہیں کھلتا۔ ایسی بنجر زمین جہاں کسی کی چھایا تک نہیں پڑتی —— ایک بات بتاؤ۔ اس نے کہا۔

بولو۔

مجھے وویک بہت یاد آتا ہے۔

اس لئے کہ جسم کی لہریں دوسرے جسم کی دیواروں سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتی ہیں لیکن سمے کے ساگر میں یادوں کا سرچشمہ بن کر ہمیشہ پھوٹتی رہتی ہیں۔

کبھی ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

ہاں۔

کہاں؟

بوسٹن میں۔ اچانک پرانی چیزوں کی ایک دوکان میں۔

میرے بارے میں بات ہوئی۔

ہاں۔
کیا کہہ رہا تھا؟
پوچھا۔ تم کیسی ہو؟ کبھی ملاقات ہوئی۔ کیا کرتی ہو۔
تو تم نے کیا کہا؟
بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی حالانکہ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ اچھی ہوگی۔
کیا کرتا ہے ـــ وہاں تو بڑا خوش ہوگا۔
ہاں خوش ہی تھا۔
لیکن کیا کرتا ہے؟
رنگ کرتا ہے۔
کیا؟
دروازوں، کھڑکیوں، مکانوں، دوکانوں کو پینٹ کرتا ہے۔
شادی کی؟
نہیں۔
تو پھر!
فلاسفی میں ڈاکٹریٹ بیچ میں چھوڑ دی۔
وہ خاموش ہوگئی۔
وہ تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔ کہتا تھا تم کتنی شریر ہو۔ انوسینٹ، بڑی پیاری ننھی سی بلی۔

میں سوچ رہا تھا، زندگی کیا ہے۔ کبھی اتنی روشن کہ سورج کا گولہ پھٹ گیا ہو اور کبھی افریقہ کے جنگلوں کا سا گھپ اندھیرا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو سینٹی منٹل ہونا، رومانٹک ـــ کہلانا، سنسی بلٹی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ خواب دیکھنا، بھرم پالنا، جذباتی ہونا۔ یہ سب کچھ مضحکہ خیز، دقیانوسی، اِم میچوریر نہیں تھا۔ کیوں کہ ہم پتھروں کے شہر میں شیریں کی شیشے کی مورتیں تراشتے تھے۔

یہ الفاظ کس کے تھے۔ شاید سارہ ڈیوس کے " وہ لوگ جو سیکس کے بڑے ماہر ہیں۔

جن کے لئے آرگزم، جنسی قوت اور نقطۂ عروج کا سوال بڑا اہم ہے۔ جن کے لئے جنسی تسکین عضا کی لمبائی چوڑائی پر منحصر کرتی ہے جو جنسی عمل میں طرح طرح کی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں اور آرگزم کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ وہ کیوں ایک جسم سے دوسرے جسم تک بھٹکتے رہتے ہیں۔ غیر مطمئن مایوس۔ مجھے جنسی لذّت چاہیئے لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ انسان کے روپ میں اس کے بارے میں میرا رویہ کیا ہے نہ کہ اس کی جنسی ظفریابی کیا ہے۔ اس بارے میں تو میں اسے دیکھ کر ہی پیشین گوئی کرسکتی ہوں لیکن انسان کے روپ میں میں اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کرسکتی۔ یہی سب کچھ فرق کر دیتا ہے۔ میں کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کا منظر دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہوں بجائے اس کے کہ میں کسی ایسے مرد کے ساتھ ہم بستر ہوں جس کا صلہ محض آرگزم ہے۔ وہ تو میں خود بھی حاصل کرسکتی ہوں بغیر کسی مرد کی مدد کے۔ لیکن کیوں؟ جس مرد نے یہ آرگزم دیا ہے نہ میں اسے چاہتی ہوں اور نہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ یہ تو جنس کی عیارانہ چال ہے۔ اگر مباشرت اپنے سے وسیع تر ذاتی کمیونی کیشن کا جزو نہیں بن جاتی تو یہ جسمانی انجینیرنگ (ENGI — NEERING) شاہکار ہے۔ ایسا پُل ہے جس کے اس کنارے سے اس کنارے دو جسموں کے ستون ہیں۔ لیکن جو کہیں بھی نہیں لے جاتا۔ اور جس کے کناروں کے بیچ کوئی ندی نہیں تھی۔ لیکن یہ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔ یہ سیکس کا مسئلہ کیا ہے؟ یہ آرگزم کیا ہے؟ یہ جسم کی ضرورت کیا ہے۔ عورت مرد کا رشتہ کیا ہے۔ ولز ٹیلر آٹھویں بار شادی کرتی ہے۔ مارلن منرو خودکشی کرلیتی ہے یا اس کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ اور آوا گارڈنر کہتی ہے "خوشی اور دائمی شادی شدہ زندگی کے لئے وہ ایک لمحے میں اپنا کیریر چھوڑنے کو تیار ہے۔ یہ خواہش کرتے کرتے میری عمر بیت گئی کہ کسی دن ایک اچھے مرد کو حاصل کرلوں گی۔ جس سے میں پیار کروں۔ اس کے لئے کھانا بناؤں۔ گھر بساؤں۔ جو ہر روز زندگی میں میرے ساتھ رہے۔ لیکن مجھے ایسا مرد نہیں ملا۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو میرا سیکس امیج بنایا گیا تھا لوگ سمجھنے لگے کہ میں زندگی میں بھی ویسی ہی ہوں لیکن اس سے زیادہ بڑی غلطی کوئی نہیں کرسکتا۔ کوئی یقین نہیں کرتا کہ میں حد درجہ کی شرمیلی ہوں۔ میری زندگی کی قدریں ایک گاؤں کی سڑک کی قدریں ہیں۔"

اور ہندوستان میں کوئی فلم اسٹار دوسری عورت نہ بننے کا اعلان کرتی ہے اور دوسری عورت بن کر دوسری عورت کا حق چھین لیتی ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ میں اپنے اردگرد عورتوں اور مردوں کے بنتے بگڑتے رشتوں کو دیکھتا

ہوں۔ جسم کو جسم سے ٹکراتے پاتا ہوں۔ قتل، خودکشی، طلاق، زہر کھا کر موت۔ آگ میں جلتے جلاتے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ پیار پر مرمٹنے والے اور نفرت کی آگ میں جلنے والے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ سیکس کا سائیں سائیں کرتا جنگل دیکھتا ہوں اور جسم کا بپھرتا سمندر دیکھتا ہوں اور من کا بھٹکتا مدھوبن دیکھتا ہوں تو مجھے یہ سب بڑا کنفیوزڈ لگتا ہے۔

تمھیں کچھ روشنی ملی ہو یارو تو مجھے بھی خبر کر دینا۔ □

عبدالصمد

محلی پر، بہار شریف
نالندہ (بہار)

گومڑ

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر کوئی گومڑ سا نکل آیا ہے۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے سر کے اوپر چلا گیا لیکن سہلانے اور ٹٹولنے کے بعد اس کے ہاتھ نے بتلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کا جی بہت چاہا کہ اس پر یقین کرے۔ رہ رہ کے اسے لگ رہا تھا کہ ضرور اس کے سر پر کوئی گومڑ نکلا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو باری باری سر پر بھیج کر انھیں یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ہاتھ تھے کہ اپنی جگہ پر اڑے ہوئے تھے۔ تھک ہار کر اس نے اپنے ہاتھوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا لیکن اپنے آپ کو جھٹلانے کی کوشش میں سخت ناکام رہا۔

گومڑ کا احساس ہونے کے بعد اس کا کسی کام میں جی نہیں لگا۔ لیکن بکھرے ہوئے دانوں کو چننا بھی ضروری تھا، سو اس نے اس کا علاج یہ نکالا کہ بڑی سی فرکی ایک ٹوپی خرید لی۔ مگر لوگوں کو بھی کہاں چین تھا، دیکھتے ہی سوال داغنے لگے۔

"کیوں یار —— یہ اچانک اتنی بڑی ٹوپی —— ابھی تو سردی بھی نہیں آئی۔"

"بس یونہی —— خالی خالی سر کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"رہی، یعنی قبل سے اس میں کچھ تھا۔"

"یار اپنے سر سے میرا مقابلہ کیوں کرتے ہو۔ تمھارے سر میں اگر کچھ نہیں تو اس کا مطلب۔"

"خواہ مخواہ کی باتیں کیوں کرو، سچ سچ بتاؤ، بات کیا ہے —— ؟"

وہ گھبرا گیا، کہیں اس کی چوری نہ پکڑی جائے۔ ایسے میں اپنے آپ پر قابو پانا بھی بہت ضروری تھا۔

"سچ بتا رہا ہوں۔ سر واقعی خالی لگ رہا تھا، ٹوپی پہن لی ہے تو لگ رہا ہے کہ . . ."

"لیکن فرکی ٹوپی —— کوئی ہلکی پھلکی ٹوپی پہن لی ہوتی ——"

"بس یونہی۔"

اس وقت تو بات ختم ہو گئی لیکن اسے محسوس ہوا کہ ٹوپی پہننا بھی گومڑ نکلنے سے کچھ کم نہیں ہے۔ اسے لوگوں کے سوالوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دیر تک سوچ میں رہا کہ کیا کیا جائے۔ گومڑ کو برداشت کرے یا ٹوپی پہنے۔ اس نے کمرہ بند کر کے گھنٹوں اپنے آپ کو ٹوپی کے بغیر رکھا اور تب اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹوپی بہر کیف گومڑ سے زیادہ بہتر ہے۔ سوالوں کا سامنا تو اسے دونوں صورتوں میں کرنا ہوگا لیکن ٹوپی نہیں رہنے پر اس کے ہاتھ بار بار سر کا طواف کرتے رہیں گے اور پھر اسے لوگوں کے مذاق اور تضحیک کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ٹوپی کے ذریعہ فوری طور پر اس نے درپیش مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا لیکن گومڑ کا احساس اس کے اندر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ ٹوپی کی آڑ میں اس نے گومڑ کو لوگوں سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ پھر بھی جب وہ باہر نکلتا تو اس کا یہ احساس شدید ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ہر آدمی اس کے سر کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے اور پتہ نہیں کب کون سا سوال کر ڈالے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ سوال ٹوپی کو چھوتے ہوئے گومڑ تک پہنچ جائے اور پھر ــــــ

یہاں تک آتے آتے اس کے انداز میں خاصی تبدیلی آجاتی اور وہ ہر غور کرتے ہوئے آدمی کی نگاہوں سے فوراً باہر نکل جانا چاہتا۔ دفتر میں، بازار میں، ہوٹل میں، دوستوں کے حلقے میں جب بھی وہ باتوں میں حصہ لیتا تو یہ ڈر ہر دم اس پر سوار رہتا کہ کہیں کوئی گومڑ کی بات نہ چھیڑ دے۔ اب جب کہ گومڑ کا احساس اس کے اندر جڑ پکڑ ہی چکا تھا تو وہ بھی اسے ایک راز کی طرح پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ گومڑ کو ایک ذلیل چیز کیوں سمجھے ہوئے تھا۔ یہ بات خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ البتہ جب اسے گومڑ کا احساس ہوا تو اس کے بچپن کے وہ بڑے میاں یاد آگئے جو اس کی گلی میں کھٹی میٹھی گولیاں بیچتے تھے۔ ان کی پیٹھ پر ایک بڑا سا کوبڑ نکلا ہوا تھا جس کے سبب وہ جھک کر چلتے۔ بچے ان کے کوبڑ پر بڑا ہنستے۔ بڑے میاں ان کی ہنسی کا برا نہیں مانتے کیوں کہ ان کی گولیاں خوب بکتیں اور وہ خوش خوش گلی سے واپس جاتے۔ شاید کوبڑ ان کا بزنس سکرٹ تھا۔ بڑے میاں کے کوبڑ پر ہنسنے والوں میں وہ بھی شامل رہا تھا لیکن جب اماں نے اسے سمجھایا کہ کسی کی کمزوری پر ہنسنے اور مذاق اڑانے سے اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں تو اس نے ہنسنے سے توبہ کر لی۔ اب بڑے میاں پر اسے ترس آنے لگا۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی ہنسنے سے منع کرتا۔ اس کے سبب گلی کے لڑکوں سے اس کی کئی بار مار پیٹ اور جھڑپ بھی ہوئی۔ دو ایک بار بڑے میاں نے بھی اسے جھگڑے سے منع کیا۔ وہ اپنے آپ پر ہنسنے ہی سے خوش تھے اور خوش نہیں رہتے تو کرتے بھی کیا، وہ تو خوش رہنے

کے لئے مجبور تھے ــــــ وہ بڑے میاں کی طرح مجبور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے تو کچھ لوگ ترس کھائیں گے اور یہ دونوں حالتیں کسی قیمت پر اسے منظور نہیں تھیں۔

حساس تو وہ قبل ہی سے بہت تھا لیکن گومڑ نے اس میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے گومڑ کو ہر حال میں دنیا سے چھپانا چاہتا تھا۔ جب لوگ اس سے ٹوپی کے بارے میں سوال کرتے تو وہ کبھی اس طریقے سے انھیں مطمئن رہنے کی کوشش کرتا کہ بات ٹوپی سے آگے نہیں بڑھے۔ اسے ہر دم یہ ڈر لگا رہتا کہ کہیں کوئی اس کے گومڑ تک نہ پہنچ جائے۔ اس کے سبب اس نے ہوٹلوں بازار اور دوستوں کے حلقے میں جانا بھی کم کر دیا، بس ضرورت کی حد تک ہی۔ خالی وقتوں میں کمرے میں بند گومڑ کے احساس سے تڑپتا رہتا۔

اس کا گومڑ بھی کچھ عجیب شے تھا۔ ہاتھوں پر یقین نہیں کرتے کے باوجود وہ انھیں ہاتھوں سے گومڑ کے تصدیق کرانے کی بے شمار کوشش کر چکا تھا۔ ہاتھوں کو بھی ضد تھی کہ جو وہ چاہتا، اس پر کبھی تیار نہیں ہوتے اور کرتے بھی وہی جو ان کا جی چاہتا۔ وہ سینکڑوں زاویے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کر اس بات کی بھرپور کوشش کر چکا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی اس کے گومڑ کو دیکھ لیں۔ اس کی آنکھیں اب کچھ اور ہی رنگ اختیار کر چکی تھیں، وہ اسے کسی طرح بھی اس کے گومڑ کو نہیں دکھا سکیں۔ اس کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ ہمیشہ اس کی آنکھوں، ہاتھ اور اس کے وجود پر حاوی آجاتا اور پھر وہی کچھ ہوتا جو اس کا احساس چاہتا۔ اکثر اس کا بھی جی چاہا کہ ہاتھوں اور آنکھوں کی طرح وہ بھی گومڑ پر یقین نہیں کرے۔ کچھ دیر وہ اس حالت میں رہا بھی لیکن احساس کی بے چینی اسے پھر گومڑ کی طرف واپس لے آئی۔

گومڑ نے اس کی شخصیت، مزاج اور صحت پر بھی خاصا اثر ڈالا۔ سماجی زندگی بہت محدود ہو گئی۔ اس نے کئی رنگوں اور ڈیزائنوں کی ٹوپیاں خرید لیں اور ان کی مناسبت سے لباس بنوا لئے۔ ٹوپی بس وہ اسی وقت اتارتا جب اپنے کمرے میں بند ہوتا اور کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند رہتے۔ کئی بار موسم کے لحاظ سے دوستوں نے اسے ٹوپی اتارنے کو کہا بھی لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گیا۔ اس پر ایک آدھ نے کہا کہ لگتا ہے تم اچانک گنجے ہو گئے ہو۔ تبھی تو ٹوپی نہیں اتارتے۔ اس نے فوراً جواب دیا۔

"ارے نہیں یار، ۔ اب عادت کچھ ایسی پڑ گئی ہے کہ ٹوپی اتارنے کے تصور سے ہی ننگے

ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے"۔

ایک دو بار بے تکلف دوستوں نے اس کی ٹوپی اچکنے کی کوشش بھی کی لیکن کمال ہوشیاری سے اپنے آپ کو بچا لے گیا۔ وہ خاصا محتاط رہنے لگا اور بے تکلف دوستوں سے دور ہی بھاگنے لگا۔ اگر کبھی ان کے بیچ پھنس بھی جاتا تو ان کی دسترس سے دور بیٹھتا۔

کافی عرصہ تک جب وہ اپنے گومڑ پر قابو نہیں پا سکا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب ڈاکٹر سے رجوع کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ اس نے دیر تک اپنے گومڑ کو چھپائے رکھا تھا اور بڑے بڑے جتن سے اس راز کی حفاظت کی تھی لیکن اب اس کا بوجھ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ اس نے ایک موٹی فیس دے کر ایک بڑے ڈاکٹر سے وقت طے کیا۔ ڈاکٹر نے تنہائی میں اسے وقت دیا، اس کے سر کا بغور معائنہ کیا۔ کئی طرح کی مشینوں سے تیز تیز روشنی میں اس کا جائزہ لیا اور اپنا فیصلہ یوں سنایا۔

"آپ کے سر میں کچھ بھی نہیں ہے"۔

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ حیرت زدہ ہو گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب۔؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ بالکل صحت مند ہیں"۔

"کمال کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب آپ بھی۔ میں گومڑ کی تکلیف سے مر رہا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں پھر کہوں گا کہ یہ محض آپ کا وہم ہے اور وہم کا میرے پاس کوئی علاج نہیں"۔

"ایک بار اور تو دیکھ لیجئے پلیز"۔

"دیکھئے، میرا وقت بہت قیمتی ہے اور میں فضول باتوں میں ۔ ۔ ۔ ۔!

ڈاکٹر کے ہاں سے وہ بہت مایوس لوٹا۔ ڈاکٹر کی بات کا اس کے پاس کیا علاج تھا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے پاس وہ علاج کے لئے گیا تھا، مذاق کرنے نہیں اور ڈاکٹر نے اس کے گومڑ کو وہم قرار دیا۔ ڈاکٹر کا رویہ اس پر بڑا اثر انداز ہوا۔ بھلا جس بات پر وہ اتنے عرصے سے یقین کرتا آ رہا تھا جس پہ اس کی ساری محنت لگی ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے محض ایک جملے سے کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے رویے کے خلاف اس نے داخلی طور پر جو احتجاج کیا تو اس کوشش میں بیمار پڑ گیا۔ کئی روز گھر پہ چپ چاپ در بند بند رہنے کے بعد جب وہ دفتر پہنچا تو اس کا کسی کام میں جی نہیں لگ لیکن کام تو بغیر جی کے بھی

کرتا تھا۔ جب اس کے کام میں کوئی چمک پیدا نہیں ہو سکی تو اس کے افسرِ اعلیٰ نے اسے بلایا۔
"کیوں مظہر۔۔۔ کچھ دنوں سے آپ کے کام میں وہ بات نہیں ہے"۔
"بات یہ ہے سر کہ کئی دنوں سے میں بیمار ہوں اور ـــــ"
"کیا بیمار ہیں آپ ـــــ؟"
وہ بوکھلا گیا۔ اس سوال کا تو اس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو وہ کوئی سوال کا جواب نہیں تھا۔
"یہ تو میں آپ کو نہیں بتا سکوں گا سر، بس بیمار بیمار سا محسوس کرتا ہوں"۔
"دیکھئے آپ بیمار وِمار کچھ نہیں ہیں۔ آپ اچھے خاصے دکھائی دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ آپ اس وہم کو دور کیجئے"۔
"سر، ڈاکٹر بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن میں کیسے مان لوں کہ یہ محض وہم ہے، مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ۔۔۔"
"کیا محسوس ہوتا ہے آپ کو ـــــ؟"
افسرِ اعلیٰ چیخ اٹھا۔
"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ـــــ نہیں سر، معاف کیجئے گا، میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکوں گا"۔
"آپ کو بتانا ہوگا، تبھی تو آپ کا علاج ہو سکتا ہے"۔
"میں کچھ جانتا ہی نہیں تو آپ کو کیا بتاؤں"۔
ٹھیک ہے، کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا، جنھیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ میرے ایک دوست مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ میں انھیں فون کر دیتا ہوں، آپ ان سے جا کر ملئے"۔
"سر، میں آپ کی مہربانیوں کا۔۔۔"
"کوئی بات نہیں، یہ تو میرا فرض ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دفتر میں سب سے اچھا کام آپ کا ہوتا ہے۔ میں بورڈ کے سامنے آپ کی تعریف کر چکا ہوں۔ اب اگر آپ اچھا رزلٹ نہیں دیں گے تو خود سوچئے، میری کتنی سبکی ہوگی"۔
افسرِ اعلیٰ کے احسانوں سے چور وہ ماہرِ نفسیات کے ہاں پہنچا جس کی افسرِ اعلیٰ سے فون پر

باتیں ہو چکی تھیں ۔ ماہر نفسیات نے گھنٹوں اس کا معائنہ کیا، کئی طرح سے سوالات کئے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر بولا؛

"ہاں صاحب، گومڑ تو آپ کے سر میں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں، اس کا علاج ہو جائے گا۔"

اس نے کچھ ورزشیں بتائیں، سر پر مالش کے لئے ایک روغن دیا اور سوچ و فکر سے توبہ کرنے کو کہا۔

ماہر نفسیات کے منہ سے گومڑ کی بات سن کر اسے بڑا سکون ہوا۔ وہ اس راز کو یوں تو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن ماہر نفسیات نے کچھ یوں ہمدردی سے گفتگو کی اور باتوں میں اسے اس طرح الجھایا کہ اس سے یہ راز اگلتے ہی بنی ۔

ماہر نفسیات کی باتوں پر اس نے پابندی سے عمل کرنا شروع کیا۔ ورزش اور مالش سے کچھ ہی دنوں کے اندر اسے محسوس ہوا کہ اس کا گومڑ اب بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اسے بہت خوشی ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ ٹوپی پھینک کر ننگے سر وہ کھلی فضا کا خوب لطف لے۔ پھر اسے خیال آیا کہ جب تک گومڑ اچھی طرح ٹھیک نہیں ہو جاتا، اسے ٹوپی نہیں اتارنی چاہئے۔ ماہر نفسیات کی ہدایت کے مطابق وہ پندرہ روز کے بعد پھر اس کے ہاں پہنچا۔ ماہر نفسیات نے ہر طرح اس کا معائنہ کر کے فیصلہ صادر کر دیا۔

"اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کے گومڑ کا اب نام و نشان بھی نہیں ہے"۔

اس روز اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس روز برسوں کا ایک ایسا بوجھ اس پر سے اتر گیا تھا جس سے وہ گھٹ گھٹ کر جی رہا تھا۔ وہ تو لگ بھگ ختم ہی ہو چکا تھا لیکن افسر اعلیٰ اور ماہر نفسیات کی مہربانی تھی اور خود اس کی ہمت کہ وہ پھر جی اٹھا تھا۔ خوب بن ٹھن کے اور تیار ہو کر اس نے باہر نکلنے کی ٹھانی ۔

سب سے پہلے وہ حجام کے ہاں گیا تاکہ بال قرینے سے بنوا لے۔ ٹوپی نے اس کے بالوں کی شکل ہی بگاڑ ڈالی تھی۔ گومڑ کے سبب وہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ حجام سے گومڑ کے نہیں ہونے کی تصدیق بھی ہو جاتی۔ حجام نے سکون کے ساتھ اس کے بال بنا دیئے اور گومڑ کا نام تک نہیں لیا۔ اس سے اس کے اندر مزید اعتماد پیدا ہوا۔ وہ ٹوپی کے بغیر باہر نکل سکتا تھا۔

خوش خوش، نئے کپڑے پہنے، ٹوپی کے بغیر وہ باہر نکلا تو فوراً ہی دفتر کے ایک ساتھی سے

ملاقات ہوگئی ۔

"بہت خوش دکھائی دے رہے ہو ۔ بات کیا ہے ۔ ؟"

"بس یونہی، بیمار تھا نا ۔ اچھا ہوگیا ۔ چلو کسی ریسٹورانٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

"واہ، یہ تو بہت اچھا پروگرام ہے، لیکن یہ تمھارے سر کو کیا ہوا —— ؟"

"کیا —— ؟؟"

وہ بوکھلا گیا ۔ کلیجا اچک کر حلق میں آتا محسوس ہوا ۔

"کچھ گومڑ سا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" □

محمد منشا یاد

۳۶۴-ای - سٹریٹ ۵۷
جی ۶/۴ ، اسلام آباد

رابطہ

ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں ۔

مجھے نہیں معلوم کہ اسے میری موجودگی کا احساس ہے یا نہیں البتہ میں اسے گھر کے مختلف گوشوں میں چلتے پھرتے اکثر دیکھتا رہتا ہوں ۔

یوں تو پتہ نہیں وہ کب سے یہاں ہے لیکن میرے اس سے یک طرفہ تعارف کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ۔ چند ماہ پہلے ایک روز میں نے اسے باورچی خانے کے فرش پر اپنے سے کئی گنا بڑا خوراک کا ایک دانہ کھینچتے ہوئے دیکھا اور اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر چونکا تھا ۔ پھر اس کے کچھ ساتھی آ گئے اور وہ خوراک کا یہ دانہ ان کے سپرد کر کے ایک طرف کو یوں چل دیا جیسے اسے اس سے اہم تر کسی کام یا مہم پر جانا ہو ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جب اس کا ٹھکانہ باورچی خانے ہی کے کہیں قریب واقع تھا اور وہاں خوراک کی وافر مقدار موجود تھی تو وہ کسی اور سمت کو کیوں نکل گیا ہے ۔ میری دلچسپی بڑھ گئی ۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کا عرض عبور کر کے صحن کی طرف روانہ ہو گیا مگر پھر لمبی لمبی گھاس میں نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔

دو ایک روز بعد میں نے اسے صحن کے ایک کونے میں درخت سے اترتے دیکھا یقیناً وہ ایک ایک ڈال پات کا چکر لگا آیا تھا مجھے تجسس ہوا کہ آخر اسے کس چیز کی تلاش تھی ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی لمبے سفر پر نکلا ، ایسا مہم جو ہو جو گہرے رازوں سے پردہ اٹھانا اور نئی نئی دنیائیں دریافت کرنا چاہتا ہو ۔

میری اس میں دلچسپی بڑھتی رہی اور میں بھی اس کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے دور دراز کے سفروں پر نکل جاتا ۔ دشوار گزار پہاڑوں ، تاریک اور گہرے غاروں ، گھنے جنگلوں ، ٹھاٹھیں مارتے دریاؤں اور بے کراں پھیلے سمندروں کی سیاحت کرتا ۔ میں نے کئی بار محض ایک

پتے یا تنکے پر سوار ہو کر سمندر عبور کیا۔ کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گرد و غبار کا شدید طوفان اٹھا جس کی لپیٹ میں آکر کسی پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا اور فضا کی لامحدود پہنائیوں سے گزرتا واپس زمین پر آگرتا۔ اس کی جون میں رہتے ہوئے اپنے اصلی وجود کا ادراک جہاں ایک مشکل امر تھا وہاں نہایت دلچسپ اور ولولہ انگیز تجربہ بھی تھا۔ میں اپنے گذشتہ وجود کو یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ میرے چھوٹے سے ذہن کی گرفت میں نہ آتا۔ میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھنا چاہتا لیکن مجھے چند انچوں سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں واپس اپنے قالب میں آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔

ایک دن، کئی دنوں بعد گہرے بادل گھر آئے، ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ بوندا باندی شروع ہوئی۔

میں صحن میں رکھی چیزوں کو سنبھال رہا تھا کہ اس کا خیال آیا کہیں ایسے موسم میں وہ باہر نہ گھوم رہا ہو۔ میں نے دوربین نکالی اور اسے تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر بعد وہ مجھے چھت کی منڈیر پر چلتا دکھائی دیا ـــــ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک بارش تیز ہو گئی اور غالباً اس نے کسی قریبی سوراخ میں پناہ لے لی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ جل تھل ایک ہو گیا۔ مجھے برابر اس کا خیال ستاتا رہا۔ کیا پتہ سوراخ میں پانی گھس آیا ہو ـــــ کیا پتہ وہ بھوکا پیاسا ہو۔ اسے سردی لگ رہی ہو یا خوف کے مارے کانپ رہا ہو۔

اگلی صبح دھوپ نکلی تو میں اس کی تلاش میں نکلا۔ ہر جگہ دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ بند پرنالے کے قریب جمع پانی پر نظر پڑی۔ میں نے اسے بڑھ کر پرنالے کے منہ سے تنکے ہٹائے تو رکا ہوا پانی تیزی سے چلنے لگا۔ اچانک میری اس پر نظر پڑی، وہ پانی میں بہتا ہوا تیزی سے پرنالے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے بچا لیا۔

میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا اسے بتاؤں کہ وہ کس قدر خطرے میں گھر گیا تھا اور میں نے اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے لیکن افسوس میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہم باہم کلام کر سکتے تھے نہ ایک دوسرے کے بارے میں جان سکتے تھے۔ اور حالانکہ میری اس کے بارے میں معلومات نسبتاً زیادہ ہیں لیکن پھر بھی اکثر میں کسی ویسے ہی دوسرے کو اس کی جگہ سمجھ لیتا ہوں اور اس وقت بھی جب وہ میرے سامنے ہوتا ہے میں وثوق سے نہیں

بتا سکتا کہ وہ وہی ہے۔ یقیناً وہ کبھی جب میری قمیض کے کالر پر چڑھتا یا میری گردن پر کاٹتا ہے نہیں جانتا ہوگا کہ یہ میں ہوں ــــ اس کا محسن ــــ جس نے متعدد بار اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے اور جس کی وجہ سے وہ زندہ اور محفوظ ہے۔ اسے تو یہ کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ اگر میں یہ گھر جس میں وہ رہتا ہے نہ بناتا تو شاید وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ یا اگر کہیں کسی دوسری جگہ پیدا ہو بھی جاتا وہ عین مین وہی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا۔ اور گرچہ اسے پتہ نہیں ہے کہ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد خوراک اسے مل جاتی ہے اور یہ کہاں سے آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی میری اپنی عنایات کی مرہون منت ہے۔ یہی نہیں میں چاہوں تو پھونک مار کر اسے ہلاک کر سکتا ہوں۔ چٹکی بجاتے میں اسے مسل سکتا اور ذرا سی بے احتیاطی سے چلوں تو اسے اس طرح کچل سکتا ہوں کہ اس کے وجود کا سراغ تک نہ ملے۔ کاش اسے یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں لیکن افسوس میں اسے کچل تو سکتا ہوں۔ پھونک مار کر ہلاک تو کر سکتا ہوں لیکن اپنی نوازشات کے صلے میں اس کے منہ سے شکریئے کے الفاظ نہیں سن سکتا۔ تاہم اس سے رابطہ کی خواہش کے پس پردہ محض شکریہ کے بول سننے کی خواہش نہیں کوئی اور جذبہ بھی ہے جس کا پوری طرح سے مجھے خود بھی علم نہیں ہے۔ بس ایک انجانا سا دکھ ہے کہ میں اور وہ ایک ہی جگہ، ایک ہی گھر میں بستے ہوئے محض ذہین اور جسامت کے فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہو سکتے۔ اپنی اپنی دنیا کی کہانی نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کئی بار سوچا ہے کہ اسے نظرانداز کر دوں، بھول جاؤں، اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوں لیکن پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مجھے اچانک نظر آ جاتا ہے۔ تکیئے کے غلاف پر ــــ رضائی یا کمبل پر رینگتا ہوا ــــ ردی کی ٹوکری کے کنارے ــــ کسی دیوار یا چھت پر چلتا ہوا۔ اور میں نئے سرے سے اس کا تعاقب شروع کر دیتا ہوں۔ یہ جاننے کے لئے کہ آخر اس کی زندگی اور تگ و دو کا راز کیا ہے اور وہ باورچی خانے یا سٹور روم کو چھوڑ کر جگہ جگہ کیا تلاش کرتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی میں اس کے بارے میں دلچسپ باتیں سوچتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں اور ہم جنسوں میں سب سے زیادہ ذہین ہو۔ اس نے ایک روز ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے دعویٰ کیا ہو کہ ان کے آس پاس ایک نہایت عظیم وجود یعنی میں موجود ہوں۔ اس کی باتیں سن کر ان سب نے اس کی ہنسی اڑائی ہو اور اسے خبطی اور گمراہ قرار دیا ہو۔ عین ممکن ہے ان سب نے مل کر اسے مجبور کیا ہو کہ وہ اپنے اس دعوے سے دستبردار ہو جائے ورنہ اسے زہر کا پیالہ

پیتا ہوگا، سوئی پر چڑھتا ہوگا۔ اور اب وہ اس دنیا کی پیمائش اور میری تلاش میں نکلا ہو ــــ میں سے گھر کے مختلف کمروں، کونوں، کھدڑوں اور دشوار گزار جگہوں پر گھومتے دیکھتا ہوں تو میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ اسے واقعی کسی خاص شئے کی تلاش ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس کی مدد کردوں اسے بتاؤں کہ وہ جسے گھر کی فضاؤں، کمروں، دیواروں، چھتوں، باورچی خانے کے ڈبوں سٹور روم کے صندوقوں، ڈرائنگ روم کے صوفوں، باغیچے کے پودوں اور گھر کی چار دیواری کی ایک ایک اینٹ میں تلاش کرتا پھر رہا ہے وہ میں ہوں۔ اور اس کے سامنے موجود ہوں لیکن افسوس وہ میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میری آواز نہیں سن سکتا۔ وہ تو یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہوگا کہ وہ میرے مقابلے میں کس قدر حقیر اور کمزور ہے اور اگر اسے ایسی کروڑوں زندگیاں دی جائیں اور وہ کبھی بھی ہمت نہ ہارے تب بھی وہ مجھے دریافت نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا بھی رہ رہ کر احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی بات اس حد تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس سے خواہش کے باوجود رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔ اس کے ذہن پر کوئی الہامی کیفیت پیدا نہیں کرسکتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اسے میری آہٹوں کی وجہ سے میری موجودگی کا شبہ یا احساس ہے اور وہ سچ مچ مجھے تلاش کر رہا ہے تو اس کی تلاش کا نتیجہ کس قدر دلچسپ ہوگا۔ وہ اس گھر کو جس کا اس نے کئی ہفتوں، مہینوں میں چکر لگایا ہے پوری کائنات سمجھتا ہوگا اور جب وہ ایک روز اپنے ان گنت ہم جنسوں کو جمع کرکے اعلان کرے گا کہ اگرچہ وہ اس عظیم وجود کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ان کے آس پاس میں کہیں موجود ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ وہ ہر جا موجود ہے تو وہ اس قدر مذاق اڑائیں گے اور وہ خود کس قدر غلطی پر ہوگا جب وہ انھیں بتا رہا ہوگا کہ اس نے تمام دنیا کھنگال ڈالی ہے۔ اس بے چارے کو کیا علم کہ اس نے جس کو پوری کائنات سمجھا ہے وہ محض ایک گھر ہے۔ اور ایسے بیسیوں گھر ایک گلی میں ہوتے ہیں اور ایسی سینکڑوں گلیاں ایک شہر میں اور ایسے ہزاروں شہر اس دنیا میں موجود ہیں۔ کاش وہ اندازہ کرسکتا کہ وہ زمین جس پر ایسے ہزاروں لاکھوں شہر موجود ہیں کائنات میں اس کی حیثیت باورچی خانے کے فرش پر گرے ہوئے چینی کے ایک دانے یا ایک بیضۂ مور کی سی ہے۔ لیکن افسوس وہ اندازہ نہیں لگا سکتا اور میں اسے بتا نہیں سکتا۔ کیوں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ہمارا آپس میں ایسا کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ آئندہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کا کوئی امکان ہے۔ □

شفق

چٹکی بھر زندگی

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔

نیم غنودہ ذہن نے گھر میں پراسرار سی ہلچل محسوس کی، تیز تیز چلنے کی آوازیں، پرتشویش انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں، مگر حجم کم ہونے کی وجہ سے باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، کبھی کبھی آواز تیز ہو جاتی، کتنی دیر ہو گئی پرانا کپڑا مانگے ہوئے تمھیں تو وقت پر کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ خدا غارت کرے بجلی کو بھی ابھی ہی فیل ہونا تھا، لالٹین تیز کرو، ادھر روشنی دکھاؤ۔

میں کچھ دیر تک منتظر رہا کہ کوئی میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر بتائے گا کہ .... مگر دیر ہو گئی تو میں نے کروٹ بدل لی، ممکن ہے نیند خراب ہونے کے خیال سے کوئی میری طرف نہیں آیا، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا، مگر نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتے ذہن میں تشویش اور ناامیدی کی لہر ضرور تھی۔ خوشی کی بات ہوتی تو کیا نیند کی پرواہ کی جاتی؟

صبح جب میں غسل خانے کی طرف جا رہا تھا، ماں اور بہنوں کی نظروں میں تاسف اور ہمدردی دیکھ کر جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ حالانکہ میں نے ہونے والے حادثے کی پہلے ہی توقع کر کے اپنا دل مضبوط کر لیا تھا مگر بے چینی کی ایک لہر نے سر سے پاؤں تک اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ مٹھیوں میں کلیجہ مسل رہا تھا۔

غسل کے دوران ٹھنڈے پانی نے جذبات کو سرد نہیں کیا بلکہ جذبات دھل کر اور صاف ہو گئے، کیا ساری محرومیاں اور ناکامیاں میرا ہی مقدر ہیں۔ کیا میں نئے عہد کا پیغمبر ہوں اور خدا نے اپنی آزمائشوں کے لئے میرا انتخاب کر لیا ہے؟ کیا دیا ہے مجھے اس زندگی نے، میں بچپن سے ہر خواہش کا گلا گھونٹتا رہا اپنے ارمانوں کو اپنے ہاتھوں کفن پہنا کر مفلسی کی قبر میں دفناتا رہا۔

ملازمت ملی تو شادی ہو گئی اور گنتی کے کھٹے میٹھے دن بیتے کہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ سنئے جی، بیوی نے سویٹر بنتے ہوئے کہا۔ خدا نے جو دیا اس کا کیا شکوہ، مگر زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے ہمیں ابھی سے

بچی کے لئے کچھ نہ کچھ ....
میں نے طویل سانس لے کر اپنی پھول سی بچی کو دیکھا۔ پیار سے اس کے گالوں پر انگلیاں پھیریں ۔ میری بیٹی ، آنے دنوں کی جدوجہد کے بعد خدا نے اس قابل بنایا تھا کہ اپنی تشنہ آرزوں اور تمناؤں میں رنگ آمیزی کرتا مگر تم .... تم پر ابھی سے فکر کا سایہ پڑ گیا، تمھاری ماں کبھی غلط نہیں سوچتی ۔ میری نظروں میں کتنے چہرے ہیں جو بیٹی کی شادی کے لئے پریشان ہیں ، کس کس سے رشتے کی بھیک نہیں مانگی جاتی ، کیا کیا جتن نہیں کئے جاتے ، اگر کہیں بات چلتی بھی ہے تو لڑکی کو ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے قصاب جانور دیکھتا ہے ، خدا نے عجیب قانون بنایا ہے ، وہ بیٹی جو ماں سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اسے دوسرے کو منتوں ، خوشامدوں اور قربانیوں کے بعد سونپ دیا جاتا ہے اور تماشا یہ کہ دوسرا مفت لینے کو تیار نہیں ، یعنی لڑکی دنیا کی سب سے حقیر شئے ہے ۔
آپ کیا سوچنے لگے ، بیوی نے ٹوکا ، میری بات پر دھیان دیجئے ورنہ پچھتانا پڑے گا ۔
جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو ماں ہونٹوں پر بچی ہوئی مسکراہٹ سجائے کہہ رہی تھی ۔
بالکل گڑیا جیسی ہے تمھاری یہ بیٹی ، بہو کو دیکھو بیٹی کا سنتے ہی رونے لگی ، ماں کے لئے سب اولاد برابر ہوتی ہے خدا نے اس بار بھی بیٹا نہ دیا تو اس میں کوئی مصلحت ہوگی ۔
میرا جی چاہا میں اپنے بال مٹھیوں میں جکڑلوں ، چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھالوں ، نہیں چاہئے مجھے یہ بیٹی ، نہیں چاہئے خدا کی مصلحت ، مجھے کسی کی ضرورت نہیں ، مجھ میں تین عفریت پہلے ہی لپٹے ہوئے ہیں نوچ نوچ کر میرا گوشت کھا رہے ہیں ، خون پی رہے ہیں ، اب میں انھیں نہیں کھلا سکتا ، نہیں پلا سکتا ، واپس لے لے خدا اپنی امانت میں اس کا اہل نہیں .... میں .... میں نے بڑی مشکل سے اپنی وحشت پر قابو پایا ، میرے ہاتھ بے اختیار تولیہ سے بال رگڑے جا رہے تھے ۔
ماں میری اضطراری کیفیت سے میرے دل کا حال سمجھ گئی تھی اس نے بڑی نرمی سے سمجھایا ۔
بیٹے ، تم بے وجہ پریشان ہو ، اس گھر کی بیٹیاں بڑی آسانی سے اٹھ جاتی ہیں ، سوچو تو تمھاری چار بہنیں ہیں اور تمھارے والد کی اوقات کیا تھی تم تو خدا کے فضل سے بہت اچھے ہو ، جس خدا نے تمھیں اس مقام پر پہنچایا ہے وہی تمھاری ساری مشکلات حل کر دے گا ۔
میں نے ماں کی بات کی تردید نہیں کی ، میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی ، میں ماں کو اپنی دلی کیفیات نہیں بتا سکتا تھا ۔ اسے وہ پریشانیاں یاد نہیں دلا سکتا تھا جو بہنوں کی شادی کے وقت پیش

آ ئی تھیں۔ میں ایسا جواری تھا جو آخری بازی بھی ہار گیا، ان چار بیٹیوں کے بعد مزید آزمائش کی گنجائش نہیں، اگر پانچویں بھی بیٹی ہو گئی تو ؟ اسی انتظار نے تو یہ دن دکھایا اور آج یہ طے ہو گیا کہ میرے بیٹا نہ ہوگا، کوئی میرا سہارا نہ ہوگا، جب بیٹیاں اپنے گھر چلی جائیں گی تو ہم دونوں بوڑھے بوڑھیا دن رات دروازہ تکیں گے، کوئی آہٹ، کوئی آواز کوئی سایہ ؟ کوئی نہیں آئے گا بند کر دو یہ کواڑ کہ یہاں آنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔

آپ بے وجہ پریشان ہیں، پروفیسر شمیم نے سمجھایا، کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بیٹا ہو جاتا تو آپ بوڑھے بوڑھیا دروازہ نہ تکتے ؟

میں اپنے والدین کا سعادت مند بیٹا رہا ہوں۔

یہ کوئی دلیل نہیں، آخر ولی کے گھر میں شیطان کی کہاوت کیوں مشہور ہوئی، پھر کیا آپ نے اپنے بعد کی جنریشن پر غور کیا ہے، میں قدیم ہوں اور آپ قدیم و جدید کا اشتراک ہیں اور یہ صرف جدید، ان جدیدیوں کی نظروں میں پرانی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں پھر آپ کا بیٹا تو جدید ترین ہوتا، میں تو تیسری پیڑھی سے ہی مایوس ہوں اور آپ چوتھی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔

کوئی بات دل کی گہرائیوں میں اتر کر زخم کا مرہم نہیں بنتی، میں کیسے یقین کر لوں کہ چوتھی پیڑھی اپنے باپ کے خون کے اثرات سے قطعی انحراف کرے گی، یہ ساری باتیں دل کو بہلانے اور اپنی محرومیوں کو چھپانے کے لئے ہیں۔

دفتر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ وہاں ذہن کا بوجھ کچھ کم ہوگا دفتر کے لئے روانہ ہوا تو راستے میں ساجد سے ملاقات ہو گئی۔

مبارک ہو بھئی، سنا ہے تمہیں پروموشن ملا ہے، یار اب تو اس پھٹیچر سائیکل کا پیچھا چھوڑ کر اسکوٹر لے لو، سیکشن آفیسر کو زیب نہیں دیتی یہ سائیکل۔ اسکوٹر ـــــ میں زہر خند سے مسکرایا جب سائیکل سے کام چل ہی رہا ہے تو لے لیں گے اسکوٹر بھی جلدی کیا ہے، تم سناؤ ہفتوں بعد نظر آئے ہو کہاں رہے۔

ساجد کے چہرے پر بدلی سی چھا گئی، بہن کے رشتے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں، ایک جگہ بات چل رہی ہے لڑکا اچھا ہے مگر صرف کیش پچاس ہزار مانگ رہے ہیں جہیز کے علاوہ اور سونے کا بھاؤ جانتے ہو چار ہزار سے اوپر چلا گیا ہے۔

جب ابھی لڑکے کی قیمت پچاس ہزار ہو گئی ہے تو جب صادقہ جوان ہوگی تو ؟ میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا میرے بال کھچڑی ہو گئے ہیں آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور ایک شخص بے رحمانہ

لاپرواہی سے کہہ رہا ہے۔ سنئے جناب کم سے کم ایک لاکھ نقد اور جہیز کے جو سامان ہیں رنگین ٹی وی، فریج، اسکوٹر، صوفے اور کم سے کم پندرہ تولہ سونا۔

اچھا ساجد دفتر کا وقت ہو رہا ہے پھر ملاقات ہوگی، خدا تمھارے مسائل حل کرے۔

سائیکل واقعی بہت پرانی اور تکلیف دہ ہوگئی ہے، مگر میں ساجد کو کیسے بتاتا کہ دو بار اسکوٹر کے لئے روپیہ جمع کیا مگر عین وقت پر خیال آیا اسکوٹر صرف میرے کام آئے گا اگر اسے فکسڈ کر دوں تو . . . .

دفتر میں بھی تفکرات سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ کھلی ہوئی فائل کے صفحات پر چہرے ناچنے لگتے۔

سنتے ہیں جی۔ میرا دل بہت ڈر رہا ہے اگر اس بار بھی بیٹی ہوگئی تو ؟

بیٹا ہوگا تو ساس بن کر ایک بے قصور سے اپنا بدلہ چکاؤں گی۔

آپ تو ہر بات کا مذاق بنا دیتے ہیں، وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ آپ کو کیا پتہ دوسروں کے سامنے کتنے احساس کمتری میں مبتلا رہتی ہوں، نہ جانے خدا ہمیں کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔

گناہ تم نے کیا ہوگا میں تو معصوم فرشتہ ہوں۔

ہونہہ بڑے آئے معصوم فرشتے، جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔

سنو اس بار چاہے بیٹا ہو یا بیٹی میں چار سے زیادہ کا متحمل نہ ہو سکوں گا اور یہ نمبر چار بھی کیا توازن نہ بگاڑ دے گا۔ صادقہ اور ثمینہ ایک ساتھ سو جاتی ہیں اور ہم تم شابی کے ساتھ، اب یہ سکھ بھی چھن جائے گا۔

بیوی کا چہرہ ذرا سا گلابی ہوا تھا۔

فائل میں کوئی خاص بات ہے راشد صاحب، بہت دیر سے پڑھ رہے ہیں، کسی کی آواز سن کر میں چونک پڑا، تصویر غائب ہوگئی . . . نہیں تو . . . . میں تو بس یونہی . . . . کچھ سوچنے لگا تھا۔

میں نے دستخط کرکے فائل بند کر دی۔

گھڑی پر نظر گئی تو خیال آیا بچیاں اسکول سے واپس آگئی ہوں گی، مگر آج اسکول جاتے وقت کسی نے مجھ سے پیسہ نہیں مانگا تھا صرف کمرے کے سامنے سے کئی بار گزری تھیں ـــــ میں نے جلدی جلدی کام ختم کیا، گھر پہنچا تو بچیاں اسکول سے آچکی تھیں مگر کوئی میرے پاس نہیں آیا حالانکہ ان کا یہ کا معمول تھا وہ مجھے اسکول کی باتیں بتاتی تھیں، آج کس نے شرارت کی، کس کی پٹائی ہوئی، کس نے قلم چرایا، کس نے ہوم ورک نہیں کیا تھا سسٹر نے کیا کہا وغیرہ، میں نے ثمینہ کو پکارا تو وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آئی۔

پاپا، آپ ناراض ہیں ؟

میں دھک سے ہوگیا۔ کیوں گڑیا میں کیوں ناراض ہونے لگا۔

ممی کو بیٹی جو ہوئی ہے، سچ پاپا ہمیں بھی بہت ارمان تھا کہ ہمارے ایک بھائی ہوتا، ہم سے لڑتا جھگڑتا، کاپی کتاب پھاڑتا کھلونے توڑتا اور . . . . میں نے کھینچ کر بیٹی کو سینے سے لگالیا، میرا دل بھرایا جارہا تھا ان معصوم بچیوں کو بھی میری محرومی کا احساس ہوگیا۔ انھیں ایک بھائی ملنا ہی چاہئے مگر کیسے ؟ چار سے زیادہ کا بوجھ . . . . چار سے زیادہ . . . کتنا اچھا ہوتا نوزائیدہ مرجاتی . . . . اگر نوزائیدہ مرجاتی تو . . . . میں نے ثمینہ کو اپنے سے الگ کیا اس کا گال تھپتھپایا، پیسہ دیا اور وہ خوش خوش باہر بھاگ گئی تو میں نے سوچا، اگر نوزائیدہ مرجاتی تو . . . مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا، مرنے کا افسوس تو پالتو جانور کا بھی ہوتا ہے مگر وہ ابھی پالتو کہاں ہے ؟ ابھی تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے، گنتی کم ہوجاتی تو ایک اور موقع مل جاتا شاید اب کی بار . . . .

مگر یہ گناہ ہوگا ـــــ ضمیر نے ملامت کیا تو میں نے اسے جھڑک دیا، اس سے بڑا گناہ یہ ہوگا کہ میں اسے بہتر زندگی اور زندگی کی آسائشیں نہ دے سکوں گا اور میں خود بھی بوجھ تلے دبتا چلا جاؤں گا، نہ جانے کتنی بار ہم دونوں کو خودکشیاں کرنی ہوگی ایک زندگی دوسرا قتل ہے اور ایک قتل دوسری زندگی ہوگی مگر کیا بیوی اس قتل کی اجازت دے گی ؟ نہیں کبھی نہیں اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ قاتل سمجھ کر ساری زندگی مجھ سے نفرت کرے گی پھر . . . پھر . . .

دفعتاً ماں کا ایک جملہ یاد آیا جو بہت غصہ ہونے پر کہتی تھی، اگر میں جانتی تو پیدا ہوتے ہی چٹکی بھر نمک چٹا دیتی۔

چٹکی بھر نمک ـــــ میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، میں نے نمک دان ہاتھ میں اٹھالیا مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے اتنے بڑے رفیق ثابت ہوگے کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ میں نے تھوڑا سا نمک اپنی جیب میں ڈال لیا۔

ماں نے بچہ دیکھنے کو کہا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ بیوی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ بیوی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ ہلدی کی طرح ہورہا تھا مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

پگلی تم رو رہی ہو، میں نے پلنگ پر بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھے۔ اتنا غم کروگی تو تمھاری صحت خراب ہوجائے گی، اب قدرت کے کام میں ہمارا کیا دخل ـــــ میں نے سمجھایا تو وہ میرے شانے پر سر

رکھ کر سسکنے لگی۔

کیا دنیا کے سب سے بڑے گنہگار ہم ہی ہیں کہ بیٹے کی دولت سے محروم رہ گئے۔ میں نے خدا سے کتنی دعا مانگی تھی، منتیں مانی تھیں مگر۔ ۔ ۔ وہ جانے کیا کیا کہتی رہی میرا ذہن کہیں اور تھا، میں نے بچے پر پڑا ہوا تولیہ ہٹا دیا۔ گلابی رنگ کا پھول آنکھیں بند کئے اپنے اوپر گزرنے والے حادثے سے بے خبر سو رہا تھا، میں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی بائیں ہاتھ کی انگلیاں جیب میں نمک پر رکھ دیں اور میرا داہنا ہاتھ بچے کے بدن پر پھرنے لگا۔ بچے کے کومل کومل لمس نے میری رگوں میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میرے اندر بادل گرج رہے تھے بجلیاں چمک رہی تھیں، میں نے بیوی کی طرف دیکھا وہ میری طرف پیٹھ کئے آنسو پونچھ رہی تھی، میں نے احتیاط سے بایاں ہاتھ جیب سے نکالا اور بچے پر اس طرح جھک گیا کہ بیوی میری کارروائی نہ دیکھ سکے۔

ابھی میری چٹکی بچے کے ہونٹوں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دنیا کی آلودگی سے پاک جیسے دو کنول کھل گئے ہوں، مجھے لگا وہ معصوم اور پاکیزہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

پاپا میرا قصور کیا ہے؟

اور نہ جانے کیا ہوا کہ میں بچے کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

میری بیٹی، میری جان!! □

انور خان

عمارت

اس عمارت میں میں چیک بھنانے کے لئے گیا تھا۔ چیک ڈاک سے آیا تھا ___ کس نے بھیجا تھا پتہ نہیں کسی کے دستخط اس پر ضرور تھے مگر میں اس شخص سے واقف نہ تھا ___ چیک کافی بڑی رقم کا تھا۔ ذہن میں بہت سارے خیال آئے ___ کہیں یہ مذاق تو نہیں غلطی سے تو نہیں آگیا۔ لیکن اگر واقعی کسی نے بھیجا ہو؟ مجھے بھلا کوئی چیک کیوں بھیجنے لگا۔ اس چیک کے بھننے کا مطلب تھا میرے سارے دلدر دور ہو جاتے۔ میں اور میرے بچے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیم تاریک مکانوں اور اداس تنگ گلیوں کے جال سے نکل آتے۔ خوش نما، آرام دہ، کشادہ مکان اور صاف ستھرے ماحول میں رہنے کا لطف! زندگی کی آسائشیں!

اگلے روز ٹھیک وقت پر میں اس پتے پر پہنچ گیا جہاں پہنچنے کی اس چیک سے منسلک خط میں ہدایت کی گئی تھی۔ یہ علاقہ ابھی نیا ڈیولپ ہوا تھا۔ چند سال قبل سمندر کا کنارہ پاٹ کر بنایا گیا تھا۔ خوبصورت، اونچی اونچی مستطیل نما اور دائرہ دی عمارتوں کا ایک گھنا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس علاقے میں بڑے بڑے پنج ستارہ ہوٹل تھے۔ ہوائی کمپنیوں، بڑے بڑے صنعت کاروں، اخباروں کے دفاتر تھے۔ اسمبلی اور کارپوریشن کی عمارتیں تھیں۔ اس عمارت کو ڈھونڈنے میں البتہ مجھے دقت نہ ہوئی۔ وہ عمارت تمام بلڈنگوں کے درمیان دور سے ہی نظر آرہی تھی۔ باہر کھڑے کھڑے میں نے اس عمارت کو نہارا۔ عمارت کا اوپری حصہ بادلوں نے گھیر لیا تھا۔ بادل چلتے تو عمارت بھی سرکتی ہوئی محسوس ہوتی اور سر چکرانے لگتا۔ ٹھوس سیمنٹ کانکریٹ کی چالیس منزلہ عمارت۔ مگر جانے کیوں ایسا خیال ہوا کہ کہیں یہ میرا واہمہ تو نہیں۔ چیک نے میرے اندر خاصا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میں نے جیب سے چیک نکالا اس پر کندہ اپنا نام کئی بار پڑھا۔ اور ایک نئی امنگ کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ اندر کافی بھیڑ تھی۔ پانچ لفٹیں تھیں اور ہر لفٹ کے باہر دس پندرہ

آدمی قطار لگائے اپنی باری کے منتظر تھے۔ مجھے اٹھارویں منزل پر پہنچنا تھا۔ اور اسی حساب سے میں ایک لفٹ کے باہر لگی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے سارے لوگ تھے مگر ایسے خاموشی جیسے کسی معبد میں عبادت کی غرض سے آئے ہوں۔ ہر شخص کی جیب میں ایک چیک ہو گا۔ میں نے سوچا۔

مطلوبہ کمرے میں داخل ہونے پر مجھے ایک بڑا سا کاؤنٹر نظر آیا۔ اس میں ایک ہی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے پیچھے ایک معمر آدمی جس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے چیک وصول کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ کپڑے سفید کلف لگے جو اس کی خوش حالی کے غماز تھے۔ کالر میں لگی سفید بو اس کے وقار میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایک ہلکے سے شائستہ تبسم کے ساتھ اس نے مجھ سے چیک لیا۔ اور اس کی پشت پر کچھ لکھ کر ایک ٹوکن میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں قریب رکھے صوفے میں دھنس گیا۔ پاس بیٹھے آدمی نے کہا کہ چیک پاس ہونے پر رقم بھی یہی شخص دے گا۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید کیشیر نے میرا نمبر پکارا تھا۔ اور میں تیزی سے کاؤنٹر پر لپکا تھا یا شاید ابھی میں اپنی باری کا منتظر تھا اور کیشیر محض ٹوکن تقسیم کر رہا تھا کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں اور بڑھتی چلی گئیں۔ کیشیر نے تشویش زدہ نگاہوں سے دروازے کو تاکا اور کاؤنٹر بند کر دیا۔

کمرے میں موجود تمام لوگ باہر متوجہ ہوئے۔ ان کے ساتھ میں بھی باہر آیا۔ باہر زینوں پر بڑا شور تھا۔ میں نے راہ داری کے سرے سے جو زینے سے قدرے فاصلے پر تھا نیچے جھانکا۔ تمام زینوں پر لوگ دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی نیچے اتر رہا تھا۔ کوئی اوپر بھاگ رہا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے لوگوں سے پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس قدر بدحواس تھے کہ کسی کو جواب دینے کی فرصت نہ تھی۔ کسی نے کہا بھی تو بس اتنا کہ دوڑو کچھ ہو گیا ہے۔ شور سے سر پھٹنے لگا۔ میں پھر کمرے میں واپس ہوا۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہاں نہ کیشیر تھا نہ پبلک۔ الٹے پیر واپس ہوا۔ زینوں پر وہی غدر مچا ہوا تھا۔ یہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ کسی صورت باہر نکلنا چاہیے۔ مجھے لفٹ کا خیال آیا۔ میں نے باری باری لفٹوں کے بٹن دبائے مگر بے سود۔ نہ کہیں روشنی جلی۔ نہ لفٹ کی آواز۔ حالانکہ دروازے سے کان لگا کر ارتعاشات محسوس کرنے کی میں نے کئی بار کوشش کی۔ اس کا مطلب تھا کہ اترنے کی بس ایک راہ تھی۔ میں زینے کے قریب پہنچا۔ ایک بار نیچے جاتے والوں کا ریلا آیا تو خدا کا نام لے کر میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ کئی منزلے تو میں آرام سے اتر گیا مگر پھر ایک موڑ پہ میں اوپر چڑھتے والوں میں پھنس گیا اور وہیں آ پہنچا جہاں سے شروع

ہوا تھا۔ کئی بار میں نے اترنے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ یہی حشر ہوا۔ بلکہ ایک بار تو میں چوبیسویں منزل پر جا پہنچا۔ ہر شخص بدحواس تھا۔ شور ایسا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میری طرح اور لوگ بھی پھنسے ہوئے تھے۔ کئی چہرے جنھیں میں اترتے ہوئے دیکھ چکا تھا بعد میں زینے چڑھتے نظر آئے۔ بڑی دیر بعد ایک منزل پر مجھے بھیڑ سے الگ ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ کپڑوں کی وہ درگت بنی تھی کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اور پسینے سے چپچپا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا۔ اب میں سولھویں منزل پر تھا۔ کچھ دیر سانسیں درست کرنے کے بعد ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لئے میں زینے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک عمارت کی ساری بتیاں گل ہوگئیں اور اندھیرا چھا گیا ــــ میں ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ ایک لحظے کو تو ساری عمارت میں سناٹا پھیل گیا۔ مگر دوسرے لمحے مغلظات کا وہ طوفان برپا ہوا کہ دماغ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ کوئی دب گیا تھا۔ کوئی کچل گیا تھا۔ کچھ دیر بعد شور کم ہوا تو میں نے اندھیرے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے والوں کی تعداد میں یقیناً کمی ہوئی تھی۔ موقع غنیمت جان کر میں سیڑھیوں پر آیا اور تیزی سے زینے اترنے لگا۔ کئی لوگوں سے ٹکرایا۔ کسی کا پیر کچلا ــــ کسی نے دھکا دیا۔ کہیں پیر رپٹا۔ کسی نے گالیاں بکیں مگر میں بارہویں منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ــــ یہ منزل بھی میں پار کر لیتا مگر تب ہی روشنی آئی اور لوگوں نے چین کی سانس لی۔ نعرۂ حسرت کے ساتھ وہ ایک بار پھر زینوں پر پل پڑے۔ ہنگامہ اب پہلے سے بڑھ گیا اور لوگوں کا جوش و خروش بھی ــــ اوپر چڑھنے والے ٹھیلتے ہوئے مجھے ایک زینہ اوپر لے آئے۔ اگر میں پوری طاقت سے خود کو نہ سنبھالتا تو بری طرح کچل جاتا۔

اب پھر وہی جدوجہد تھی اور میں ــــ کپڑے تار تار ہو چکے تھے ــــ شکلیں پہچانی نہ جاتی تھیں۔ مگر اور چارہ بھی کیا تھا؟ بڑی دیر بعد میں اس بھیڑ سے الگ ہوا تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اب میں ساتویں منزل پر تھا ــــ بس سات منزلیں اور سانسیں بحال ہوئے میں پھر اٹھا اور زینے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں ایک سیڑھی اتر نہ پایا تھا کہ ایک بار پھر روشنیاں گل ہوگئیں اور گالم گفتار کا سلسلہ شروع ہوگیا ــــ میں وہی سیڑھیوں پر کھڑا رہا ــــ دیر تک بتی نہ جلی۔ اب میری قوت جواب دینے لگی تھی ــــ پیر بری طرح درد کر رہے تھے اور رگ رگ میں دکھن سرایت کر گئی تھی۔ میں وہیں زینے پر بیٹھ گیا۔ اس اندھیرے میں بیٹھے ہوئے ایسا لگا جیسے میں سدا سے یہیں ہوں اور ہمیشہ یہیں رہوں گا۔ یہ اونچی عمارت اندھیرا، یہ سیڑھیاں ان سے مجھے کبھی رہائی ملنے کی نہیں۔ نہ جانے وہ کون سا منحوس لمحہ تھا جب وہ چیک مجھے ملا۔ اداسی

سے اس شب خونی لمحے میں مجھے لگا کہ بہر حال مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ وہ ابخانی قوت جس نے مجھے چیک بھجوایا اسے معلوم تھا کہ میں اور یہ اتنے سارے لوگ یہاں آئیں گے اور اس عمارت کا لقمہ بنیں گے ــــ کوئی ہم سے اس طرح کھیل رہا ہے جس طرح بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے ــــ لیکن اس نے یہی طریقہ کیوں منتخب کیا۔ اذیت کے اور بھی تو طریقے ہیں ــــ اس عمارت میں، اس طرح اندھیرے میں، سیڑھیوں پہ ــــ پتہ نہیں کن لوگوں نے یہ اونچی عمارتیں بنائیں۔ ان اونچی عمارتوں کی آخر ضرورت ہی کیا تھی جب یہ عمارتیں نہ تھیں کیا لوگ خوش نہ تھے۔ پتہ نہیں یہ عمارت ۔۔تمی ہے بھی یا نہیں۔ اس اندھیرے میں یہاں بیٹھے بیٹھے کبھی سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے ــــ ایک بھیانک خواب۔ ابھی میری آنکھ کھلے گی اور میں اپنے آرام دہ بستر پر ہوں گا۔ باہر اجالا ہوگا ــــ اور دھوپ ــــ دریچے سے نیلا آسمان نظر آئے گا ــــ نیلا آسمان! شہر بھی کس قدر فضول چیز معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے خوامخواہ ہی سروں پر ٹانک رکھا ہے ــــ میرا دل بری طرح آسمان دیکھنے کو چاہنے لگا۔

گھٹنوں میں سر دئے نہ جانے میں کب تک اسی طرح پڑا رہتا مگر تبھی بتیاں جلیں۔ اب لوگ تھک چکے تھے۔ شور بھی کم تھا ــــ میں بھی اٹھا کہ پیچھے سے دباؤ شروع ہو گیا تھا اور دھیمے دھیمے سیڑھیاں طے کرنے لگا ــــ نیچے، اوپر ــــ اوپر نیچے۔ زینے، پرچھائیاں، اندھیرا۔ روشنیاں، شور، ہنگامہ ــــ نیچے ــــ اوپر ــــ اوپر، نیچے ــــ اب جسم میں طاقت نہ تھی اور ذہن قریب قریب ماؤف ہو چلا تھا۔ مگر تب ہی ایک عجیب بات ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ میں بالکل نچلی سیڑھی پر ہوں ــــ دروازہ سامنے ہے ــــ اور کھلا ہے ــــ اجالے کا ایک چوکور ٹکڑا راہداری سے ہم کو زینے کے قریب فرش تک پہنچا رہا ہے ــــ نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ سراب ــــ میں اب بھی اسی سچویشن میں ہوں ــــ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہیں بیٹھ گیا ــــ ایک بار وہی اندھیرا تھا اور شور ــــ چیخ و پکار کی آوازیں ــــ مجھے ڈھارس ہوئی۔ کچھ دیر تک میں یہ آوازیں سنتا رہا ــــ پھر آنکھیں کھولیں ــــ دھوپ کا چوکور ٹکڑا پھر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا ــــ میں نے ایک بار پھر کھلے دروازے کو دیکھا ــــ باہر اکا دکا آدمی گذرتا نظر آرہا تھا ــــ کبھی کوئی موٹر گزرتی نظر آجاتی ــــ تو کیا واقعی میں آزاد ہوں؟ اور یہ ڈراؤنی عمارت! میں نے پھر سیڑھیوں سے ابھرتی آوازوں کو سنا۔ آوازیں مجھے اوپر کھینچنے لگیں ــــ چند قدم اور میں باہر جا سکتا ہوں ــــ مگر یہ چند قدم! یہ عمارت

کسی دیوزاد مقناطیس کی طرح مجھے دبوچے ہوئے تھی۔ پیر شل ہوکر سن ہو چکے تھے۔ کسی معمول کی طرح میں اٹھا اور واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر تب ہی میری نظر فرش کے اس حصے پر پڑی جو اجالے سے چمک رہا تھا ـــــ باہر نیلا آسمان پھیلا ہوگا ـــــ میں نے سوچا ـــــ نیلا آسمان ـــــ میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ کیا واقعی باہر نیلا آسمان پھیلا ہوگا یا یہ بھی میرا واہمہ ہے ـــــ میں یہاں سیڑھیوں پر اکیلا کیوں ہوں ـــــ میرے ساتھ کوئی اور کیوں نہیں یہاں تک آیا ـــــ شاید آیا ہوگا لیکن واپس چلا گیا ہوگا ـــــ کیوں ـــــ اس لئے کہ اس کے دل میں نیلا آسمان دیکھنے کی خواہش نہ ہوگی۔ وہ باہر آنے سے خوف زدہ ہوگا۔ اس عمارت نے، شور نے، اندھیرے نے، اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہوں گی ـــــ کہیں میں نیلا آسمان دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دھیمے دھیمے دروازے کی طرف بڑھا ـــــ دروازہ کھلا تھا اور آہستہ آہستہ چلتا میں اس عمارت سے باہر آگیا۔

واقعی دور تک نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا ـــــ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھیپھڑوں کو ہوا سے بھر لیا ـــــ باہر کس قدر سکون تھا۔ زندگی معمول پر تھی ـــــ لوگ حسب معمول جی رہے تھے۔ دن کا حیات بخش اجالا ہر شئے کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ اس اونچی عمارت کے باہر کھڑے عمارت سے برآمد ہوتی چیخوں، کراہوں کو سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس قدر شور کیوں برپا ہے۔

میں بھی حیرت سے اس عمارت کو دیکھنے لگا۔ □

علی امام نقوی

معرفت مکتبہ جامعہ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی - ۴۰۰۰۰۳

بازگشت

آگ کے شعلوں سے بستی روشن ہوئی تو اس نے معنی خیز انداز میں اپنے جوان بیٹوں کے چہروں پر موجود پریشانیوں کے سائے کچھ بڑھتے ہوئے دیکھے۔ کنکھیوں سے بچوں کے باپ ہزارہ سنگھ کے چہرے پر نظر ڈالی جو کسی گہرے تفکر میں ڈوبا ہوا تھا، دوسرے ہی پل اس کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہو کر سولہ برس کی بیٹی کے چہرے کو اپنے حصار میں لے آیا۔ وہ مکان کے سب سے پوتر حصے میں گرو جی کی پٹر کے سامنے ہاتھ جوڑے من ہی من میں سب کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ سب کو ہراساں دیکھ دل ہی دل میں وہ مسکرائی، پھر کچھ سوچ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔ ہزارہ سنگھ نے تفکر کے کنویں سے سر ابھار کر اس نے دیکھا اور اپنے بڑے بیٹے سے بولا۔

"ہُن کدا ای انصاف دی گل نئی اے۔ اک بندے دی سزا ....

"تسی بھول رئے ہو باؤ جی"۔

بیٹے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں جواب دیا تو ہزارہ اپنے بیٹے کیہر کو گھور کر رہ گیا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان دو جملوں کی گفتگو اس نے بھی سنی۔ ان کے اضطراب نے اس کے اپنے دل کا دریچہ کھول دیا تھا۔ دل میں قید مسکراہٹ چھلانگ لگا کر اس کے ہونٹوں پر براجمان ہو گئی۔ وہ مکان کی چھت پر پہنچ چکی تھی اور اطمینان سے ادھر ادھر سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلوں کا رقص دیکھ رہی تھی۔ قرب و جوار سے ابھرنے والی امدادی صدائیں جوں ہی اس کی سماعت سے ٹکرائیں تو اس کے ہونٹوں پہ براجی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ ٹھیک اسی وقت ہوا کا جھونکا اپنے دامن میں جلتے جسموں کی چراند کا بھبکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اور اس کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

"بی جی۔ تسی کتھے ہو"۔

سولہ برس کی ہرجیت کور کو مخاطب کرنے پر اس نے پلٹ کر اس کے سراپے کو دیکھا۔ ہرجیت کے پورے وجود پہ کپکپی طاری تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف کنڈلی رمائے بیٹھا تھا۔

"بی جی۔۔۔۔ تسی کتھے ہو۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ سارے پاسے اگ لگی ہے۔

"ہوں"

"ہوں کی بی جی؟

"تھکی تھکی۔ نڈھال سی سینتیس برسوں کے بن باس سے لوٹتے ہوئے وہی تو دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ تو نیچے جا۔۔۔۔ بھائیوں کے پاس۔

"تھلے۔

"ہاں۔ پھر اور چھوٹے کے پاس۔

"تسی اتے کی کر رئی ہو۔۔۔۔ تسی بھی تھلے آؤ۔

"تو جا ہرجیت۔

اس کے تحکمانہ لہجے کی کرختگی محسوس کرتے ہی ہرجیت زینوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اپنے جسم کے بالائی حصے کو اک ذرا سا جھکانے کے بعد نیچے صحن میں سر جوڑے بیٹوں اور ہزارہ سنگھ کو دیکھا پھر زینے اترتی ہرجیت کو جو مسرت اور بے چارگی سے اسے دیکھتے ہوئے بے دلی سے زینے طے کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خمیدہ وجود کو سیدھا کیا اور پھر ایک مرتبہ جلتے ہوئے مکانوں کو دیکھنے لگی۔ فضا، آہوں، کراہوں اور چیخوں سے اٹی پڑی تھی۔

رینگتی ہوئی ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تو کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے مردوں کے ذہنوں میں موجود تشویش نے جھنجھلاہٹ اختیار کر لی تھی۔ جوان گاڑی کے رکتے ہی مستعد ہو گئے ان میں سے بیشتر نے پل بھر کی خاطر کمپارٹمنٹ کے بند دروازے کو دیکھا اور دوسرے ہی پل اپنے عزیزوں کو۔ یکایک وہ سب ہی چونک پڑے تھے۔ ایک دم سے بہت سی آوازوں نے کمپارٹمنٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں پہ حملہ کر دیا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں ٹھسا ٹھس بھرے مسافروں نے اپنی اپنی خوف زدہ نظروں سے کھڑکیوں کے اس پار چمکتی ہوئی کرپانوں کو دیکھا۔ بوڑھی اور ادھیڑ عورتوں نے کم سن اور جوان ہوتی ہوئی بچیوں کو اپنی چھاتیوں سے لپٹا لیا۔ اس اضطراری فعل سے وہ اپنے دلوں کے خوف پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں یا بچیوں

کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ ادھر دروازہ پیٹا جا رہا تھا اور ہر تھپ تھپاہٹ کی ضرب وہ اپنے دلوں پر محسوس کر رہی تھیں۔

دفعتاً ایک فائر ہوا۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ ایک جوان نے اپنی خوبصورت بہن کی چھاتی میں گولی داغ دی تھی اور وہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے رہا تھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا۔ گولیاں چلیں اور وہ جوان تیورا کر گرا جس کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا۔ عورتوں کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ گرتے گرتے بھی اس جوان نے اپنا ریوالور حملہ آوروں پر خالی کر دیا تھا ادھر بھی تین چار گرے تھے۔ اور

دوسرے ہی پل نیزوں کی انیاں جوانوں کے سینوں کو برمانے لگیں۔ کرپانوں نے مردوں کے گلے کاٹے۔ ان کے پیٹ چاک کئے۔ ایک کے بعد ایک دل خراش چیخ ابھرتی، اور کسی نئی چیخ میں معدوم ہو جاتی۔ عورتیں جبراً اتاری جانے لگیں، جن عورتوں نے اپنی بچیوں کے تحفظ کی خاطر کمر کسی انھیں نہر کر دیا گیا۔ ان کے بعد ایسی عورتوں اور لڑکیوں کو، جنھوں نے اپنی چھوٹی بہنوں کی مدافعت کی رتی بھر بھی کوشش کی۔ خود ان کی اپنی بہن بھی اس کے سامنے دیوار بنی کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک جوان ہاتھوں میں سنگین لگی بندوق تھامے کھڑا تھا۔ موت۔ دونوں بہنوں کے سامنے تھی اور جوان کے روبرو تھر تھر کانپتی دو بے یار و مددگار لڑکیاں۔

"باجی"۔

اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ بہن نے جرأت کا ذرا سا مظاہرہ کیا اور جواب میں اس کی باجی کی دل خراش چیخ ابھر کر رہ گئی۔ اس کے اور حملہ آور جوان کے درمیان موجود دیوار گر چکی تھی۔

"کی سوچ میں گم اے ہزارے"۔
"دیکھ۔ کی چیز ہے۔ ماں دے خصم اے نوں اُکھے لے جارئے ہوندے"۔
"توڈا کی وچار اے"۔
"اے نوں میں گھر لے جاویں گا"۔
"مسلی نوں"۔
"آہو .... دیکھ تسی .... کڑی نئیں مٹھے دا گلاس اے"۔
"یہ سینٹ پھانٹ اور ختم کراے نوں"۔

"اوئے۔ کی گل کرداائے۔"

ہزارہ واقعی اسے اٹھا کرلے گیا تھا۔ ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود بھی۔ گھر پہنچ کر اس نے بار بار اس کی عزت لوٹی۔ پھر تو اس کی آبرو ہزارہ کی خواہش کی پابند ہوتی چلی گئی۔

سارا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ جنون کا دریا اتر جانے کے بعد ہزارہ نے اس کا دل جیتنے کی بھی کوششیں کی تھیں لیکن اس نے تو اپنے ہونٹ سی لئے تھے۔ اکثر ہزارہ اس سے پوچھتا۔

" تو اناں نوکدوں بھلا دینگی ؟"

مگر۔ اس کے پاس ہزارہ کے سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ خاموشی۔ بس۔ گہری خاموشی۔

شروع شروع ناشتہ پانی کا انتظام ہزارہ نے ہی کیا تھا۔ پھر چولہا چوکا خود اس نے سنبھال لیا۔ اپنے پر گزر جانے والی قیامت کے اعصاب شکن احساسات کے اثرات زائل کرنے کی خاطر ہی اس نے مصروفیت کا سہارا لیا تھا۔ اسی قیامت کے عذاب کو بھلانے کی خاطر اس کی کوکھ نے بھی تین جانیں اگل دی تھیں۔ بڑا کیہر سنگھ، چھوٹا کرم جیت سنگھ اور ایک بیٹی ہر جیت کور۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہزارہ کے بچے بڑے ہونے لگے۔ تب اسے خیال آیا کہ گاؤں کی زندگی اس کے بچوں کو بہتر مستقبل فراہم نہ کرسکے گی۔ اپنی زمین فروخت کرنے کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گیا۔ راجدھانی پہنچ کر اس نے پرچون کی دکان کھولی۔ کاروبار کے ترقی پاتے ہی دکان بڑے بیٹے اور ملازم کے سپرد کر کے اس نے موٹر سائیکل کے پرزوں کی ایجنسی لے لی۔ ترقی نے یہاں بھی اس کے قدم چومے اور —— آج ہزارہ کی بچی ہر جیت اسی دہلیز پہ کھڑی تھی جہاں سے خود اس کی اپنی زندگی میں انقلاب آیا تھا۔

جلتے ہوئے مکانوں کی آگ کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور نیچے صحن میں کھڑا ہزارہ اس سے مخاطب تھا۔

" اوئے تسی تھلے آجا —— ائے کی کر رئی اے۔

چھت کی کگار پر ہتھیلیاں ٹیک کر اس نے سر جھکا کر نیچے دیکھا۔ پھر بچوں کو۔ اس سے پہلے کہ وہ ہزارہ کی بات کا جواب دیتی۔ بلوائیوں نے مکان پر دھاوا بول دیا۔ ہر جیت ڈر کے مارے کمرے میں بھاگی۔ پل بھر میں ہزارہ، کیہر اور کرم جیت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر کھونٹیوں پہ ٹنگی

ہوئی کرپانوں کو۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ فیصلے ہوئے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کرپانوں کی طرف بڑھتے دروازہ ٹوٹ کر صحن میں آن گرا۔ ایکدم سے کئی جوان ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں، لاٹھیاں اور بندوقیں لئے صحن میں گھس آئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر چھوٹے کے کیس پکڑے دوسرا ہزارہ کی طرف بڑھا۔ کہر کرم جیت کی طرف بڑھا تو ایک بلوائی کا چھرا اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ ہزارہ تلملایا اور آگے بڑھا۔ دوسرے بلوائی نے اپنا ریوالور اس کے سینے پر رکھ دیا اور ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے گالی دینے لگا۔ کرم جیت دہشت زدہ اب کبھی ان کی گرفت میں تھا ایک نے اس کا کام بھی تمام کر دیا تب کسی نے چیخ کر سب کو مخاطب کیا۔

"ایک عورت اور ایک لونڈیا اور رہے گی اس مکان میں۔

وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنے سارے وجود سے ہمتیں بٹوریں اور چھت پر سے صحن میں کود گئی۔ چند ثانیوں کے لئے تمام حملہ آوروں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اٹھ کر اس نے کولہے جھاڑے ایک نگاہ بلوائیوں پر ڈالی۔ پھر کہر کرم جیت اور ہزارہ کی لاشوں کو دیکھتے ہوئے الٹے قدموں کمرے کی طرف بڑھی۔

"سوچ کیا ہو۔ ختم کرو۔"

"اور لونڈیا کو اٹھالو۔"

"بی جی —— ہر جیت کی کانپتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"با جی —— کہیں —— بہت دور سے خود اپنی آواز بھی اس نے سنی۔

"بی۔ جی —— ہر جیت نے اسے پھر پکارا۔

"با جی —— خود ہی آواز۔ اب اس نے بہت قریب سے سنی۔"

"بی ۔ ۔ ۔ ۔ جی —— ہر جیت ہڑبڑا کر کمرے سے نکل آنے کی حماقت کر بیٹھی۔

"سوچ کیا ہو۔ ٹھکانے لگا اسے۔ اور اٹھالو۔ لونڈیا کو۔

اس نے دیکھا ایک بندوق بردار اس کا نشانہ لے رہا تھا۔ پل بھر میں اس نے ایک فیصلہ کیا۔ سرعت سے مڑ کر اس نے ہر جیت کو اپنے سے الگ کیا۔ لپک کر کرپان نکالی اور آن واحد میں وہ کرپان ہر جیت کے پیٹ میں اتار دی۔

وہ جو نشانہ لے رہا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھوں میں لرز کر رہ گئی۔ اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔ مشعلوں میں روشن آگ کچھ اور ہو چلی تھی۔ فرش پر ہر جیت آخری سانسیں لیتے ہوئے تڑپ رہی تھی اور مشعلوں کی روشنی میں ماں اور بیٹی۔ دونوں کا چہرہ تمتمارہا تھا۔ □

رفیعہ منظور الامین
بی - ۱۱۱، جامعہ انکلیو، نور نگر روڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ - ۱۱۰۰

شو کہاں ہے؟

پہلے تو وہ چڑی مار تھا ——— جنگل سے چڑیاں پکڑ پکڑ کر بیچتا، جس سے اس کا اور اس کے خاندان کا گزارا ہو جاتا ——— لیکن اب یہ کام مشکل ہو رہا تھا کیوں کہ چڑیاں جنگل چھوڑ چھوڑ کر شہر سدھار رہی تھیں ——— جہاں انھیں نئے نئے فیشن ایبل جال مل سکتے تھے ——— ویسے بھی ان کے ناز نخرے بہت بڑھ گئے تھے ——— اگر کبھی جال میں پھنس بھی جاتیں تو بڑی ناک بھوں چڑھاتیں جیسے جال میں آ کر انھوں نے اس پر یعنی شرفو پر احسان کیا ہو ——— شرفو کو ناز اٹھانے کی عادت نہیں تھی ——— اس نے چھوکریوں کا دھندا بھی اسی لئے چھوڑ دیا ——— ان کی کہانی الگ تھی ——— ویسے دو، دو روٹیوں کو ترستیں، تن ڈھانکنا مشکل ہوتا اور جب بیچی جاتیں، روٹی کپڑے کا انتظام ہو جاتا تو ——— خدا کا شکر کرنے کے بجائے واویلا کرتیں، ٹسوے بہاتیں ——— ان سے اچھی تو چڑیاں ہی تھیں جو ہر حال میں چہچہاتی رہتیں۔

کفن چوری بھی کوئی ایسا برا پیشہ نہیں تھا جسے شرفو نے اپنایا ——— وہ ایسی تازہ تازہ قبروں کی کڑیاں کھسکاتا جن کی مٹی سے سوندھاہٹ بھی ختم نہیں ہوتی ——— کانٹے دار تار کو قبر میں داخل کر کے، بل دے کر کچھ اس طرح کھینچتا کہ سارے کا سارا کفن صاف نکل آتا ——— اس کے بعد وہ ان قبروں پر فاتحہ ضرور پڑھ دیتا تاکہ مردے ننگ دھڑنگ خدا کے حضور اس کی شکایت لے نہ پہنچ جائیں لیکن دنیا کہاں کسی کو چین سے رہتا دیکھ سکتی ہے ایک دن جب وہ کسی بزرگوار کی قبر سے ان کا کفن چرا رہا تھا تو پکڑا گیا ——— مرحوم بڑے میاں کے سر گھٹے، ہٹے کٹے قلندر نما بیٹے نے اچھی طرح اس کی گدی ناپی ——— صرف وہی نہیں اس کار خیر میں مرحوم کے لاتعداد نواسے، پوتے بھی شامل ہو گئے ——— انھوں نے بھی اپنے ابو کے ساتھ خوب داد عیش دی۔

"ابو تو زندگی بھر مجھ سے چکنے لٹھے کا پاجامہ مانگتے رہے" ——— قلندر نے اس کا ہاتھ

مروڑ کر کہا۔ "اور اب جو میں نے ان کے نو روپے بارہ آنے والے لٹھے کا کفن لایا تو کہنے تو لے ارا ہ"، لیکن کفن تو برآمد ہو چکا تھا ــــ قلندر نے اس کی جیب میں جتنے پیسے تھے وہ بھی کفن کے ساتھ دھروا لیے اور اسے ادھ موا چھوڑ کر اپنی فوج کے ساتھ واپس چلا گیا۔

ویسے بھی لوگ بڑے سیانے ہو گئے تھے۔ جب انھیں کفن چوری کا پتہ چلا تو اگلا گرا پچھلا ہوشیار کے مصداق سستے کپڑے کے کفن سلوانے لگے ــــ ویسے مردوں کو سادہ زندگی گذارنے کی تلقین بھی ضروری تھی ــــ لیکن اس میں سراسر شرفو کا نقصان تھا۔ اب وہ تارے کفن کھینچتا تو دھجیاں ہاتھ آتیں ــــ ساتھ ہی اسے اب قلندر نما بیٹھوں سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر زہر کا کاروبار شروع کر دیا۔ ویسے بھی چوری چکاری کوئی اچھی بات تھوڑے ہی ہے ــــ اور زہر کی تو سبھی کو ضرورت رہتی ہے۔ امتحان میں فیل ہونے والے طالب علم ــــ شوہروں اور ساسوں کی ستائی ستم رسیدہ عورتیں ــــ محبت میں ناکام عاشق ــــ شادی کو ترستی ان بیاہیاں ــــ بے روزگار نوجوان ــــ اس کے علاوہ خود کھاتے ہیں بلکہ کھلانے والوں کا بھی ایک قبیلہ ہوتا ہے ــــ کوئی زہر کو زہر سے مارنے کے لیے خریدتا ہے ــــ خودکشی کے نام پر قتل کرنے والی سیاسی چال بازیاں تو خیر ہیں ہی۔

بہت جلد اس کا بزنس چل نکلا ــــ دوکان کے آگے اس نے ایک بڑی HOARDING لگائی جس پہ کھوپڑی اور اس کے نیچے دو ہڈیاں بنی تھیں اور نیچے لکھا تھا "تیر بہدف زہر ــــ بس ایک ہی بار میں موت یقینی" اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ دوسری بار کھانے والے کو بھاری رعایت دی جائے گی" ــــ رعایت کا یہ اعلان دیکھ کر ــــ جو لوگ ڈرپوک اور بزدل تھے وہ بھی زہر خریدنے لگے۔ زہر میں شرفو نے ورائٹی کا بھی خیال رکھا تھا۔

ایک زہر تھا "فی الفور" فوراً خاتمہ ہو جاتا تھا۔

ایک اور تھا ــــ کرب ترٹاپ ــــ بڑا ظالم زہر تھا۔ تڑپ تڑپ کر کربناک موت دیتا تھا۔

"سہ تال" ــــ ریں ریں کرتی ایڑیاں گھستی موت آتی تھی۔

فی الفور خاص کر امتحان میں فیل ہونے والے طالب علموں میں مقبول تھا۔ جو خود کو

مے

SUPPLEMENTARY امتحان کی مہلت بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔

کرب تڑپ زیادہ تر مجنوں کے نام لیوا ـــــ محبت میں ناکام عاشق لے جاتے تھے جنھیں سیدھی سادی موت پھیکی پھیکی بورا پن لگتا تھا۔

سرتال کا استعمال ایسے گوگوں اور سازندوں میں عام تھا جو دس سال خود کو فن کی کسوٹی پر گھستے تھے پھر بھی انھیں سر کا پتہ ہوتا تھا نہ تال کی خبر ـــــ

بہرحال ہر ایک کی پسند اور ذوق کے مطابق زہر دستیاب تھے ـــــ

ایک بار ایک ساس نے اپنی بہو کے لئے فوراً اثر کرنے والا 'فی الفور' خریدا ـــــ تاکہ پل بھر میں 'منہ جلی' کا قصہ ختم ہو ـــــ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے اس کے دل کی جلن نے شعلوں کا روپ دھار لیا۔

"مردا، کو ایسی موت دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی"۔ اس نے فی الفور واپس کیا اور اس کی جگہ 'کرب تڑپ' لے گئی ـــــ کچھ بہوئیں ساس کے لئے 'سرتال' لے جاتیں کہ بڑھیا ایڑیاں گھس گھس کر ختم ہو۔

ایک دن چھوٹا سا ہنگامہ کھڑا ہو گیا، جب ایک شوہر نے زہر کی بچی ہوئی آدھی پڑیا شرفو پر دے ماری ـــــ

"حرام خور! ملاوٹ کرتا ہے! ـــــ کہتا تھا چٹکی بھر کافی ہوگا" ـــــ شوہر نے دہاڑ کر آسمان سر پر اٹھا لیا ـــــ "میں ڈیڑھ پڑیا کھلا چکا اور وہ ابھی تک بھلی چنگی ہے ـــــ بلکہ اب تو خود ہی 'بس کی پڑیا' بن گئی ہے"۔ اس شخص کی بیوی کو وہ زہر اتنا بھایا تھا کہ چورن کی طرح اپنے شوہر سے روز اس کی فرمائش کرنے لگی تھی۔

شرفو پھدک پھدک کر اس گاہک کو چپ بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خواہ مخواہ ساکھ خراب ہوتی تھی ـــــ لیکن پاس ہی ڈنڈا گھماتے ایک سنتری نے سن لیا ـــــ وہ تو جرم کی بو پاتے ہی آدھمکتا تھا۔ سو وہ آدھمکا۔

"کیوں بے، ملاوٹ کرتا ہے" ـــــ اس نے کہا اور اس کی جیب خوشی سے کھلکھلائی۔

"جانتا نہیں ملاوٹ کرنا جرم ہے!" ـــــ جیب کی کھلکھلاہٹ، کھنکھناہٹ میں بدل گئی تب اس نے شرفو کی جان چھوڑی۔

ایک روز ایک اور گاہک آیا "سیٹھ چار آنے کا زہر دے دو" ـــــ اس نے چونی بڑھاتے

ہوئے کہا اور شرفو چراغ پا ہوگیا۔

"چار آنے کا زہر خریدنے آیا ہے"___ شرفو نے دانت پیسے ۔تیری اتنی ہی اوقات ہے تو شکر کیوں نہیں پھانک لیتا"___

"چار آنے کی شکر کوئی نہیں دیتا"___ گاہک گڑگڑایا۔

"ابے کالی ہنڈی کے"___ شرفو ڈنڈا لے کر دوڑا "جا، چلا جا وہیں ___ وہاں موت خیرات میں بٹ رہی ہے"___

اسے غصہ دراصل اس بات پر آیا تھا کہ گاہک نے اس کی دوکان کو کوئی ایسی ویسی دوکان سمجھا تھا جہاں چونی کا زہر مل جائے گا!

وہ ان چھٹ بھیئوں سے تنگ آرہا تھا___ ایک گاہک نے تو حد کردی۔وہ زہر کھانا بھی چاہتا تھا اور مصر بھی تھا کہ کفن دفن کا انتظام شرفو کے ذمے رہے گا___ اس کی تاویل یہ تھی کہ مقصد صرف شرفو کے PRODUCT کی تشہیر ہے۔اس لئے SPONSOR SHIP کا ذمہ شرفو ہی کا ہوگا۔اشتہار بازی کے یہ نئے ڈھنگ شرفو کو بالکل منظور نہ تھے ___ بازار میں مقابلہ بڑھ رہا تھا ___ جوڈاز (JUDAS) کے اندرائنی بوسے پر ریسرچ ہورہا تھا بلکہ تازہ ترین خبروں کے مطابق یہ تجربے کامیاب بھی ہوگئے تھے ___ سائنسداں اسے AIDS کا نام دیں یا کوئی اور نام ___ دنیا کی سہل پسندی اتنی بڑھ گئی تھی کہ بس ایک بے ضرر سے بوسے میں ہی زندگی اور موت کے فیصلے ہونے لگے تھے ___ لیکن اس کی افادیت محدود تھی ___ بس ایک بوسہ، ایک ہی موت ___ شرفو خود کو اس SMALL SCALE INDUSTRIES کی اسکیم میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا ___ اسے تو عام سطح سے اوپر اٹھنا تھا ___ اس نے خود کو روپوش کرلیا اور اپنی لیباریٹری میں نت نئے تجربے شروع کردیئے۔اب وہ افراد سے نہیں ملکوں سے سودا کرتا تھا۔اسے گاہکوں کی کمی نہیں رہی۔کیوں کہ وہ بزنس کی مناسبت سے کمیشن بھی دیتا تھا۔

چھوٹے ملک خودکشیاں کر رہے تھے اور بڑے ملک دلار سے انھیں سونے کے پیالوں میں زہر بانٹ رہے تھے۔

آج کوئی ایسا شِو نہیں تھا جو اٹھے وہ سارا زہر پی لیتا۔جو انسانیت کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا! □

غلام الثقلین نقوی

۱۷۴- بدر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور (پاکستان)

قلم

سارے سامان میں اسے چمڑے کا وہ بریف کیس زیادہ قابلِ اعتنا محسوس ہوا جو کثرتِ استعمال سے اپنی شکل و صورت کب کا کھو چکا تھا اور اب اصل کا کارٹون نظر آتا تھا۔ اس کی زپ بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔

اندر کے خانوں سے کئی کاغذات نکلے۔ الم غلم بے معنی سے۔ ایک چھوٹے سے گول پیکٹ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس کو دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں ایک عجیب سی تھرتھری پیدا ہوئی جیسے اس میں کوئی بہت بڑا اسرار چھپا ہوا ہو۔ اس پیکٹ کے اوپر ایک ربر بینڈ تھا۔ اس نے ربر بینڈ ہٹایا۔ رول کیا ہوا دبیز کاغذ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ جب پورا کھل گیا تو اس میں سے ایک نہایت بدہیئت قلم برآمد ہو کر فرش پر گر پڑا . . . . یہ پھولے پیٹ والا ایک فونٹین پین تھا کہ جس میں ڈھیروں سیاہی بھری جا سکتی ہے اور جس سے صفحے کے صفحے کالے ہو جاتے ہیں اور سیاہی کا چشمہ خشک نہیں ہوتا۔

جونہی فرش سے اٹھا کر اس نے قلم ہاتھ میں لیا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پہلے کبھی بھی اسے چھوا ہو۔ . . . . ایک مانوس سا لمس . . . . اچانک اس کے لاشعور کا کوئی دریچہ کھلا اور د سازوں کی ایک "سمفنی" اس کے کانوں میں در آئی۔ چرر چرر چرر اور ایک جھینگر کی تیز سروں یں نے نوازی۔ اس کا تن بدن اینٹھ گیا۔ کان اس مانوس آواز کو سننے لگے اور آنکھیں ایک بوسیدہ سے کمرے میں روشنی اور سایوں کی ایک فلم کو دیکھنے لگیں۔ اس کمرے میں سرِ شام پردا ڈال کر اس کے دو حصے کر لئے جاتے تھے۔ ایک حصے میں ایک بہت دھیما سا بلب جلنے لگتا جو اندھیرے کے رار کو اور بھی گہرا کرتا ہوا نظر آتا۔ کمرے کی دیواروں پر جہاں جہاں پلستر اکھڑا ہوا تھا، وہاں اس روشنی عجیب و غریب چہروں کی تخلیق کرتی رہتی۔ اس حصے میں ایک پلنگ بچھا تھا جہاں وہ اپنی ے کے پاس سوتا تھا۔ پردے کی دوسری طرف بچھی کھاٹ کے سامنے ایک پستہ قد تپائی تھی جس

پر شیڈ کیا ہوا ایک ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔

جونہی ان کے کمرے کا بلب بجھتا، ٹیبل لیمپ روشن ہو جاتا اور کمرے کے کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر نغمہ سرائی شروع کر دیتا۔ پھر ایک شخص تپائی پر جھک جاتا اور یہ بھدا سا موٹا سا قلم کاغذ کے ساتھ مل کر چرر چرر کی آواز کو جھینگر کی سروں میں ملا دیتا۔

بلاشبہ اس سازو آواز میں اس کے لئے مسرت و انبساط کا کوئی پہلو نہیں تھا لیکن جب تک جھینگر اور قلم ایک دوسرے کی ہم نوائی نہ کرتے، اسے نیند کبھی نہ آتی۔ ایسا کبھی کبھار ہوتا لیکن ہوتا ضرور کہ جھینگر تو بولتا رہتا اور قلم اس کی ہم نوائی نہ کرتا، اور اسے نیند نہ آتی۔ ماں اسے کہانیاں سناتے سناتے اور نیند کی پریوں کو بلاتے بلاتے تھک جاتی اور اس کی آنکھ بند نہ ہوتی تو وہ جھلا کر کہتی "ضدی بچے! آج مدت کے بعد سکون کی رات نصیب ہوئی تھی اور آج تو سونے نہیں دے رہا۔" وہ جھوٹ موٹ سوتا ہوا بن جاتا اور کروٹ بدل لیتا کہ اس کی ماں سو جائے۔

ایسا بہت کم ہوتا لیکن کبھی کبھار رات کو یا صبح منہ اندھیرے اسے باورچی خانے سے برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ شخص جس کے ہاتھ میں قلم رات بھر چلتا رہا ہے، اب تھک چکا ہے اور چائے کے دو گھونٹوں سے تازہ دم ہونا چاہتا ہے۔

اس کی ماں لیٹے لیٹے کہتی "مسرور صاحب! آج پتی ختم ہے۔ براہ کرم ہمیں تو سونے دیجئے۔" ماں کی آواز میں بڑی کاٹ ہوتی۔ کبھی وہ دودھ کے نہ ہونے کی نوید دیتیں، کبھی چینی کے فقدان کا مژدہ۔

اب معلوم نہیں کہ وہ شخص جو اس کا باپ تھا اور جس کا نام مسرور تھا، آدھی رات کو چائے کی طلب کس طرح پورا کرتا۔

"میرا خیال ہے، وہ اکثر گرم پانی کے دو گھونٹ پی کر ہی تازہ دم ہوتا ہوگا۔" اس نے سوچا۔

لیکن اس نے اس کے منہ سے شکایت کا ایک لفظ کبھی کبھی نہ سنا۔ اس شخص کے ساتھ اس کی یگانگت کا زمانہ اتنا مختصر تھا کہ اب اس کے خدوخال کبھی اسے یاد نہیں رہے تھے . . . . بچپن ایک ایسی وادی کی مانند ہے جس پر مسلسل دھند چھائی رہتی ہے، کبھی کبھار ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا یا سورج کی ایک ننھی سی کرن دھند کے دبیز پردے میں ذرا سا رخنہ ڈالتی ہے تو وادی کا کوئی گوشہ نظر آ جاتا ہے . . . . چند جھلکیاں . . . . کہیں کوئی جھاڑی نظر آتی ہے کہیں

سبزہ دکھائی دے جاتا ہے . . . . کہیں کوئی بے برگ و بار درخت . . . .

اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ہے جس کی انگلی پکڑے وہ اسکول جا رہا ہے، اس انگلی سے محبت کی ایک دھارا بہتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے کہ رگ رگ میں سرایت کر رہی ہے . . . . اس شخص کی ذات میں ایک نہایت ملائم اور دودھیا سی دھوپ کی نرمی اور حدت ہے کہ انگلی کے لمس میں مجسم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس بے نام چہرے پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ ہے جو سوئی سوئی خواب آلود آنکھوں سے اتر کر اس کے دل میں سمائے جا رہی ہے۔ اس کی آواز کبھی اس نے سنی کہ زمزمۂ محبت بن کر روح میں سما جاتی تھی۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی ماں ایک سوٹ کیس میں کچھ کپڑے رکھ رہی ہے، ایک بستے میں اس کی کتابیں اور کاپیاں ٹھونس رہی ہے اور وہ بے چہرہ شخص اس سارے منظر سے یکسر غائب نظر آتا ہے۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ اس کشادہ مکان کے دروازے تک پہنچتے ہیں جسے وہ بچپن سے جانتا تھا کیونکہ یہ اس کے نانا کا مکان ہے۔ اس کا بڑا دروازہ بند ہوتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ بے نام چہرے والا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے باہر رہ گیا ہو . . . .

. . . . ہوا کا ایک جھونکا آیا . . . . دھند کا پردہ ذرا سا سرکا . . . . وادی کا ایک کونہ عریاں ہوا . . . . اس نے اس شخص کو پھاٹک کے باہر کئی بار گلی کے نکڑ پر کھڑے دیکھا . . . . کبھی وہ اسکول کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑا نظر آتا . . . . ایک ہیولیٰ سا . . . . خاموش اور ساکت . . . . جس کے ہونٹ تو کیا، نگاہیں بھی اس سے ہم کلام نہ ہوتیں لیکن اس خاموشی میں بھی کتنا ارتباط تھا جیسے وہ نظروں کے اتصال کے کسی لمحے پر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہوں . . . . ایک لمحے کا ارتباط و ادغام . . . . دو نقطوں کا اتصال . . . . پھر اس کی ماں اس کا ہاتھ تھام لیتی . . . .

اور پھر دھند چھا گئی اور ماضی کا یہ لمحہ آہستہ آہستہ فیڈ ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح وہ شخص بھی ماضی کی دھند میں غائب ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گیا۔ اب وہ گلی کی کسی نکڑ یا اسکول کے گیٹ کے باہر کھڑا نظر نہ آتا۔

جب تک اس کا بچپن رہا۔ اس بے چہرہ شخص کے ساتھ اس کا جذباتی ارتباط استوار رہا۔ لڑکپن کا زمانہ آیا، تو یہ تعلق مدھم پڑ کر رہ گیا جیسے کسی تصویر سے رنگ اڑ گئے ہوں۔

اسکول سے واپسی پر وہ جس بس اسٹاپ سے گھر جانے کے لئے بس لیتا، اس کے ساتھ

ہی اخباروں اور رسالوں کا ایک کھوکھا تھا۔ بس کو دیر ہوتی تو وہ ایک نظر ان رنگین رسالوں پر ڈال لیتا جن کے ٹائیٹل پیج پر کسی لڑکی کی رنگین تصویر ہوتی۔ کبھی کبھار کسی فیچر یا کہانی کے دو چار جملے بھی پڑھ لیتا۔ ایک بار اس نے ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی شروع کی تو اسے ایک تصویر نظر آئی اس میں آشنائی کا کوئی پہلو ضرور موجود تھا کہ اس کی نظر اس پر اٹک گئی۔ عین اس لمحے کسی نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے رسالہ چھین لیا اور کہا "منصور! تم کئی دنوں سے گھر دیر سے پہنچتے تھے۔ آج میں نے چاہا کہ دیکھوں تو تمھیں دیر کیوں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، تم یہاں فضول رسالے پڑھتے رہتے ہو اور بس مِس کر دیتے ہو"۔

"نہیں امی! بس میں دیر ہوتی ہے تو میں کوئی رسالہ اٹھا لیتا ہوں . . . . امی! آپ نے ابھی جو رسالہ مجھ سے چھینا ہے، اس میں ایک تصویر تھی"۔

"تصویر تھی! . . . کس کی تصویر تھی؟"

"لگا جیسے کبھی میں نے اس آدمی کو دیکھا ہو"۔

اس کی ماں نے رسالے کے ورق الٹ پلٹ کئے۔ جب تصویر والا ورق سامنے آیا تو اس کا چہرہ اچانک بوڑھا ہو گیا جیسے کوئی کاغذ تڑ مڑ گیا ہو۔

"مجھے نہیں معلوم یہ کس کی تصویر ہے"۔ اس کی ماں نے رسالہ سٹال پر واپس رکھتے ہوئے کہا "چلو! بس آ گئی ہے"۔

اس دن اس نے اپنی ماں کو چھپ کر روتے ہوئے دیکھا، تو وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کے باپ کی تصویر تھی۔

اس کی ماں نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "اب چھپانے کا کیا فائدہ، تم خود جان گئے ہو، یہ تمھارے باپ کی تصویر ہے۔ تم سمجھتے ہو گے، میں نے اس سے دھوکا کیا ہے . . . . نہیں دھوکا اس نے مجھے دیا۔ جب میں نے اسے اپنے لئے چنا تو اس کی گلیمر نے پورے کالج میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ میں نے گھر بھر سے بغاوت کی اور اسے اپنا لیا"۔

"اس نے کون سا دھوکا دیا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کے ساتھی جو اس سے بہت پیچھے تھے، اس سے بہت آگے نکل گئے۔ کسی نے سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوا۔ کسی نے وکالت کی اور ملک کا سرکردہ وکیل بنا۔ کسی نے فوج میں کمیشن لیا اور جنرل کے عہدے تک پہنچا۔ کوئی ٹیچر بنا۔ لیکن گرتے پڑتے کسی کالج کا پرنسپل

لگ گیا . . . اس نے پارکر کا ایک بھدا سا قلم خریدا اور کہ منہ کے ساتھ اپنا ناتا جوڑ لیا . . . . اس نے اپنی کبھی نیندیں حرام کیں اور بہاری بھی لیکن اس سے اسے کیا ملا . . . بھوک اور تنگ . . . بیٹے ! میں بھوک اور تنگ میں بھی اس کا ساتھ دیتی لیکن وہ ذلت کیسے برداشت کرتی جو ایک ناکام آدمی کا مقدر ہوتی ہے اور جس کا وافر حصہ اس کی بیوی کو ملتا ہے ۔ مالک مکان کی ذلت آمیز دھمکیاں دکانداروں کے ذلت آمیز تقاضے اور وہ آوازے جو ہر گلی کوچے میں اس عورت پر کسے جاتے ہیں اور وہ فحش نظریں جو ہر اس عورت پر پڑتی ہیں جس کا خاوند بے کار ہو اور جو بازار سے ادھار لینے پر مجبور ہو . . . . "

اس کی ماں بولتے بولتے رک گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

" میں تمھارے باپ کی اب بھی عزت کرتی ہوں ۔ اگر محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں کرتی لیکن میں اس شخص کے ساتھ رہنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور نہ کر سکی جس نے میری توقعات اور عزت نفس کے ساتھ اتنا بڑا فریب کیا ۔"

ماں کی اس گفتگو سے باپ کا وہ 'عکس' جو کبھی کبھار شعور کی کرن پڑنے سے لاشعور کی دھندلی وادی میں روشن ہو جاتا تھا ، یکسر بجھ گیا جیسے کاغذ سے تصویر اڑ گئی ہو . . . . اسے نہ اس سے نفرت ہوئی نہ محبت باقی رہی ، نہ اس سے ملنے کی خواہش ، نہ بچھڑنے کا افسوس . . . . لاتعلقی ، بے گانگی ، بے نیازی کی عجیب سی فضا تھی جس سے اس کا لڑکپن گزرا ۔

جوانی کا زمانہ آیا تو بے گانگی کا احساس جمود کی منزل پر پہنچ کر ٹھہر گیا ۔ جوانی میں ہنگامے بھی تھے اور تیز رفتاری بھی ۔ اتنی مصروفیت کہ وقت بھی اس کا ساتھ نہیں سکتا تھا ۔ جب وقت پہاڑی ندی کی مانند کف برلب امڈا ہوا چلا آرہا ہو ، تو اس میں ہر چیز بہہ جاتی ہے ۔ صرف وہی چیز بہنے سے محفوظ رہتی ہے جس کی اپنی ذات پر گرفت مضبوط ہوتی ہے ۔

وہ انجینیر بنا اور خلیج کی ایک ریاست میں اسے نوکری مل گئی ۔ ایک سال بعد چھٹی پر آیا تو ماں نے اس کی شادی کر دی ۔ اب اس کے دو بچے تھے ۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی ۔

اب کے وہ چھٹی پر آیا تو اس کی ماں نے نہایت غیر جذباتی انداز میں اسے بتایا کہ اس کا باپ وفات پا گیا ہے ۔ ایک اخبار میں اس کی موت کی دو سطری خبر چھپی تھی ۔

" آپ جنازے میں شامل ہوئیں ؟" اس نے پوچھا ۔

" پگلے ! جنازہ تو مرد پڑھتے ہیں ۔ تم یہاں ہوتے تو میں تمھیں جنازے میں شامل ہونے سے

نہ روکتی . . . . البتہ میں اس کی قبر پر گئی تھی . . . ."

"پھول چڑھانے ؟" اس نے پوچھا۔

"خیال تو آیا تھا بیٹے لیکن موت — بعد مرنے والے سے منافقت کرنے کو جی نہ چاہا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ اس کی کال کوٹھری سے اس کا سامان لے آئی۔"

"امی! وہ لاوارث آدمی کی موت مرا — اور آپ نے کچھ نہ کیا" اس کی آواز میں احتجاج تھا؛ "کفن دفن کے لئے لوگوں نے چندہ جمع کیا ہوگا۔ یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

"بیٹے! جذبات میں نہ آؤ۔ مجھے اس کی بیماری کی خبر ملتی تو میں ضرور اس کی خبر گیری کو پہنچتی۔ میں اتنی کٹھور دل تو نہیں! . . . . تمھیں کیا معلوم میں زندگی بھر اس کے لئے کتنا کڑھتی رہی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ تمھاری اس کے ساتھ جذباتی وابستگی پیدا ہو۔ اس لئے میں نے تمھیں جو چہرہ دکھایا، وہ بے نیازی اور بیگانگی کا چہرہ تھا بلکہ سنگدلی اور سنگ دل کا چہرہ . . . . میں نہیں چاہتی تھی کہ تمھارے دل کے کسی گوشے میں اس کے لئے کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے جو پروان چڑھ کر تمھیں بھی اس کی ڈگر پر ڈال دیتا۔"

اب ماں اپنے چہرے کی بے نیازی اور غیریت کو قائم نہ رکھ سکی۔ اس کے چہرے پر غم کا گداز پیدا ہوئے اور آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

اس کے دل میں غم و غصے کی جو ہلکی سی آنچ پیدا ہوئی تھی، اس پر یہ آنسو ٹپکے تو اسے سکون سا محسوس ہوا۔

ماں نے آنسو پونچھ کر کہا "بیٹے! یوں وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ آدمی کو وہ پیشہ اختیار کرنا چاہئے جس کی صلاحیت اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہو۔ کالج ہی میں اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ادب اس کے خون کے ساتھ اس کے رگ رگ میں گردش کر رہا ہے چنانچہ اس نے کالج میگزین میں افسانے لکھے، تنقید لکھی اور شعر بھی چھپوائے۔ ان پر اسے بہت داد ملی۔ پر جب وہ عمل کی دنیا میں آیا تو ادب اسے روٹی نہ دے سکا حالانکہ اس نے بہت محنت کی! ادبی رسالوں میں اس کی تصویریں چھپیں، اس کے فن پر مضمون لکھے گئے۔ لیکن فن کا معاوضہ اسے کہیں نہ ملا . . . . اس نے فرضی نام سے عام پسند ناول لکھنے شروع کئے۔ ان سے جو آمدنی ہوتی، اس سے گھر کا خرچ چلانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے میں اس سے علیحدہ ہو گئی . . . . میں نے سمجھا تھا کہ جب میرا بوجھ اس کے قلم پر سے اتر جائے گا تو وہ اپنی صلاحیت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گا

پر ایسا نہ ہوا، وہ ادب کی سیڑھی سے گرتا چلا گیا . . . . اس کے وہ ہم جماعت جو بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے، قلم ان کے ہاتھ میں بھی رہا۔ کسی نے افسانہ لکھا، کسی نے شعر کہے، کسی نے ڈرامے میں نام پیدا کیا، نہایت شاہانہ زندگی بسر کی اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں اپنی کتابوں پر فنکشن کرائے اور ادبی انعامات سے سرفراز بھی ہوئے . . . .'' اس کی ماں بولتے بولتے رک گئی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چند لمحوں کے توقف کے بعد نہایت غمگین آواز میں کہا "بیٹا! سب سے بڑا دکھ تو مجھے یہ ہے کہ اس کی کوئی کتاب نہ چھپی کہ جس پر اتنا بڑا فنکشن ہوتا۔"

"امی! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے افسانے لکھے، شاعری کی اور ان کے بہت سے ناول چھپے . . . ."

"افسانے اور شعر ادبی رسالوں سے نکل کر کتابی صورت میں نہ آسکے۔ اس نے جو ناول لکھے وہ فرضی نام سے چھپتے رہے . . . . یوں فرضی ناموں سے اس نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں جو بک اسٹالوں پر بکتی رہیں اور ان کی آمدنی سے وہ اپنا اکیلا پیٹ بھی بڑی مشکل سے پالتا رہا . . . . اب ممکن ہے تمھیں میری یہ بات لطیفہ معلوم ہو کہ اس کی ایک کتاب "صحت کے زریں اصول" ہزاروں کی تعداد میں چھپی اور بکی . . . . اور اس کی ایک کاپی میں نے بھی خریدی۔"

"یہ کتاب تو میں نے بھی بک سٹال پر دیکھی تھی لیکن اس پر مصنف کا نام تو بقراط سینائی لکھا تھا۔"

"یہ بھی اس کا ایک فرضی نام تھا۔" اس کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ کچھ دیر تک موٹے، بھدے اور بے ڈول پارکر کے قلم کو دیکھتا رہا کہ جس کے پیٹ میں سیاہی کی پوری بوتل سما جاتی ہوگی . . . . اسے اس سے ڈر سا لگا جیسے ابھی یہ کاغذ پر چلنے لگے گا . . . . چرر چرر چرر . . . . اور سٹور کے کسی کونے کھدرے میں چھپا کوئی جھینگر بھی اپنے ساز سے اس کی ہم نوائی کرنے لگے گا اور وہ "سمفنی" شروع ہو جائے گی جس میں اس کے لئے لطف و مسرت کا کوئی پہلو نہیں ہوا کرتا تھا . . . . اور پھر ایک تنگ و تاریک کرنے کی دھند گہری ہو کر اس کے ماحول کی ساری روشنیوں کو اپنے اندر جذب کر لے گی . . . .

وہ کانپ گیا۔

اس نے وہ کاغذ اٹھایا جو فرش پر گر کر خود بخود رول ہو گیا تھا، قلم کو اس میں لپیٹا، ربڑ بینڈ

چڑھایا اور اسے ٹوٹے پھوٹے سال خوردہ بریف کیس میں بند کر دیا۔

اور میں جو اس 'قلم' کا افسانہ لکھ رہا ہوں، مجھے قدرت کی طرف سے ایک چھٹی حس بھی عطا ہوئی ہے .... اور باطنی نظر بھی .... اور میری باطنی نظر اس کورے کاغذ پر ایک تحریر کو صاف پڑھ رہی ہے۔

"بیٹے! ہو سکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا یہ سامان تم تک پہنچ جائے۔ اس وراثت پر تمھیں کیا خوشی ہوگی۔ ایک صندوق ہے جس میں چند کتابیں بھری ہیں جو میں نے کئی فرضی ناموں سے لکھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ادیبوں کے ہاں سے کتابوں کے علاوہ چند تصویر بتاں اور کچھ حسینوں کے خطوط ضرور ملتے ہیں اور ان کی کچھ نہ کچھ اشاعتی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے۔ اس صندوق میں سے یہ بھی تمھیں نہیں ملیں گے۔ تمھاری امی نے شادی سے پہلے جو خطوط میرے نام لکھے تھے، وہ علیحدگی کے بعد انھوں نے تلف کر دیئے تھے ....

البتہ میں چاہتا ہوں کہ میرے "قلم" پر دو قرض ہیں، وہ تم اتار دو۔

۱۔ ایک قرض تو "عجیب و غریب پبلشنگ ہاؤس" کا ہے کہ جن سے میں نے پانچ کتابیں لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور پانچویں کتاب باقی رہ گئی تھی کہ جس کا ایک ہزار روپیہ پیشگی میں نے وصول کیا تھا، اس کتاب کا عنوان "کامیابی کا راز" ہے۔ یا تو یہ کتاب انھیں بقراط سینائی کے نام سے لکھ کر دے دو یا ان کا روپیہ واپس کر دو۔

۲۔ دوسرا قرض ان مسودے کی صورت میں ہے جو کتابوں کے نیچے صندوق کی تہہ میں پڑا ہے۔ اسے ضرور اپنے صرف پر شائع کرنا اور کسی بڑے ہوٹل میں اس کی تعارفی تقریب بھی منعقد کروا دینا اور سمجھ لینا کہ یہی میرا دسواں ہے یا چہلم۔

تمھارا باپ

مسرور"

ہو سکتا ہے کہ جس کاغذ میں یہ قلم لپٹا ہوا تھا، اس پر یہ تحریر میری چھٹی حس نے خود ہی لکھ دی ہو اور میری باطنی آنکھ نے پڑھ لی ہو۔

میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اور جس قلم سے میں نے یہ افسانہ لکھا ہے، اس کی زبان بھی ساکت ہے! □

۱۱ ماہی الفاظ

نامی پریس، نخاس
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

صبیحہ انور

رشتہ

آج کل شہر میں ایک بہت بڑی نمائش آئی ہوئی تھی ـــــ ہر طرف اسی کا شہرہ تھا شام کی چائے کے دوران ہی نمائش جانے کا پروگرام بن گیا میں چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ انور نے پکار کر دونوں بچوں سے جلد تیار ہونے کی تاکید کی اور نمائش چلنے کی خوش خبری سنا دی۔

نمائش بیگم حضرت محل کے لیے جوڑے پارک میں لگی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہاں جانے کا سنتے ہی بچے خوشی سے اچھل پڑیں گے مگر کوئی سرگرمی اور ہلچل نہ پا کر مجھے بڑا تعجب ہوا، ویسے بھی دونوں خلاف معمول کمرے میں گھسے بیٹھے تھے، میں اندر گئی تو دیکھا کہ سیف ایک پرانی کارٹون کی کتاب لئے تھا اور گھومنے پھرنے کی شوقین چھٹی کلاس میں پڑھنے والی میری بیٹی اپنی مخصوص کرسی پر اپنا نازک چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں تھامے چپ بیٹھی سامنے دیوار کو تاک رہی تھی۔

”ممی میں نمائش میں نہیں جاؤں گی“، مہر نے بڑی لجاجت سے مجھ سے کہا اور دونوں ہاتھوں سے مجھے پکڑنے لگی۔ میرے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی ـــــ ٹرے میز پر رکھ کر میں تقریباً اسے چمٹاتے ہوئے پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے؟ کل شام ہی کو تو تم نمائش کی سجاوٹ کی تعریف کر رہی تھیں ـــــ“ ”ہاں مگر اب میں ادھر کبھی نہیں جاؤں گی“۔

اس کی آواز کی سختی اور آنکھوں کی بھیگی کوریں دیکھ کر میں گھبرا گئی ـــــ میرے بہت دیر پوچھنے کے بعد وہ یہ بتانے کے لائق ہوئی کہ آج صبح اسکول جاتے وقت اس نے نمائش کے گیٹ پر ایک اسکوٹر سوار کو پڑا ہوا دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ اور جسم کا اوپری حصہ ٹرک سے کچل گیا تھا ـــــ وہ بار بار اس منظر کی تفصیل بتا رہی تھی جس میں اس بات کی تکرار تھی کہ لاش پر کسی نے کپڑا تو ڈال دیا تھا مگر

سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے مہر کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا میری ذرا سی ہمدردی سے اس کا ننھا سا دل ٹھہر گیا ـــ تھوڑی دیر کے بعد اپنے مخصوص لہجے میں اس نے بتایا کہ اسکول پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ وہ مرنے والا شخص اس کی قریبی سہیلی کا چچا تھا جو اخبار سے رات کی ڈیوٹی کے بعد واپس آ رہا تھا اور مزید یہ کہ ابھی تین ماہ پہلے ہی مرنے والے کی شادی ہوئی تھی۔ مہر ٹھہر ٹھہر کر واقعہ کی تفصیل بتا رہی تھی اس کا لہجہ صدمے سے بوجھل تھا میں خاموشی سے اس کا چہرہ تک رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس غم میں اپنی بیٹی کو کس طرح تسلی دوں، اس کا دل بہلانے کے لئے میں نے خاندان کے اور اپنے عزیزوں، دوستوں کے بہت سے ایسے ناگہانی حادثات دہرائے، میری کوشش تھی کہ اس کے دل سے موت کی ہیبت کو کم کر دوں مگر اپنے عزیزوں کے غم کا ذکر کرتے کرتے خود میرے اوپر بھی رقت طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ہم چپ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

نمائش جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا ـــ میرے شوہر اور بیٹا بھی پاس آ کر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے ہمارا گھر ایک انجانے دکھ سے بھرتا گیا۔ اس شام کسی نے ٹی وی پر خبریں تک نہیں سنیں، موت کی ایک جھلک ہی نے میری بچی سے اور اس کے دکھ نے میرے اور میرے گھر کے ہر فرد کی مسکراہٹ سلب کر لی تھی۔ ہر طرف سے گھٹن اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔

رات کو کھانا سامنے لا کر رکھا تو پتہ چلا کہ مہر نے آج اسکول سے آ کر کچھ نہیں کھایا۔ حالانکہ روز میری غیر موجودگی میں وہ نہ صرف اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھانا کھا لیتی تھی بلکہ بچا ہوا کھانا بھی بڑے سلیقے سے ڈھانک کر رکھ دیا کرتی تھی اس رات کسی کا دل کھانا کھانے کا نہ چاہا مگر ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر میں مہر کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی جو اپنی سوچی سوچی آنکھوں سے زبردستی کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں دینے لگی، بات بدلنے کے لئے میں نے اس کی بوڑھی ٹیچر کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کے میک اپ اور اونچی ہیل والی سینڈل کا ذکر مہر کو بہت پسند تھا مگر کلاس اور اسکول کی بات جیسے ہی شروع ہوئی ـــ مہر کو اپنی وہ سہیلی یاد آ گئی جو اپنے چچا کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے آج کالج نہیں آئی تھی۔

وہ تمام تفصیلات جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں سن چکی تھی ـــ مہر نے پھر سے دہرانا شروع کر دیں تو مجھے بڑا عجیب سا لگا کیوں کہ مہر نے یہ بھی بتایا کہ میں بھی اس کی سہیلی کے چچا سے مل چکی ہوں ـــ میں نے بار بار پوچھا وہ تو نہیں جس کا نیلے رنگ کا اسکوٹر ہے جس کے ماتھے

پر ایک طرف چوٹ کا نشان تھا۔ مہر نے میرے ہر سوال کا جواب اثبات میں سر ہلا کر دیا ——
اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اس سے کچھ اور پوچھتی کیوں کہ میں اس نوجوان سے جسے اسی صبح ایک تیز رفتار ٹرک نے کچل دیا تھا واقف تھی اور پھر پتہ نہیں کیسے مجھے ایک ایک کر کے وہ تمام واقعات یاد آتے گئے جب میں اس دراز قد نوجوان سے ملی تھی۔ یہ تو نہیں یاد آیا کہ مجھے پہلی بار کب پتہ چلا کہ اس کی بھتیجی مہر کے ساتھ پڑھتی ہے —— اور وہ تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتا ہے —— مگر یہ ضرور یاد آگیا کہ ایک بار جب میری بیٹی کسی چھوٹے کلاس میں تھی اور اپنا ناشتہ والا ڈبہ گھر میں بھول آئی تھی —— میں اپنے کالج جاتے وقت بہت عجلت اور غصے میں ڈبہ لے کر اس کے اسکول پہنچی تھی۔ ٹھیک اسی وقت وہ بھی اپنے اسکوٹر سے ایک پلاسٹک کا ٹفن بکس لئے اترا تھا —— مہر کا کلاس اسکول میں اوپری منزل پر تھا اور میرے کالج میں دیر نہ ہو جائے اس لئے رکشہ سے اترتے ہی بغیر کسی رسمی بات چیت کے میں نے مہر کا ٹفن بکس بھی اسے پکڑا دیا اور" میری بیٹی کا نام اور کلاس ڈبہ پر لکھا ہے"۔ کہتی ہوئی میں بغیر شکریہ ادا کیئے وہاں سے چل پڑی تھی۔

اسکول ہی میں اس سے ایک اور ملاقات بھی یاد آئی جب اسپورٹس ڈے پر مہمانوں والے پنڈال میں وہ میری اگلی کرسیوں پر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رسہ کشی کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو جی جان سے رسہ کھینچتے دیکھ کر میں بڑے جوش سے اس کے کلاس کو چیئر اپ کر رہی تھی وہ پیچھے مڑ کر کئی بار میری طرف دیکھ کر مسکرایا —— اور بچوں کو پھسل پھسل کر گرتے دیکھ کر اس کے ساتھ میں بھی زور سے ہنس پڑی تھی —— مجھے یاد ہے اس نے چونک کر مجھے غور سے دیکھا تھا۔

میں نے ابھی تھوڑے ہی دن پہلے حضرت گنج میں اسے ڈرائی کلینر کی دوکان پر زور زور سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دبے بادامی کاغذ کے بڑے بڑے لفافے اس نے سینے سے لگا رکھے تھے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ پتہ نہیں اس نے ہم لوگوں کو دیکھا تھا یا نہیں وہ مجھے پہچانتا تھا یا نہیں مگر ایک خاموش سا رشتہ جو ایک ہی کلاس میں پڑھنے والے بچوں کے والدین اور بھائی بہنوں میں خود بخود استوار ہو جاتا ہے۔ ہمارے بیچ بھی تھا۔
ایسا ہنستا کھلکھلاتا زندگی سے بھرپور شخص ٹرک ڈرائیور ہاتھوں کی صرف ایک لغزش

کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیسا ظلم تھا۔ رات کے سناٹے میں ٹرک وزنی پہیوں کا دباؤ، چیختے ہوئے اپنی
بریک۔ ایک ٹکراؤ اور پھر اس کے بعد سناٹا، لامتناہی سناٹا، گھٹا ٹوپ اندھیرا، جہاں ہاتھ کو
ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ جہاں تک کوئی آواز نہیں جاتی۔ ہر شخص ساکت ہر چہرہ مہر بہ لب۔

نہ جانے رات کتنی گزر گئی تھی، پیاس حلق میں کانٹے بن کر چبھنے لگی۔ پانی پی کر بالکونی سے
میں نے سڑک پر نظر ڈالی سامنے سڑک پر اکا دکا بلب جل رہے تھے۔ جیسے کسی برہن کی منتظر آنکھیں
— بالکونی پر رکھی ہوئی کرسیاں برف کی طرح یخ تھیں، موت کی یخ بستہ لہر میرے رگ و پے
میں دوڑ گئی۔ میرا سویا ہوا ذہن ایک بار پھر موت کے تصور سے جاگ اٹھا۔ کیسے موت آئی ہو گی
اسے! کیا ٹرک کی ٹھوکر نے اسے اتنی مہلت دی ہو گی کہ اسے وقت کی سفاکی کا اندازہ ہو سکے!!
کس کا خیال آیا ہو گا اسے؟ اپنی ماں کا باپ کا یا بیوی کا — رات کی ڈیوٹی سے واپس آنے والے
شوہر کی بیوی کیسی بے چین ہو رہی ہو گی؟ منتظر اور مضطرب — اور جب یہ انتظار کسی نئی دلہن
کا ہو؟ یہ انتظار اب ہمیشہ کے لئے اس کا مقدر بن گیا! اس کی ماں کو کیسا لگا ہو گا — کیسا
تڑپی ہو گی؟ اس کی بہن — بھائی بھی۔ گھر کے وہ بچے جنھوں نے اسے گاتے اور ناچتے دیکھا ہو گا۔
— خون میں لتھڑا ہوا اس کا چہرہ — اس کے تڑپتے ہوئے ہاتھ پیر قیامت کی بے قراری اور
پھر زندگی کی ہر حرکت کا خاتمہ —"

مجھے ایسا لگا جیسے موت کا مہیب اور سیاہ سایہ میرے چاروں طرف پھیل رہا ہے کافور کی
ٹھنڈی ٹھنڈی بو میرے اندر سرایت کرتی گئی — یہ ٹھنڈک موت کی تھی یا دسمبر کی رات کی،
میں نے گھبرا کر شال سے اپنے کو لپیٹا اور پھر بستر پر آ گئی میرے شوہر اور دونوں بچے گہری نیند میں سوئے
ہوئے تھے چہرہ اداس چہرہ اس وقت بالکل مطمئن تھا — میں حقیقت کے جس صحرا میں بھٹک
رہی تھی وہ اس سے بہت دور سہانے سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی — رات ابھی بہت باقی تھی
اور میں اس شخص کی موت پر ماتم کناں تھی جس کا نام ابھی بھی میں نہیں جانتی میرے ذہن کے
اندھیرے میں اس کی روشن آنکھیں چمک رہی ہیں — جس کی پسند ناپسند سے میں
ناواقف تھی۔ میری پرسکون دنیا میں جس شخص کا کوئی مقام نہ تھا آج اس نے میرے گھر کو اتھل
پتھل کر دیا — جاگتے جاگتے نہ جانے کب تھک کر میں سو گئی —

صبح مجھے ایسا لگا جیسے میرا جوڑ جوڑ تھکان سے ٹوٹ رہا ہو — بچوں کو اسکول روانہ کر کے
میں بہت دیر تک برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھی رہی دکھ نے میرے ہاتھ پاؤں مفلوج کر دیئے تھے اور

کالج جانے کی سکت میرے اندر باقی نہیں رہی تھی ــــ مگر خیالات کے حملے سے بچنے کا میرے پاس نا تمہ ہتھیار مصروفیت تھی ــــ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح میں نے اپنی بکھری ہوئی ہمت سمیٹی اور گھر کے کسی کام کی طرف دیکھے بغیر ــ کسی نہ کسی طرح کالج کے لئے چل پڑی ــــ!

اور پھر اچانک وہ ہوا جو عام طور سے نہیں ہوتا ہے ــ مجھے پہلی بار یقین آیا کہ حقیقت افسانے سے بھی زیادہ حیرت کن ہے کالج سے واپسی پر جب نشاط گنج ریلوے کراسنگ پر میں پھاٹک کھلنے کی منتظر تھی، میں نے دیکھا کہ ٹرین کی آمد کے انتظار میں ایک منٹ بھی گنوائے بغیر اس نے بڑی پھرتی اور مہارت سے ٹرین کے پھاٹک کے برابر میں نیچے تیلے راستے سے اپنی اسکوٹر نکالی اس وقت بھی وہ بہت عجلت میں تھا ــــ وہ میرے پاس سے گزرا اور مجھے پہچانے بغیر ایک ہی کک میں اسکوٹر اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا ــــ میرے منہ سے حیرت کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں نے اسے مرتے تو نہیں زندہ ہوتے دیکھا ــــ جو زندگی کی توانائی سے بھرپور ہوا کے جھونکے کی طرح میرے پاس سے نکل گیا ــ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس کی کھوئی ہوئی زندگی میں نے ہی عطا کی ہے ــــ وہ زندہ ہے یہ خوشی میرے سینے میں سما نہیں رہی تھی۔

میرے تیز تیز قدموں کی آوازسن کر میرے شوہر کمرے سے باہر نکل آئے ــــ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ ــــ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ بھی غیر ارادی طور پر ہنس پڑے ــــ "وہ زندہ ہے مرا نہیں ــــ میں نے ابھی اسے اسکوٹر پر دیکھا ہے ــــ مہر غلط کہہ رہی ہے وہ تو بالکل ٹھیک ہے" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کر دیا ــــ مہر میرے سامنے کھڑی تھی۔ ارے مہر! وہ تو زندہ ہے مرا نہیں ــــ مجھے ابھی راستے میں ملا تھا ــــ ابھی نشاط گنج میں ریلوے کراسنگ کے پاس ــــ" مارے جوش کے میں نے مہر کو لپٹا لیا۔ "بیٹے تم بے کار پریشان تھیں تم کو غلط فہمی ہو گئی تھی وہ نیلے اسکوٹر والا بیٹا تو زندہ ہے ــــ" میں زیادہ ہی خوش تھی

"پتہ نہیں امی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ مہر پیر پٹکتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی" پتہ نہیں آپ کس کو سمجھ رہی ہیں، ہم لوگ آج اپنی ٹیچر کے ساتھ ان کے گھر بھی ہو آئے ــــ کیا میرے علاوہ ایک اور لڑکی میری کلاس میں پڑھتی ہے ــــ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟"

"تو وہ کوئی اور ہو گا" میں نے اپنا جوش دباتے ہوئے قدرے کم آواز میں کہا "خدا کا شکر ہے جسے میں سمجھ رہی تھی وہ نہیں مرا ــــ وہ تو بالکل ٹھیک ہے ــــ" آج ہم نمائش نمبر دو دیکھیں گے" ــ ــ ☐

سلیم آغا قزلباش
۵۸۔ سول لائنس
سرگودھا، پاکستان

عفریت

جس سال اس عورت کو مہاجر کیمپ سے پاگل خانہ میں منتقل کیا گیا تھا، وہ اسی سال پیدا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مجرمانہ حملہ کی پیداوار تھا۔ لہٰذا تذلیل کی خاطر اس کا نام بھی "حملہ کی اولاد" پڑ گیا۔ اس کی ماں پر حملہ پاگل خانہ میں آنے کے بعد ہوا تھا یا پہلے، انتظامیہ نے اس واقعہ پر پردہ ڈال دیا تھا۔ شاید اسی میں انتظامیہ کو سب کی بھلائی نظر آئی تھی۔ لیکن حملہ آور آخر تھا کون! کیا وہ ایک شخص تھا یا کئی تھے؟ ممکن ہے ایک ہی ہو، مگر اس کے چہرے کئی تھے، کئی سروں والا عفریت بھی ہو سکتا ہے، جس کے سر شاید مختلف شکلوں کے ہوں لیکن بدن ایک ہی تھا —— اور اب تو اس عفریت نے اس کے اندر بھی کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ وہ رات رات بھر بے چین رہتا، چاندنی راتوں میں اس کے اندر جوار بھاٹا سا آ جاتا اور وہ پاگل خانہ کی چھت پر چڑھ جاتا اور وہاں گھنٹوں چاند کے چھائیاں زدہ چہرے پر نظریں گاڑے اسے تکتا رہتا، شاید اسے چاند میں کسی اور کا چہرہ نظر آتا تھا۔ ایسے میں اتفاقاً چاند کو کوئی ابر پارہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی بغل میں لے لیتا تو اس کی کنپٹیاں پھڑکنے لگتیں، پیشانی کی نسیں پھول جاتیں، آنکھیں ابل پڑتیں، اور کئی مرتبہ اس پر مرگی کا دورہ بھی پڑ جاتا۔ یہ وحشت اس میں پیدائشی طور پر موجود تھی یا اس کے ماحول کی پیدا کردہ تھی، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ابھی قبل از وقت تھا۔ بچپن میں وہ چاندنی راتوں میں اپنے سائے کو پکڑنے کے لئے سارے پاگل خانہ میں بے دھڑک بھاگتا پھرتا تھا، بلکہ بعض اوقات سائے کو پکڑنے کے لئے منڈیروں سے نیچے تک جھک آتا۔ پاگل خانہ میں اسے کہیں بھی آنے جانے کی روک ٹوک نہیں تھی جیسے پاگل خانہ پر اس کا پیدائشی حق ہو اور یہ بات ایک طور سے سو فیصد درست بھی تھی۔ اس کی ماں ذہنی طور پر اس حد تک مفلوج ہو چکی تھی کہ ممتا کا جذبہ جو پاگل پن کی آخری منزل تک قائم رہتا ہے اب اس میں دم توڑ چکا تھا۔ اسے جہاں کہیں بھی بٹھا دیا جاتا، وہ پتھر کی سل کی طرح وہیں کی ہو کر رہ جاتی تھی۔ بجلی کے جھٹکے بھی اسے کئی بار دیئے گئے تھے، لیکن اس کی حالتِ زار میں رتی بھر فرق نہیں پڑا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو یا تیز دھوپ،

آندھی آئے یا طوفان، اس کا جسم موسم کے کسی اونچ نیچ سے اثر قبول نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کا جسم تو اب ایک ایسے اجڑے مکان میں ڈھل چکا تھا جس کا مکین اسے چھوڑ کر کبھی کا جا چکا ہو۔ ایک زمانہ تھا جب اس مکان میں ننھی منی شرارتیں جھولا جھولتی تھیں، راتوں کو شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں اپنے ملائم پروں سے پنکھا جھلتی تھیں، شوخ البیلی آوازیں رنگین تتلیوں کی طرح آنگن میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی تھیں، مگر سب خواب جل بجھ کر راکھ ہوگئے، اب اس مکان میں پر ہول سناٹا طاری رہتا، چاردیواری اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی، چمگادڑوں، مکڑی کے جالوں، دیمک اور دھول کے سوا کسی ہستی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا، بلکہ یہ مکان تو بھربھری مٹی کا ایک سانس لیتا ہوا مقبرہ بن چکا تھا

پاگل خانہ بھی تو گھرے گھرے سانس لیتا ہوا ایک مقبرہ ہی ہے، جس میں معاشرے کے وہ آبلے جو پھوٹ کر ناسور بن جاتے ہیں، جن کا کوئی توڑ نہیں رہتا ایک جگہ ڈھیر کر دیئے جاتے ہیں اور جو بالآخر بھونکتی، غراتی، بھنبھوڑتی اور کف اڑاتی بد روحوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سب ناسور اس میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہے تھے۔ بظاہر وہ ہٹا کٹا ان تمام روگوں سے کوسوں دور نظر آتا تھا ایسی کوئی بات ابھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی جس کے بنا پر اسے پاگل قرار دیا جا سکتا، لیکن روگ بھلا باہر تھوڑے ہی ہوتا ہے، وہ تو اندر کہیں چھپا بیٹھا ہوتا ہے، جہاں سے وہ اپنی مرضی سے پنجوں کے بل نکلتا ہے اور بتدریج سارے جسم میں پنجے گاڑنے لگتا ہے اور پھر کسی نامعلوم گھڑی میں باہر آکر منہ سے کف اڑاتے لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ پاگل خانہ تو ایک فلتھ باکس ہے جہاں ایسے دماغوں کو کچرا سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے جو معاشرے کے سازشی اور بے رحم ذہن سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اصولوں کو پس پشت ڈال کر حالات سے سمجھوتہ کرنا تو خود کو حنوط کرنے کے مترادف ہے، جس سے سمجھوتہ کرانے والے کا اندر چکنا چور ہو جاتا ہے، مگر سمجھوتہ کرنے والا ان کرچیوں کو سینہ پر سجا کر یوں فخر سے چلتا ہے جیسے اسے بن مانگے تحفے مل گئے ہوں ——— تیس برس ہونٹ سیئے اور سینے پر سمجھوتوں کی بھاری سل رکھے بیت چکے تھے، اب وہ کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ کیا اور کب ؟ یہ سوال کسی کوڑے کی طرح اس کے سر پر لہرا رہا تھا۔

وہ دن اس کی زندگی کا انوکھا دن تھا، جب پاگل خانہ میں ایک نوجوان خوش شکل لڑکی کو کچھ لوگ داخل کرا کر چپ چاپ سر جھکائے واپس لوٹ گئے تھے۔ وہ یہ منظر بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کی بے بسی دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں میں رڑک محسوس ہونے لگی تھی اور ساتھ ہی اس کے اندر عجیب سی ہلچل بھی پیدا ہوئی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ اس لڑکی کو جب عورتوں

کے وارڈ میں بھیجا گیا تو وہ اس کے پیچھے پیچھے وارڈ تک چلا آیا تھا۔ اسے روکنے والا جو کوئی نہ تھا
—— روکا تو اسے اس وقت بھی کسی نے نہیں تھا جب وہ پاگل خانے سے بھاگ نکلا تھا، مگر باہر
کا سب کچھ اسے پاگل خانہ سے اتنا ملتا جلتا نظر آیا کہ وہ خود ہی لوٹ آیا۔ اس کی اسی حرکت سے اس
کا پاگل پن ثابت کیا گیا تھا اور یہ بات ثابت کرنے والے خود کتنے پاگل تھے یہ ایک الگ معاملہ تھا۔
اس موقع کے بعد اسے دو تین سنہری مواقع مزید ملے تھے جب وہ جابر منتظمین سے آزادی حاصل کر
سکتا تھا، لیکن شاید وہ آزادی سے خوف زدہ تھا یا آزادی سرے سے اس کے نصیب میں ہی نہیں
تھی یا پھر وہ پاگل خانہ میں ہونے والے جسمانی تشدد، بجلی کے جھٹکوں، تھپڑوں، اذیت بھری
چیخوں اور کراہوں کو سننے کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اگر دن میں ایک آدھ مرتبہ یہ آوازیں اس
کے کانوں میں نہ پڑتیں تو وہ سمجھتا کہ آج وہ نیند سے جاگا ہی نہیں ہے —— قید و بند کی صعوبتوں اور
اذیتوں کا بھی اپنا ایک نشہ ہوتا ہے —— یہ نشہ کہ کڑی نگاہ رکھی جائے، روکا ٹوکا جائے اور خلاف ورزی
کرنے پر مار مار کر جسم پر نیل ڈال دیئے جائیں۔ واقعی اذیت پسندی کا لطف وہی جانتا ہے جس
کے منہ کو یہ لہو لگ چکا ہو۔ سچ مچ یہ نشہ کتنا جان لیوا ہے اور اس میں مبتلا لوگ کتنے خونخوار ہیں!
جب سے وہ لڑکی پاگل خانہ میں داخل ہوئی تھی، وہ اسے اکثر چھپ چھپ کر دیکھتا رہتا
اس نے لڑکی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے کئی بار مختلف قسم کے جانوروں کی آوازیں بھی نکالی
تھیں، اوٹ پٹانگ حرکتیں بھی کی تھیں، لیکن کوئی تاثر لڑکی کے چہرے پر نمودار نہیں ہوتا تھا۔
جیسے وہ تمام تاثرات سے کٹی کر چکی ہو۔ وہ لڑکی کیسے پاگل ہوئی تھی یہ بات اس نے کبھی سوچی تک
نہ تھی اور سوچتا بھی کیوں؟ ویسے عجیب بات تھی کہ جب اس لڑکی سے اس کا آمنا سامنا ہوتا تو اس
کے اندر ایک بھوک سی کروٹ لے کر اٹھ بیٹھتی، پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیرتی اور نظروں ہی نظروں
میں اس لڑکی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی جانے کی کوشش کرتی۔ یہ بھوک تیس سال سے اس کے
پاتال میں سلگ رہی تھی، یکایک کیسے بھڑک اٹھی یہ سوچنے سمجھنے کا اسے وقت ہی نہ ملا۔
پاگل خانہ کی اونگھتی صبح ہمیشہ عورتوں کے وارڈ میں کسی عورت کی ایک لرزتی کپکپاتی آواز
سے بیدار ہوتی کہ "مجھے چھوڑ دو، خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو" —— اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ اس کے
چند لمحوں کے بعد مردوں کے وارڈ میں سے ایک غصیلی آواز سنائی دیتی "نہیں چھوڑوں گا، ہرگز
نہیں چھوڑوں گا" پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی اور تب اچانک ایک شخص فلک شگاف نعرہ بلند
کرتا "انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد" جواباً بہت سی گڈمڈ آوازیں گونجتیں "مارو اسے اور مارو"

اور آخر میں پروفیسر کی پاٹ دار آواز گونجتی "میرے عزیزو! یہ دنیا بہت جلد تباہ ہونے والی ہے، ناشتہ جلدی جلدی کر لو" اور اس کے ساتھ ہی پروفیسر کے بے ہنگم قہقہے کچھ دیر فضا میں معلق رہتے اور پھر پاگل خانہ کے اندر اگے درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کے چہچہے اگنا شروع ہو جاتے۔

مگر وہ صبح سب سے الگ تھی۔ خلاف معمول کوئی آواز بلند نہیں ہوئی تھی، جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا ہو، وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے ان آوازوں کے جاگنے کا بے قراری سے انتظار کرنے لگا۔ گھڑیاں گزرتی چلی گئیں اور تب اسے محسوس ہوا کہ ساری کی ساری وحشتیں، چنگاریاں، اذیتیں، شعلے حتیٰ کہ پاگل خانے کا سارا کا سارا ہذیان اور جنون لاوے کی صورت اس کے نرخرے میں جمع ہو گیا ہے، اسے ابکائی آنے لگی، آنکھوں کے ڈھیلے ابل کر باہر آ گئے۔ وہ بے اختیار سا ہو کر بستر سے اٹھا، کھڑکی کو دھڑام سے کھولا اور ایک انتہائی مکروہ اور بلبلاتی چیخ اس کا گلا پھاڑ کر برآمد ہوئی اور فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی چار سو پھیل گئی۔ وہ اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ سن کر خود بھی دہل گیا۔ یہ چیخ اس کے وجود کے تاریک ترین اندھے کنویں میں نہ جانے کب سے دبی پڑی تھی مگر جیسے راتوں رات اس میں جان پڑ گئی تھی اور وہ خاموشی کی زنجیروں اور بیڑیوں کو توڑ کر کسی چڑیل کی طرح سرخ زبان لٹکا سر کے بال کھولے، الف ننگی حالت میں منڈیر پر آ بیٹھی تھی۔ اس دن سے اسے خطرناک ترین پاگل قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں وزنی بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں اس کو کھانا بھی ایک روزن میں سے اندر پہنچایا جانے لگا تھا۔ اس کے سر کے بال اور ہاتھ پاؤں کے ناخن بڑھنے لگے تھے آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں، منہ سے کف نکلتا تھا۔ کپڑے لیر لیر ہو گئے تھے۔ جب اسے دورہ پڑتا تو وہ اپنی ہتھیلیوں اور بازوؤں کو اپنے دانتوں سے بری طرح ڈسنا شروع کر دیتا، جس سے خون جگہ جگہ سے رسنے لگتا۔ یوں بھی پاگل سے زیادہ خطرہ اس کے جسم ہی کو ہوتا ہے کیوں کہ یہ واحد ہستی ہے جو اس کی زد میں ہوتی ہے اور جسے وہ بہ آسانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

پاگل خانہ کا پروفیسر جب کبھی ہوش میں ہوتا تو چند پاگلوں کو اپنے سامنے ایک قطار میں ترتیب سے بٹھا لیتا، جیسے کلاس روم میں لڑکوں کو سبق پڑھانے لگا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک بوسیدہ کاغذ اپنے پیوند لگے کوٹ کی کسی اندرونی جیب سے نکالتا اور ایک چھنگلی برابر سکے والی پنسل ہاتھ میں تھام کر اس بوسیدہ کاغذ کے پرزے پر جانے کیا لکھنا شروع کر دیتا اور قطار میں بیٹھے پاگل اچھل اچھل کر کسی پڑھائے ہوئے طوطے کی طرح [illegible] جناب کی رٹ لگا دیتے۔ پروفیسر اپنی یک چشمی عینک کے عقب سے انھیں گھور کر دیکھتا۔ پھر ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں بڑی مشکلوں سے خاموش

کرتا اور پھر کھنکار کر وہاں پر موجود پاگلوں کو مخاطب کرتا "میرے عزیز طالب علمو اگر آدمی کو آدمی سے ڈرنے لگے تو وہ ہوا صحت مند اور اگر پاگل کو پاگل سے خوف نہ آئے تو بولو وہ کیا ہوا ؟ اچانک تنطارتیے بیٹھا کوئی پاگل جوش میں آکر زور سے چلاتا تالیاں اور پھر تالیوں کی لیفٹ رائٹ ہونے لگتی! ایسے میں پروفیسر آرڈر آرڈر کی گردان شروع کر دیتا۔ جب پاگل خود ہی تھک ٹوٹ کر تالیاں پیٹنا بند کر دیتے تو پروفیسر دوبارہ سب کو مخاطب کرتا "مائی ڈیر سٹوڈنٹ صاحبان، اس بات کو نوٹ کرو کہ اگر دیوانے ایک دوسرے کو مارتے ہیں تو کیا فرزانے نہیں مارتے۔ مارتے ہیں نا! تو اس کا مطلب کیا ہوا کہ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔ اور تب وہاں پر موجود پاگلوں کو جیسے کرنٹ سا لگ جاتا اور وہ ایک ساتھ مل کر دھمال ڈالنے لگتے "دمادم مست قلندر، دمادم مست قلندر" پروفیسر غصہ کھا کر زور زور سے چیختا "نالائقو میں تم سب کو فیل کر دوں گا، فیل کر دوں گا کمینو! اس پر وہاں موجود دوسرے پاگل بھی ادھم مچانے لگتے اور اچھل اچھل کر پروفیسر کی نقل اتارتے "فیل کر دوں گا کمینو فیل کر دوں گا"۔ مجبوراً وارڈن کو مداخلت کرنی پڑتی اور پروفیسر کی کلاس تتر بتر ہو جاتی —— ایک وقت تھا جب وہ خود بھی اس کلاس میں شامل تھا لیکن اب تو اس کے وجود سے پاگلوں کی پوری کلاس کو شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا علیحدہ کوٹھری میں پابہ زنجیر کر دینے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا جنون کیسے تھم سکتا تھا! اسے اپنے جسم کے زندان سے جہاں اس کی سانسوں میں بھی زنجیروں اور بیڑیوں کی جھنکاریں گھل مل گئی تھیں کیسے نجات مل سکتی تھی؟ اس آزاد کا چارہ اس کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تھا —— پورے چاند کی رات اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ یہ دروازے بھی عجیب پہیلیاں ہوتے ہیں: کھولنا چاہو تو سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں اور نہ کھولنا چاہو تو جنبش پا سے بھی ہوا ہو جاتے ہیں —— اور پھر نجانے کہاں سے اس کے اندر اتنی تشکتی آگئی کہ ایک جھٹکے سے اس کی زنگ آلود زنجیریں اور بیڑیاں پھولوں کے گجروں کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئیں اور وہ باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے چاند کو گرسنہ نظروں سے دیکھا، اس کے پیٹ میں درد کی ایک ٹیس اٹھی اور وہ اپنا پیٹ دبائے آگے کو بڑھ گیا۔ اسے کسی کی تلاش تھی، بھوک شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خلاف معمول اسے وہ لڑکی باغیچے میں بیٹھی نظر آئی۔ اس کی رال ٹپکنے لگی، وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ یکایک چاند کو کسی کالی کلوٹی بدلی نے اپنی اوک میں بھر لیا اور دوسرے ہی پل وہ لڑکی اس کی آہنی گرفت میں تھی۔ جلد

اتنا غیر متوقع تھا کہ لڑکی کے اوسان خطا ہو گئے اور اسے واویلا کرنے کی سدھ بدھ بھی نہ رہی۔ وہ اس لڑکی کے پامال وجود کو باغیچے کے کنج میں چھوڑ کر خود پاگل خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ کالی کلوٹی بدلی نے اپنی اوک میں لبالب بھری چاندنی کو اب انڈیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس بہتی دھار کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کی اور پھر یکایک اس کے حلق سے ایک ایسا بھیانک قہقہہ اچھل کر باہر آگیا جس میں کسی فتح مند عفریت کا سارا زہر بھرا ہوا تھا اور دوسرے ہی پل اس نے چھت پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

کئی ماہ بعد عورتوں کے وارڈ سے ایک تیز لرزتی ہوئی ننھی منی سی چیخ بلند ہوئی جسے سنتے ہی پاگل خانے کے سارے پاگل خوشی سے مزید پاگل ہو گئے۔ مگر انتظامیہ کو اس چیخ کا لہجہ اچھا نہ لگا سو اس نے اس پر پردہ ڈالنا ہی مناسب سمجھا۔ ☐

نعیم زبیری

رنگوں کا تیزاب

اخبار کے پہلے صفحہ پر چار ننھی ننھی اور خوبصورت بچیوں کی تصویریں ہیں۔ جو شاید سو رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے جھک کے ان کی پیشانیوں پر پھیلے ہوئے معصومیت کے پھول چن لوں!

پھر۔ دوسری خبروں سے دھواں اٹھ کے ان تصویروں پر پھیل جاتا ہے۔ خبریں موت کی۔ نفرت کی۔ حیوانیت کی ـــــ اس دھوئیں میں سڑاندھ ہے انسانی گوشت کے جلنے کی۔ میرے جسم پہ لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے میں اچانک بس کی سیٹ پہ رکھا ہوا اپنا ہاتھ اٹھا لیتا ہوں۔ عجیب سی لسلساہٹ ہے سیٹ پر۔ پھٹی ہوئی سیٹ کا فوم خون میں بھیگا ہوا ہے۔ اس میں سڑتے ہوئے گوشت کی بو ہے جو میرے ہاتھ سے لپٹ گئی ہے میرے پیروں تلے بھی خون ہے۔ کھڑکیوں کے پردوں پر۔ چھت پر۔ ہر طرف انسانی خون پھیلا ہوا ہے۔ بس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے والوں کے لہجے میں خوف ہے۔ آنکھوں میں ہراسانی ہے۔ سڑک پر دونوں طرف اُگے ہوئے ہرے بھرے پیڑ بھوتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں کس پیڑ کے ٹھنڈے سائے میں موت چھپی ہوئی ہو!

مجھے ابھی بہت سارا وقت گزارنا ہے۔ اس لئے مجھے اخبار پڑھنا ہے جس سے مجھے نفرت سی ہو گئی ہے۔

انسانوں نے ایک دوسرے کو بڑی تیزی سے کھانا شروع کر دیا ہے۔ خبارزں کے رپورٹر لاشیں گننے میں مصروف ہیں۔ انسان کا چکنا چور جسم گندے نالوں میں پڑا ہے ـــ اور مسلمان ہندو۔ سکھ اسے سنگسار کرنے میں مصروف ہیں۔

"ہے رام" میرے قریب بیٹھے ہوئے معقول آدمی کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے "ہے رام" وہ پھر دہراتا ہے۔ اس کے ہاتھ جن میں ایک ہندی اخبار ہے۔ کانپ رہے ہیں "کیا بات ہے؟" میں گھبرا کے پوچھتا ہوں "میرا دوست بھی مارا گیا ہے ـــ اسے ـــ مار دیا گیا ہے" یہ کہہ کے

اسی خبر کو دوبارہ پڑھتا ہے" وہ کھانا کھا کے ـــــ کھلے میں ـــــ اپنی چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا اسے گولی ماردی گئی"۔ وہ رک کے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے اچانک آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اس کے چہرے پہ خوف اور درد کے ملے جلے تاثرات ہیں۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہوگا؟ بیوقوف سا۔ سب سے محبت کرنے والا شخص تھا وہ"۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا۔"موت موت۔ موت۔ موت۔ موت۔" اخبار کی ہر سطر میں یہی ایک لفظ لکھا ہے! میری انگلیوں کی پوریں جلنے لگی ہیں۔ اخبار کے صفحوں پہ پھیلا ہوا ہر لفظ زہریلے کالے کیڑے کی طرح رینگنے لگا ہے۔ یہ کیڑے۔ رینگتے ہوئے میرے دماغ کی تہوں میں دھنستے جا رہے ہیں۔ ان کے ہزاروں باریک باریک نوکیلے پیر میرے ذہن میں چھپی ہوئی ہر خوبصورت یاد کو کھرچنے لگے ہیں شاید۔ اب مجھے صرف موت ہی یاد رہتی ہے۔ زندگی کی ہر حسین کروٹ کو یہ کیڑے۔ یہ کالے اکھشر چاٹ جائیں گے۔

دوستی۔ محبت۔ بھائی چارہ۔ یک جہتی۔ اچانک گندی گالیوں میں بدل گئے ہیں۔ انھیں استعمال کرنے کا حق اب صرف انھی خوفناک لوگوں نے بٹور لیا ہے۔ جو انسانی سروں سے بنی سیڑھیوں پہ بڑے باوقار انداز میں پیر رکھتے ہوئے اوپر اٹھتے جا رہے ہیں بادلوں کے اوپر رکھی ہوئی اونچی اونچی خوبصورت کرسیوں کی طرف ـــــ جہاں سے انھیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔

نفرت کے خوفناک سمندر میں، میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن میرا خوش دل موٹا دوست ملیشور جو بڑا حقیقت پسند اور منہ پھٹ ہے۔ یہ تنکے بھی میرے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہے"۔ کہاں سے آپ کو یہ ہندو مسلمان مل جاتے ہیں۔ جو آپس میں اتنی محبت سے ملتے ہیں۔ پیار سے رہتے ہیں۔ وہ ایک بھدا سا قہقہہ مار کر میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جن میں طنز بھی ہے۔ ترس بھی۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کے گھومنے والے شہاب اور سنیل۔ کیا میں ایک دوسرے سے کتنی دور رہتے ہیں ـــــ مشکوک رہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں۔ اور نفرت کرتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے موٹے۔ سیاہ۔ لیکن ہنسوڑ چہرے پہ سنجیدگی سی آجاتی ہے۔ آپ دیکھتے رہئے۔ وہ دن بہت قریب ہے۔ جب یہ سنیل اور شہاب ایک دوسرے کی گردن دبا رہے ہوں گے۔" پھر باقی کیا رہ جائے گا" میں گھبرا کے پوچھتا ہوں ـــــ"اخبار۔ اور کیا" وہ بڑی متانت سے جواب دیتا ہے۔ میں اپنے ہاتھ میں دیئے ہوئے اخبار کو زور سے بھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اس میں ایک عجیب سی مقناطیسیت ہے۔ ایک عجیب شیطانی سی مقناطیسیت۔ جو اسے مجھ سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ برسوں

ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے پڑوسیوں نے اپنے اپنے دروازوں کو سبز اور نارنجی رنگوں میں رنگ لیا ہے۔ اور ان رنگوں میں زہر ہے ــــ ایک پر اسرار سا تیزابی زہر جو رات سے صبح تک ــــ اور صبح سے رات تک ــــ ایک ایک قطرہ ــــ ایک ایک قطرہ ان کی دہلیزوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر گلی میں بہہ نکلتا ہے۔ اور پھر لاشوں کی سڑاند سارے ماحول پہ چھا جاتی ہے ــــ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے کشکولوں میں صرف چند کہانیاں رہ گئی ہیں ــــ اپنے مسلمان باپ ــــ اور ان کے ہندو دوست کی مشہور محبت کی سمٹی ہوئی خوشبو رہ گئی ہے۔ میں اس گلی میں جانا چاہتا ہوں جہاں لاش سڑ رہی ہیں ــــ اپنی یادوں کے کشکول میں دبکی سمٹی خوشبو کو پھیلا کے سڑاند کو مارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ــــ دروازوں پہ لگے ہوئے نارنجی اور سبز رنگ پہ سفید پینٹ پھیر دوں۔ "رک جائیے جناب" ــــ ملیشور کا موٹا کالا ہاتھ میری بانہہ پکڑ کے واپس کھینچ لیتا ہے۔ وہاں مت جائیے ــــ وہاں اب صرف پاگل کتے رہتے ہیں۔ آدمی مر چکے ہیں۔ سندرا اور شہاب کی لاشوں میں کیڑے بجبجا رہے ہیں۔ کہیں وہ آپ کے کشکول میں رہی سہی خوشبو کو بھی نہ چاٹ جائیں ــــ اخبار اب بھی میرے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ مجھے اسے پڑھنا بھی ہے ــــ پہلے صفحے پر پھیلی ہوئی گندگی کے درمیان چھپی ہوئی تصویر ــــ پھر میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے چار ننھی ننھی خوبصورت بچیوں کی تصویر ــــ میرا پر امید ذہن جو ہڑ میں پڑے ان خوبصورت پھولوں کو چن لینے کے لئے بے اختیار لپکتا ہے۔ ان بچیوں کے چہروں کے اطراف معصومیت کا ایک ہالہ سا ہے۔

ان بچیوں کے نام کتنے خوبصورت ہیں ــــ آشا ــــ لتا ــــ زہرہ ــــ شبانہ ــــ سبز ــــ اور نارنجی کواڑوں کی دراڑوں سے باہر رینگ کر ایک خوفناک ہاتھ نے ــــ ان کے سینوں سے سانسیں نوچ لی ہیں۔ □

عرفان عارفی

۱۱۶۴ - اسلام پورہ
مالیگاؤں (ناسک)
۴۲۳۲۰۳

دیگچی

اس نے درخت کے اوپر سے نیچے کی طرف دیکھا۔ قریب کے کمپاؤنڈ میں چولہے پر دیگچی چڑھی ہوئی تھی۔ اس طرف سرسری طور سے دیکھنے کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ شاخ پر کلہاڑی تیزی سے چلنے لگی۔ نہ جانے یہ شاخ کب کٹے گی۔ زیادہ مضبوط ہے، پرانی جو ہے۔ خیر ہر حالت میں کاٹ کر ہی رہوں گا۔

یہ کمبخت آج ہی کھانے کی خوشبو کو آنا تھا۔ شاید کوئی خاص پکوان نہیں۔ کلہاڑی شاخ پر تیزی سے چلنے لگی۔ کچھ وقفہ کے بعد خوشبو اور تیز ہوگئی۔ کلہاڑی اور تیز چلنے لگی کتنی اچھی خوشبو ہے۔ لیکن مجھے کیا۔ شاخ کو تو کاٹنا ہی پڑے گا۔ لیکن یہ خوشبو۔ کلہاڑی کی مار اور تیز ہوگئی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دیگچی کی طرف نہیں دیکھے گا۔ دیکھ کر کرے گا بھی کیا۔ خوامخواہ کیوں وقت ضائع کرے۔ خوشبو تو آرہی ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن وہ بھی کب تک آتی۔ کچھ دیر بعد مدھم پڑگئی۔ کیوں مدھم پڑگئی۔ اس نے شاخوں کی پتیوں کی طرف دیکھا۔ ہوا اسی سمت میں چل رہی تھی۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ اسی لئے تو کلہاڑی کی رفتار سست ہوگئی۔ اب اس کے بازو شل ہونے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی پیشانی پر پسینے کو ایک جھٹکا دیا اور ہتھیلی کو اپنی قمیض کے کونے سے صاف کیا۔

یہ کیا خوشبو تو پھر آگئی۔ اس نے پتیوں کی طرف دیکھا۔ مخالف سمت میں جھوم رہی تھیں۔ اس بار اس کا دماغ معطر ہوا تھا۔ اس پر نیند کا غلبہ چھانے لگا۔ اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ اپنی قوت ارادی سے بازوؤں میں طاقت کو واپس بلایا اور شاخ پر کلہاڑی کو تیز کر دیا۔

لیکن اس کے بازو اب ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ ایک بار کچھ دیر کے لئے دیگچی کی طرف دیکھ لے۔ پھر یہ سوچ کر کوئی اسے دیگچی کی طرف دیکھتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ اس نے دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر بھی دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ وہ تو اونچائی پر ہے ـــــ اگر وہ اس

طرف دیکھ لے تو یہ سامنے کے فلیٹ سے کھڑکی میں بہت دیر سے کھڑا ہوا جو آدمی دیکھ رہا ہے۔ کیا سوچے گا۔ لیکن وہ پہچانتے بھی کہاں ہیں۔ کوئی تعلق بھی تو نہیں ہے۔ تاہم وہ انسان ہے سوچے گا ضرور لیکن وہ خود تو بے حیا نظر آتا ہے۔ وہ بھی تو دیگچی کی طرف دیکھتا ہے لیکن حقارت سے دیکھتا ہے۔ میں جب دیکھوں گا تو کیسے دیکھوں گا۔ شاید بڑی محبت سے دیکھوں گا۔ بھلا اس طرف نفرت سے دیکھ کر کیا ملے گا۔ اس فلیٹ والے کو بھی کیا کہوں۔ کچھ دیر کے لئے کھڑکی کے پاس سے ہٹنے پر اس کی شان میں کمی ہو جائے گی۔ بڑا گستاخ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے شاخ پر ایک کاری ضرب لگائی۔ سامنے کے آدمی پر غصہ اتارنے کا اس سے اچھا ہتھیار اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ شاخ آخر کب اپنے انجام تک پہنچے گی۔ اب تو مجھے بھی بھوک محسوس ہونے لگی ہے۔

اس کے بازو جیسے جواب دینے لگے۔ اچانک خوشبو بہت تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ دیگچی کی سمت لاشعوری طور پر اسے مڑنا پڑا — دیگچی کھل گئی تھی — اس نے ایک نظر دیگچی کی طرف دیکھ کر کٹتی ہوئی شاخ کو دیکھا — شاخ ابھی کچھ وقت کی طلب گار تھی۔

سامنے کی کھڑکی سے وہ آدمی جا چکا تھا — آئیں۔ یہ کہاں چلا گیا۔ اب شاخ کو کون دیکھے۔ کہیں اس نے مجھے دیگچی کی طرف مڑتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو۔ دیکھا ہو گا۔ وہ بھی تو اتنی دیر سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بار میں نے دیکھ لیا تو کیا ہوا۔ شاید اسے برا محسوس ہوا ہو — لیکن مجھے تو برا نہیں معلوم ہوا تھا — کیسا آدمی تھا — اس نے شاخ پر کلہاڑی کو تیزی سے چلانا شروع کر دیا۔ کافی وقت گذرنے کے بعد شاخ نے درخت سے اپنے سخت جسم کو ڈھیلا کر دیا۔

دیگچی سے نکلتی ہوئی خوشبو ہوا میں دور تک پھیل گئی۔ کمبخت کٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ پتیاں ہوا کے جھونکے کے ساتھ لہرانے لگیں — خیر میں تو کھاؤں گا ضرور۔ لیکن یہ کام بہت ضروری ہے۔ کلہاڑی شاخ پر اب آہستہ آہستہ پڑنے لگی — اس نے سوچا ایک بار ذرا دیگچی کی طرف دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرف دیکھنے سے پہلے اس نے ایک بار کھڑکی کی طرف دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بند ہو چکی تھی — یہ کیا ہے۔ اس نے کب بند کر دیا۔

شاید وہ اپنے کمرے میں کھانے کے لئے بیٹھ گیا ہو — کچھ لوگ ویسے بھی ہوتے ہیں بھلا اسے کھڑکی بند کرنے کی ضرورت تھی۔ کھلی ہی رہتی — اس نے پھر [illegible]

ضروری ہے۔ لیکن اسے اسی وقت کیا ضرورت تھی۔

شاخ پر کلہاڑی کا ایک بھرپور وار پڑا اور شاخ ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر چلی آئی ــــ ابھی دوسری شاخوں کو بھی تو کاٹنا ہے۔ ایسی شاخیں جو نقصان پہنچاتی ہیں ان کا الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ خیر! ایک دن تو ایسا ضرور آئے گا جب وہ اس درخت سے نیچے اترے گا اور دیکھی اس کا انتظار کرے گی۔ □

کتب نما

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے ۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شائع کرنے سے معذور ہوگا ۔ ادارہ)

فلسفۂ جمال اور اردو شاعری

• پروفیسر نورالحسن نقوی • صفحات ۲۳۲ • قیمت ساٹھ روپے • ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

اردو زبان وادب کے خدمت گذار، اعتبار واحترام کے ناموں میں پروفیسر نورالحسن نقوی اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ تحقیق ہو یا تنقید نامانوس فلسفیانہ مباحث ہوں یا دقیق اجنبی افکار ان کا قلم ایک مخصوص علمی وقار کے ساتھ قاری کو ازاول تا آخر اسیر رکھتا ہے ۔ یہی صورت حال ان کی تازہ ترین تصنیف " فلسفہ جمال اور اردو شاعری " میں بھی نظر آتی ہے ۔

کتاب کا پہلا باب مغرب میں فلسفہ جمال کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتا ہے ۔ دوسرے باب میں حسن وفن کے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے ۔ تیسرا باب اس موضوع پر علمائے سنسکرت کے افکار ونظریات کے لئے مختص ہے ۔ چوتھے باب کا عنوان جمالیاتی تنقید ہے اور پانچویں باب میں اردو شاعری کا جمالیاتی مطالعہ میر، غالب، انیس، اقبال اور فیض کے حوالے سے کیا گیا ہے ۔

اردو میں جمالیات پر معدودے چند کتابیں دستیاب ہیں ایسی صورت میں اس تصنیف کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ بلاشبہ یہ ایک اہم اور قابل ستائش علمی کاوش ہے ۔ اعلیٰ درجہ کی کتابت، آفسٹ کی دلکش طباعت، عمدہ کاغذ، مضبوط جلد اور حسین گردپوش کے باوصف قیمت صرف ساٹھ روپے ہے ۔

—— قمرالہدیٰ فریدی

اردو صحافت کی تاریخ

• ڈاکٹر نادر علی خاں • صفحات ۴۱۶ • قیمت ساٹھ روپے • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ستائش کی آرزو اور صلہ کی تمنا سے بے پروا ڈاکٹر نادر علی خاں کی یہ کتاب " اردو صحافت کی تاریخ " انھیں ایک اعلیٰ درجہ کے محقق کی شکل میں پیش کرتی ہے ۔ مصنف کی دیدہ وری و دیدہ ریزی کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چار سو سولہ صفحات کی یہ کتاب اردو

صحافت کے صرف ابتدائی چھتیس سالوں (۱۸۲۲ء - ۱۸۵۷ء) کا احاطہ کرسکی ہے۔
مقالہ نگار نے پس منظر کے طور پر انگریزی صحافت اور قوانین صحافت کو پہلے باب کا موضوع بنایا ہے۔ باقی سات ابواب میں سنین کے اعتبار سے اخبارات کا جائزہ لینے کے بجائے مقامی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مختلف مقامات سے شائع ہونے والے اخبارات کے تفصیلی جائزہ کے نتیجہ میں نئے حقائق سامنے آئے ہیں اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔
یہ گراں قدر تصنیف اردو صحافت کی تاریخ ہی نہیں زمانہ زیر بحث کی سماجی و سیاسی زندگی کا آئینہ بھی ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ گٹ اپ شاندار ہے اور اس لحاظ سے ساٹھ روپے قیمت یقیناً کم ہے۔

—— قمرالہدیٰ فریدی

میرا فرمایا ہوا

● آوارہ ● صفحات ۱۰۴ ● قیمت تیس روپے
● ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

عمدہ کاغذ، دیدہ زیب کتابت وطباعت اور خوبصورت جلد سے مزین یہ کتاب خاندان مارہرہ کے مشہور و معروف صاحب طرز ادیب حضرت آوارہ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے "میرا فرمایا ہوا" میں گیارہ مضامین ہیں اور لطف زبان کی خاطر بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ زبان وبیان کے حسن سے قطع نظر یہاں اکبرآباد کے قلعہ میں جلال شاہی کی تصویریں بھی ہیں اور تیموری سلطنت کے آخری تاجدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے قلعۂ معلیٰ کی روبہ زوال شان وشوکت کی جھلکیاں بھی! دوسری جانب "مونچھیں"، "نانی اماں"، "اپنی دھن میں" جیسے مضامین ہیں جن میں مصنف نے ہمارے اپنے ماحول، سماج اور نفسیات کی نقاب کشائی کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مستند ادیب کی دلچسپ تحریریں ہیں جو ہم سے اپنے مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہیں۔

—— قمرالہدیٰ فریدی

ایک معرکہ لہو کا

● قمرالہدیٰ زیدی ● صفحات ۱۱۱ ● قیمت: چھ روپے
● ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

جو موتی ایک سچا فن کار سفر دروں کے بعد نکال کر لاتا ہے وہ سچا ہوتا ہے۔ طبقات اور دائرے کے وسیع سلسلوں میں سے ایک سلسلے کے تعلق سے قمرالہدیٰ فریدی نے عمل دخل کا ثبوت "ایک معرکہ لہو کا" میں پیش کیا ہے۔ ایک موضوع پر یہ پوری کتاب قمرالہدیٰ فریدی کے حواس اور ذہنی صلاحیتوں کی پوری نشوونما کا پتہ دیتی ہے۔
قمرالہدیٰ فریدی نے دیانت داری کا بوجھ بہرصورت اٹھایا ہے اور واقعہ کربلا کا تنقیدی جائزہ مستند روایات کی روشنی میں اس طرح لیا ہے کہ قربانی حسین کا صحیح رخ ا

ب کے ذریعہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک اجتہادی کوشش ہے جس میں قمرالہدیٰ فریدی نے تنوع، شدت اور دلچسپی پیدا کی ہے۔

کتابت۔ طباعت اور کاغذ ہر لحاظ سے کتاب معیاری ہے اور قیمت حیرت انگیز حد تک کم ہے۔

—— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

طلسم خیال

• مشتاق احمد قریشی • صفحات ۱۹۲ • قیمت اسّی روپے
• نئے افق پبلیکیشنز، ناظم آباد، کراچی

جناب مشتاق احمد قریشی کو ہم نئے افق، نیا رخ، آنچل اور حجاب جیسے رسالوں کے حوالے سے جانتے تھے۔ اب لوگ انھیں "طلسم خیال" کے مصنف کی حیثیت سے بھی پہچانیں گے۔ اس مجموعہ میں ایک غزل کے علاوہ باقی ساری نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں نہیں ہیں —— جوان دل کی دھڑکنیں ہیں جنھیں سید ھے سادے فطری انداز میں اردو ہندی کے نرم و نازک الفاظ کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر رقم کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہ قول ابواللیث صدیقی: "جذبات کی شدت یا رو میں شعر کے ظاہری پیکر اور اس کے تراش خراش پر زیادہ توجہ نہ رہی"۔ خاص بات یہ ہے کہ کتاب بے حد خوبصورت چھپی ہے۔ گرد پوش اتنا دلکش، کتابت ایسی حسین، کاغذ اتنا عمدہ اور تزئین کا یہ عالم کہ بس دیکھتے رہیے۔

—— قمرالہدیٰ فریدی

یادآوری کے حاشیے

• "الفاظ" کا تازہ شمارہ "گوشہ رشید احمد" نظر سے گزرا مجلس ادارت میں اردو کے آفا
افسانہ نگار رام لعل صاحب کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیوں کہ رام لعل صاحب لکھنؤ میں ہی رہتے
ہیں اس لئے اکثر ان سے ادبی محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے اپنی جانب سے انھیں
رسالے کے سلسلے میں مبارکباد پیش کر دی ہے۔ ملک زادہ جاوید، لکھنؤ

• گوشۂ رشید احمد پسند آیا۔ "سہ پہر کا مکالمہ" رشید احمد صاحب کی نمائندہ کہانیوں میں شما
کی جائے گی۔ مہدی جعفر اور ڈاکٹر ایوب مرزا صاحب کے مضامین رشید صاحب کی شخصیت اور فن پر
اچھی روشنی ڈالتے ہیں لیکن تشنگی باقی ہی رہتی ہے۔ رشید احمد صاحب کا ہمہ جہت مطالعہ نہیں ہو سکا
ہے۔ ظاہر ہے صرف دو مضامین سے ایک کہانی کار کی ہمہ جہت شخصیت کا بھرپور مطالعہ کیسے کیا جا
ہے۔ پھر بھی جو کچھ آپ نے دیا ہے تشفی بخش ہے۔ جمال اویسی، دربھنگہ، بہ

• دو ماہی الفاظ کا تازہ شمارہ بابت جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء مطالعہ سے گزرا۔ "رشید ا
پر" کے علاوہ بھی سارے مضامین پسند آئے "سہ پہر کا مکالمہ" رشید احمد اور "انگنا کی دھول" بلق
شبیہہ دونوں ہی کہانیاں اچھی ہیں پسند آئیں۔ مگر ہاں کہانیوں کی کمی محسوس ہوئی۔ کم از کم ایک
آدھ کہانی اور ہونی چاہئے تھی جب کہ شمارہ مذکور چار مہینوں پر محیط ہے۔ شعری تخلیقات بھی حسب
کم ہی ہیں۔ قاصر مجیبی، کلکتہ

• الفاظ کا تازہ شمارہ ملا۔ رشید احمد پر مہدی جعفر کا مضمون پسند آیا۔ "آگ کا د
سے متعلق عتیق احمد کے اصرار پر اقرار کو جی چاہتا ہے۔ نیر جہاں کا قصۂ آدم اچھا لگا۔ باقی مشمولا
اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ پرویز رحمانی، رانچی

• دو ماہی الفاظ کا تازہ شمارہ جنوری تا اپریل بہت دنوں بعد دیکھ کر مسرت ہوئی۔
شمارہ یک۔ امپوریم پٹنہ سے لے کر مطالعہ کیا۔ گوشۂ رشید احمد بہت اچھا نہ سہی تو اچھا کہلانے
مستحق ضرور ہے۔ اس کے علاوہ "آگ کا دریا۔ ایک تجزیاتی مطالعہ" اچھا مضمون ہے بلقیس شب
کا افسانہ "انگنا کی دھول" بے حد پسند آیا، انھیں میری جانب سے مبارکباد۔ "ایلن سلیٹو سے ایک
ملاقات" بھی عمدہ ہے۔ "عہد حاضر اور نثری پیرایۂ اظہار" اور "حسرت کی شاعری" یہ دونوں معلومات
میں ایک گونہ اضافہ کا باعث ہے۔ شعری حصہ میں ساقی فاروقی، بدر منیر الدین بدر، کمال جعفری،
رضوی، منظور ہاشمی اور شجاعت علی راہی نے متاثر کیا۔ ان حضرات کو میری جانب سے مبارکباد۔ فردوس گیاوی،

Regd. No. L- ALG/91 May Jun July. Aug. 1981

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R N. No. 29123/76